بس اب لوٹ آنا

نگہت عبداللہ





بس تم لوٹ آنا

غلطی اُس کی نہیں تھی۔ اور وہ کسی طرح اپنی غلطی ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ جبکہ مامی جی مسلسل اونچی آواز میں بڑبڑاتی ہوئی اُسے سخت سست کہہ رہی تھیں۔ وہ اُن کی باتوں کے جواب میں بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی اور ہر بار امی اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتیں۔ سحر الگ نظروں ہی نظروں میں اُسے خاموش رہنے کی تنبیہہ کر رہی تھی۔

وہ بے طرح جھنجھلا کر دروازے کو گھورنے لگی، جس کے دوسری طرف مامی جی اب بھی وقفے وقفے سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ حالانکہ کوئی اتنی بڑی بات یا اُس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔ بس ہوا یوں کہ اُس نے دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھی تھی کہ مامی جی نے کسی کام سے آواز دے ڈالی۔ اور وہ جلدی میں چولہا بند یا دھیما کیے بغیر ان کی بات سننے چلی گئی۔

واپس آئی تو دودھ آدھے سے زیادہ اُبل کر گر چکا تھا۔ اور یہ بھی اتفاق تھا کہ مامی جی بات کرتی ہوئی اُس کے ساتھ ہی کچن میں آ گئی تھیں اور اپنی آنکھوں سے دودھ کا یہ حشر دیکھ کر اُن کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اُس کا دل تو چاہا صاف اُن کے منہ پر کہہ دے کہ نہ آپ مجھے بلاتیں نہ ایسا ہوتا لیکن ضبط سے کام لے کر اُس نے اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا اور جلدی سے چولہا ریک اور فرش صاف کر کے اندر چلی آئی۔ لیکن مامی جی اب بھی خاموش نہیں ہوئی تھیں۔ عادت کے مطابق اس ذرا سے نقصان کو نقصانِ عظیم ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

اب تو اس قسم کے جملے بول رہی تھیں۔

''ذرا احساس نہیں ہے۔ احساس ہو بھی کیسے، باپ کی کمائی ہو تو پتا چلے ناں۔''

اور ایسی ہی باتیں اُس کے اندر آگ لگا دیتی تھیں۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے۔ دل چاہتا پہلے مامی جی کو کھری کھری سنائے پھر امی کو جھنجوڑ ڈالے اور اُن سے پوچھے۔

''وہ کیوں ساری باتیں خاموشی سے سُن لیتی ہیں۔ مامی جی سے نہیں تو ماموں جی سے ہی کہہ دیا کریں۔''

لیکن امی خود تو خاموش رہتی ہی تھیں۔ اُس کی بھی آواز دبا دیتی تھیں۔ اب بھی جب وہ بولنے کی کوشش کرتی اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتیں۔

''آخر کب تک آپ میری آواز دباتی رہیں گی؟'' اُس نے اپنے ہونٹوں پر سے امی کا ہاتھ ہٹا کر دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔

''ہمیشہ۔'' امی کے بجائے سحر آپی کی طرف سے جواب آیا تو وہ پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

''کیوں؟''

''تم نادان نہیں ہو مہرو! خود سمجھ سکتی ہو کہ اسی میں ہمارے لیے امان ہے۔'' سحر آپی اُسے سمجھانا چاہتی تھیں لیکن وہ مزید تلخ ہو گئی۔

''امان! کیسی امان؟''

''یہ چھت جس کے نیچے تم کھڑی ہو۔ یہ ہماری نہیں ہے۔ کبھی تم نے سوچا گر یہ ہمارے سروں سے سرک گئی تو کھلے آسمان تلے ہم کب تک کھڑے رہ سکیں گے؟''

''کھلے آسمان تلے کیوں؟ کیا کہیں اور جائے پناہ نہیں۔''

''کم از کم ہمارے لیے نہیں ہے۔''

''چھوڑیں سحر آپی! امی کی طرح آپ کی سوچیں بھی محدود ہو گئی ہیں۔ یہ دنیا بڑی وسیع ہے۔ اور ہم کوئی چھوٹے بچے نہیں ہیں۔ ذرا سی کوشش سے اپنے لیے الگ ٹھکانا کر سکتے ہیں۔'' وہ سحر آپی کے سامنے بیڈ پر اوندھی گرتی ہوئی یوں بولی جیسے الگ ٹھکانا حاصل کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔

''ہماری ضرورت، الگ ٹھکانا اور دو وقت کی روٹی نہیں ہے۔ مہرو اس سے زیادہ ضرورت ہمیں اس تحفظ کی ہے جو ماموں کی ذات سے ہمیں میسر ہے۔''

''کیا کرتے ہیں ماموں جی ہمارے لیے؟'' وہ بہت متنفر نظر آ رہی تھی۔

''ایسا مت کہو مہرو! بے چارے اپنی بساط بھر تو کرتے ہی ہیں۔ روٹی، کپڑا، مکان، ہماری اولین ضرورتیں تو پوری کر ہی رہے ہیں اُس کے علاوہ ہمیں پڑھایا لکھایا بھی۔''

''بس بس! وہ اُکتا کر بولی۔'' اُن کے سارے کیے کرائے پر مامی جی کی باتیں پانی پھیر دیتی ہیں۔ اور رہی سہی کسر اُن کی بیٹیاں پوری کرتی ہیں۔''

''خیر، ایسا تو مت کہو۔ صبا اتنی اچھی ہے اور آذر بھائی بھی اتنا خیال کرتے ہیں۔ پھر ماموں جی۔''

''ان تینوں کو چھوڑ کر باقی۔''

''باقی کون رہ جاتا ہے۔ ماں جی اور سیما، میں مانتی ہوں ان دونوں کا مزاج الگ ہے پھر بھی تناسب کے لحاظ سے اچھوں کی تعداد زیادہ ہے اور میں تم سے کہوں گی کہ مامی جی صبا اور آذر بھائی کے اچھے رویوں کو سوچ لیا کرو۔''

''بہت خوب! یعنی مامی جی ہمیں دو وقت کی روٹی کا طعنہ دیں اور میں بے حد پرسکون ہو کر سوچوں، آذر بھائی کتنے اچھے ہیں جو ہر رات دبے پاؤں ہمارے کمرے میں آ کر امی سے کہتے ہیں۔ پھپھو جی کسی چیز کی ضرورت تو نہیں اگر کچھ چاہیے تو بتا دیجیے، میں کل یونیورسٹی سے واپسی پر لیتا آؤں گا۔ ہاہاہا۔''

اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہو کر وہ ہنسی تو سحر کو بھی ہنسی آ گئی جسے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''اب اُن کے خلوص کا مذاق تو مت اُڑاؤ۔''

''خلوص یا۔'' اُس نے شرارت بھری نظریں سحر آپی کے چہرے پر جما دیں۔ جس پر ایک پل میں ہی دھنک رنگوں کی برسات اُترنے لگی تھی۔

سحر آپی اُس سے زیادہ نہیں صرف دو سال ہی بڑی تھیں۔ اور اُس کے برعکس اُن پر حالات کا زیادہ اثر تھا کہ وقت سے پہلے ہی وہ خاصی سمجھدار اور سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ جب ابو جی کا انتقال ہوا اُس وقت وہ چار اور مہرو دو سال کی تھی۔ بے چاری امی بھری جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھے ماموں جی کی دہلیز پر آئیں تو اسی وقت مامی جی کا رویہ بدل گیا تھا۔ گو کہ سحر آپی اس وقت بہت چھوٹی تھیں اور شاید اتنی جلدی وہ مامی جی کے اُکھڑے مزاج کو محسوس نہ کرتیں۔ لیکن جب مامی جی کی دیکھا دیکھی اور کچھ اُن کی شہ پر اُن کی بیٹی سیما ہر بات سحر پر جتانے لگی یعنی۔

''یہ گھر ہمارا ہے۔''

''یہ گڑیا میری ہے۔ مجھے ابو نے لا کر دی ہے۔''

''پہلے میں کھاؤں گی۔ تم بعد میں کھانا۔''

تب کم سنی ہی میں سحر جان گئی کہ یہ گھر اور اس گھر کی کسی چیز پر اُس کا کوئی حق نہیں۔ ساتھ ہی اپنی کم مائیگی کا احساس بھی اس کے ننھے سے دل میں جا گزیں ہو گیا تھا۔ پھر یہاں جس طرح اُس نے امی کو گھٹ گھٹ کر جیتے دیکھا تھا۔ اُس سے وہ بے حد حساس ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کو محسوس کرتی اور چپکے چپکے اندر ہی اندر کڑھا کرتی تھی۔ اور اُن کی نسبت......قدرے خودسر اور ضدی ہونے کے ساتھ مہرو کے اندر کچھ بغاوت کا جذبہ بھی تھا۔

شروع میں وہ سیما اور صبا کے ساتھ چھینا جھپٹی بھی کر لیتی تھی، اور اکثر زبردستی اُن کی چیزوں پر قابض بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر امی اور سحر آپی کی مداخلت سے اُسے چھینی ہوئی چیز سے محروم ہونا پڑتا اُس سے وہ اور زیادہ تلملا جاتی تھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی تو سحر آپی کی طرح اندر ہی اندر کڑھنے کے

بجائے اُس کے اندر لاوا سا پکنے لگا تھا۔ امی اور سحر آپی دونوں ہی جانتی تھیں کہ وہ طوفان اٹھا سکتی ہے اور اُس کا انجام سوچ کر ہی دونوں حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں

سحر آپی نے انٹر کے بعد ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ گو کہ وہ پڑھنے میں بہت اچھی تھیں۔ اور انہیں شوق بھی تھا۔ لیکن محض حالات کے پیش نظر انہوں نے اپنے شوق کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ حالانکہ ماموں جی اور آذر بھائی نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ آگے پڑھ لیں۔ لیکن جس طرح مامی جی اُٹھتے بیٹھتے امی کے سامنے بڑھتے ہوئے اخراجات کا رونا روتے ہوئے ایک طرح سے یہ جتانے کی کوشش کرتی تھیں کہ وہ تینوں ماں بیٹیاں اُن پر اضافی بوجھ ہیں۔ اُس سے اُنہوں نے یہ کہہ کر دامن بچا لیا تھا کہ میرا پڑھنے میں بالکل دل نہیں لگتا۔ یوں دو سال سے وہ صرف گھر داری میں لگی ہوئی تھیں۔ اُن کے ساتھ کی سیما نے اسی سال یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ جبکہ صبا اور مہرو بی۔اے میں تھیں۔

دو سال پہلے جب سحر آپی انٹر کے بعد گھر بیٹھ رہی تھیں تب ہی امی اُن کی شادی کے بارے میں سوچنے لگی تھیں۔ اور انہوں نے اسی وقت ماموں جی سے تذکرہ بھی کر دیا تھا کہ وہ سحر کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن اس وقت ماموں جی نے ابھی بچی ہے، کہہ کر ٹال دیا تھا۔ اور امی کیونکہ خود بالکل خالی ہاتھ تھیں، بلکہ ایک طرح سے ماموں جی کی دستِ نگر تھیں۔ اس لیے خاموش ہو رہی تھیں جبکہ اندر ہی اندر وہ خاصی فکر مند تھیں اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی فکروں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

اگر مامی کا رویہ بہتر ہوتا تو شاید وہ کچھ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جاتیں کہ ہو سکتا ہے ماموں جی آذر بھائی کے تعلیم سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے ہوں کہ جیسے ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں گے سحر کو اُن کے لیے مانگ لیا جائے گا۔ لیکن مامی جی کے رویے نے انہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔ اور ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سحر آپی جس طرح شروع سے حقیقتوں کو تسلیم کرنے لگی تھیں۔ اسی طرح اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیتیں کہ مامی جی کبھی بھی آذر کے ساتھ انہیں منسوب نہیں کریں گی۔ لیکن پتا نہیں کیسے یہاں وہ نظریں چرا گئیں یا شاید خود اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا کہ آنکھوں میں کچھ خواب سجا بیٹھیں۔ گو کہ ان خوابوں کو وہ خود اپنے آپ سے بھی نہیں کہتی تھیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے مہرو اُن تک رسائی حاصل کر گئی تھی کہ جہاں آذر بھائی کا نام آتا وہ شرارت سے اُن کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

کچھ دنوں سے امی کی طبیعت خراب تھی۔ اور جب بھی انہیں کوئی معمولی سی تکلیف بھی ہوتی تو وہ واہموں میں گھرنے لگتی تھیں۔ کہ اُن کے بعد اُن کی دونوں بیٹیوں کا کیا ہوگا۔ اس وقت بھی وہ ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں۔

''میری زندگی کا کیا بھروسا پتا نہیں نصیب میں تم دونوں کی خوشیاں دیکھنی لکھی بھی ہیں کہ نہیں۔''

''فکر مت کریں۔ آپ کی عمر بہت لمبی ہے اور ہماری تو کیا آپ سحر آپی کے بچوں کی خوشیاں بھی دیکھیں گی۔'' وہ اُن کا سر دباتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

''سحر کی شادی ہو جاتی تو مجھے کچھ اطمینان ہو جاتا۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔ تین سال سے گھر میں فارغ بیٹھی ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم دونوں کے فرض سے کیسے سبکدوش ہو سکوں گی۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''میں تو بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ اور تمہارے ماموں جی بے چارے کہاں سے اتنا کریں گے۔ آگے ان کی اپنی بیٹیاں موجود ہیں۔''

''بس کریں۔ آپ نے خوامخواہ کی فکریں پال رکھی ہیں۔'' وہ امی کو مایوسی سے نکالنے کی غرض سے لاپروائی سے بولی۔ ''میں بی۔اے کر لوں پھر دیکھیے گا۔''

''کیا کرو گی تم بی۔اے کر کے؟''

''نوکری۔'' اس کی اطمینان کے ساتھ لاپروائی ہنوز برقرار تھی۔

''تم نوکری کرو گی۔؟'' سحر آپی تعجب سے پوچھنے لگیں۔

''ہاں کیوں کیا میں نوکری نہیں کر سکتی؟''

''پتا نہیں۔'' سحر آپی کی بحث کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے فوراً بات ختم کر دی۔ لیکن وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''پھر پہلے آپ کی شادی ہوگی۔ اُس کے بعد میں اور امی الگ ٹھکانا کریں گے۔''

''کیا فضول بات کر رہی ہو۔'' امی نے ٹوکا۔

''یہ فضول بات نہیں ہے امی! ابھی تو یہ صرف ماموں کا گھر ہے، پھر سحر آپی کی سسرال ہو جائے گی تو آپ کو بھی یہاں رہنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''کیا؟'' امی چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کیا کہا تم نے۔''

''کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔'' وہ سحر آپی کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''آپ سحر آپی کی طرف سے تو یونہی پریشان رہتی ہیں۔ حالانکہ آپ کو ذرا بھی تردد کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رشتہ گھر ہی میں موجود ہے۔ یعنی آذر بھائی۔''

''آہستہ بول۔'' امی نے اُس کا ہاتھ دبایا...... ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''ہوا کریں۔'' اُس نے کندھے جھٹکے۔

''پاگل ہوئی ہے کیا؟ اگر تیری مامی نے سن لیا تو۔''

''سن لیں۔'' اُس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ ''آخر کو انہیں سننا ہی ہے، ہمارے منہ سے نہ سہی آذر بھائی کے منہ سے۔ اور میں تو کہتی ہوں امی گھر کی بات ہے آپ تو خود ماموں جی سے بات کر لیں۔''

''مہرو۔!'' سحر آپی کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ دروازے پر مخصوص دستک کے بعد آذر بھائی اندر آ گئے۔ اور وہ

انہیں دیکھتے ہی گنگنائی۔

''بڑی عمر ہے تمہاری۔''

''اچھا۔!'' وہ ہلکے سے ہنسے۔ ''کون یاد کر رہا تھا مجھے۔؟''

''میں کس کا نام لوں تو آپ کو خوشی ہوگی۔'' وہ اُن کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھنے لگی تو ایک نظر سحر پر ڈال کر امی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔

''اپنا نام لے لو۔''

''چلیے تو خوش ہو جایئے۔ کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ہی آپ کا ذکر کیا تھا۔'' اس کا انداز ایسا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو ہمیں سب خبر ہے۔ اُن کی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ پوری طرح امی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''پہلے سے بہتر ہوں۔''

''دوائی لی تھی؟''

''ہاں۔!''

''کل میں آپ کو پھر ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔''

''ابھی تو دو دن کی دوا ہے۔'' امی تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''میرا خیال ہے، اسی سے ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''اور کسی چیز کی ضرورت؟''

''جو آپ کل یونیورسٹی سے واپس پر لا سکیں۔'' وہ جیسے انتظار میں تھی، فوراً اُن کا جملہ مکمل کر دیا تو وہ خاصی سنجیدگی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اور امی پتا نہیں کیا سمجھیں، کہنے لگیں۔

''بیٹا! اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔''

''نہیں پھپھو جی۔!'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔

''سحر! پھپھو جی کو دوا وقت پر دینا۔'' اور سحر جو سر جھکائے بیٹھی تھیں، چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

وہ کالج سے لوٹی تو گھر میں کچھ غیر معمولی سی ہلچل محسوس کر کے برآمدے ہی میں رُک کر جائزہ لینے لگی۔ خلافِ معمول امی کچن میں مصروف تھیں۔ اور سحر آپی گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔ صبا اُن کے ساتھ ساتھ تھی۔ کسی کام سے صبا بڑی عجلت میں اُس کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس نے بڑھ کر اُس کی کلائی تھام لی، اور آواز دبا کر پوچھنے لگی۔

''کوئی آیا ہے؟''

''آیا نہیں آنے والا ہے۔'' صبا نے اُسی کے انداز میں جواب دیا۔

''کون؟''

''شام میں کچھ لوگ سیما آپی کو دیکھنے آ رہے ہیں۔''

''اچھا!'' اُس نے خوشی کا اظہار کیا اور مزید تفصیل جاننا چاہتی تھی کہ صبا عجلت میں ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گئی۔ اُس نے لمحہ بھر رُک کر اُسے دیکھا پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ چادر اور بیگ بیڈ پر پھینکا پھر شوز اُتار کر چپلیں گھسیٹتی ہوئی فوراً کچن کی طرف آ گئی جہاں امی اکیلی پتا نہیں کیا کچھ بنانے میں مصروف تھیں۔ اُسے دیکھا تو کہنے لگیں۔

''منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔''

''آپ نے کھا لیا؟''

''نہیں۔''

''پھر آپ اندر جائیں۔ میں کھانا وہیں لے آتی ہوں۔''

''میں ابھی فارغ نہیں ہوں۔ تم کھا لو۔'' امی غالباً کھیر بنا رہی تھیں۔ اور اُن کی ساری توجہ اُسی کی طرف تھی۔

وہ آگے بڑھ آئی۔

''آپ ہٹیں۔ یہ کام میں کر لوں گی۔''

''تم ابھی تو آئی ہو۔''

امی نے اُسے روکنا چاہا لیکن وہ زبردستی اُنہیں ہٹا کر اُن کی جگہ خود کھڑی ہو گئی۔ اور امی اس کی اس عادت سے واقف تھیں۔ اس لیے خاموشی سے پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں پھر اُس کے ساتھ وہیں کھڑے ہو کر کھانا کھایا۔ اُن کے بعد انہوں نے بہت کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لے لیکن وہ نہیں مانی۔ سارے کام نپٹا کر انہیں ساتھ لے کر ہی اندر آئی تھی۔ پھر شام میں جب مہمانوں کے آنے کا وقت ہوا تو اُس نے بہت خاموشی اور آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مامی جی امی کو نہیں بلائیں گی۔ اور امی کا دھیان ہٹانے کی غرض سے وہ اور سحر آپی یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں لے بیٹھیں کسی کسی وقت وہ دونوں خاموش ہوتیں تو ڈرائنگ روم سے باتوں اور ہنسی کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں تب وہ جلدی سے کوئی اور موضوع چھیڑ دیتی۔

''بس بھی کرو، کتنا بولو گی۔'' آخر امی نے ٹوک دیا۔

''آپ کو ہمارا بولنا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ سادگی سے پوچھنے لگی۔ اور ابھی امی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مامی جی دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر آ گئیں۔ باری باری تینوں کو دیکھا پھر غیر معمولی لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے امی سے کہنے لگیں۔

''حسنہ! تم یہاں کیوں چھپ کر بیٹھ گئی ہو، اُدھر مہمانوں کے پاس آؤ ناں۔''

''میں۔!'' امی واقعی حیران ہوئیں۔

''ہاں ہاں آؤ جلدی چلو۔'' پھر خود ہی آگے بڑھ کر امّی کو ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھایا تو امّی کچھ بوکھلائی ہوئی سی اُن کے ساتھ چل پڑیں۔

''سنو سحر۔!'' دروازے کے پاس جا کر مامی جی کو جیسے اچانک خیال آیا پلٹ کر بولیں۔ ''چائے تم لے آؤ۔''

''میں؟'' سحر آپی امّی سے زیادہ حیران ہوئیں۔

''ہاں جلدی کرو۔ مہمان جانے کی جلدی کر رہے ہیں۔'' اُس کے ساتھ ہی وہ امّی کو لے کر چلی گئیں تو سحر آپی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کوئی مضائقہ نہیں۔ چلی جایئے۔'' اُس کے مخصوص لاپرواسے انداز پر سحر آپی نے جل کر اُس کی کمر پر زور سے ہاتھ مارا اور اُٹھ کر چلی گئیں۔ تب وہ اس صورتِ حال کو سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ اب اُسے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ مامی جی اچانک اتنی مہربان کیسے ہوگئیں۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' آذر بھائی کی آواز پر وہ پہلے چونکی پھر سر جھٹک کر بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''اکیلی کہاں، آپ بھی تو ہیں۔'' وہ شرارت سے ہنسی۔

''میں تو ابھی آیا ہوں۔''

''اور سحر آپی ابھی یہاں سے گئی ہیں۔'' اُس کی برجستگی وہ نہیں سمجھے۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں مہمان چلے گئے؟''

''نہیں۔''

''کون کون ہے؟'' وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

''یہ تو میں نہیں جانتا۔ ہاں اگر تم لڑکے کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو وہ بھی موجود ہے۔'' اُس کا اشتیاق سمجھتے ہوئے اُنہوں نے خاص طور سے لڑکے کا بتایا۔

''کیسا ہے؟''

''اچھا ہے۔ دیکھنا چاہو تو جا کر دیکھ لو۔''

''نہیں۔ مزید اُس کے بارے میں سحر آپی سے پوچھ لوں گی۔''

''سحر سے۔'' وہ قدرے حیران ہوئے ''کہاں ہے سحر؟''

''مامی جی کے کہنے پر وہ مہمانوں کے لیے چائے لے کر گئی ہیں۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظریں اُن کے چہرے پر جما کر بظاہر بہت عام سے لہجے میں بولی۔

''اچھا۔!'' آذر بھائی کا پُرسوچ انداز پھر فوراً اُٹھ کر چلے جانا اُسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ تصور کی آنکھ سے سحر آپی کی پلکوں پر سجے خوابوں کی تعبیر دیکھتے ہوئے وہ ہلکے سے مسکرائی اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹی ہی تھی کہ سحر آپی نے آ کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''سنو مہرو! یہ اچھا نہیں ہو رہا۔''

''ک۔ کیا اچھا نہیں ہو رہا؟'' وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''وہ لوگ سیما کے بجائے میری بات کر رہے ہیں۔'' سحر آپی روہانسی ہو رہی تھیں۔

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ سمجھی، کچھ نہیں۔

''مجھے دیکھ کر ایک خاتون کہنے لگیں۔ ہمیں یہ لڑکی پسند ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ میر مطلب ہے اگر اُنہوں نے ایسا کہا ہے تو اُس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ انہیں اچھی لگی ہوں گی۔''

''تم مہرو! مذاق میں بات کر مت اُڑاؤ۔ وہ اپنے لڑکے کے لیے مجھے۔'' سحر آپی نے ہاتھوں سے چہرا ڈھانپ لیا۔ شاید رونے لگی تھیں۔

''ارے رے؟'' اُس نے انہیں کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ''اگر ایک بھی آنسو بہایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''تم سمجھو مہرو۔!''

''میں سمجھ رہی ہوں دیدی!'' وہ انہی کے لہجے میں بولی۔ ''اور مجھ سے زیادہ وہ شخص سمجھ رہا ہے جو ابھی ابھی پریشانی کے عالم میں یہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔''

''کون؟'' سحر آپی پوری آنکھیں کھول کر دیکھنے لگیں۔

''آذر بھائی۔''

''آذر۔!''

''اب آپ بھائی مت کہہ دیجیے گا ورنہ ''قبول ہے'' سے پہلے ہی نکاح ٹوٹ جائے گا۔''

''ہٹو بے ایمان۔!'' ایک شرمگیں مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ وہ کچھ دیر اُن کی طرف دیکھنے کے بعد رازداری سے پوچھنے لگی۔

''وہ کیسا ہے جسے چائے دے کر آئی ہیں۔''

''مجھے نہیں پتا۔ میں نے دیکھا ہی نہیں۔'' اُنہون نے سادگی اور صاف گوئی سے کہا۔

''دیکھ تو لیتیں۔ ہو سکتا ہے آذر بھائی سے اچھا ہو۔''

''مہرو۔!'' وہ گھورنے لگیں۔ ''کوئی کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔''

''آذر بھائی سے اچھا نہیں ہو سکتا۔'' وہ ہنسی پھر اچانک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔ ''وہاں سیما آپی بھی تھیں؟''

"نہیں۔"

"اور مامی کے کیا تاثرات تھے، جب اُن خواتین نے آپ کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا؟"

"پتا نہیں۔ کیونکہ میں فوراً چلی آئی تھی۔"

"مجھے لگتا ہے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

پھر فوراً سر جھٹک کر بولی۔ "خیر چھوڑیں اصل بات امّی سے معلوم ہوگی۔"

"لیکن مہرو! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ڈرنے کی۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی بھی تو آذر بھائی خود ہی نبٹ لیں گے۔"

"آذر۔!" سحر آپی جانے کس سوچ میں ڈوب گئیں۔

"کیوں کیا آپ کو آذر بھائی پر بھروسا نہیں ہے؟"

"بھروسے کی بات تو جب ہوتی مہرو! جب کوئی پیمان باندھے گئے ہوتے یا اُنہوں نے کبھی مجھ سے کہا ہوتا۔" اُن کے پرسوچ لہجے میں مایوسی اُترنے لگی تھی۔

"ہو سکتا ہے، وہ کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہوں۔ بہرحال آپ قبل از وقت اندیشوں میں گھر کر پریشان نہ ہوں۔ اتنا میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آذر بھائی آپ کو ناپسند نہیں کرتے اور ابھی جس طرح وہ پریشانی کے عالم میں یہاں سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ اس سے تو مجھے لگتا ہے۔ وہ بھی آپ کو۔"

امّی کے آجانے سے اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھر سحر آپی نے بھی اُسے کہنی مار کر امّی سے فوری کوئی سوال کرنے سے منع کر دیا۔ اس لیے وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

° مامی نے چند جوڑے کپڑے امّی کے سامنے لا رکھے کہ اُنہیں سحر کے لیے سی کر تیار کر دیں۔ وہ اس وقت وہیں موجود تھی۔ اُس نے حیرت سے کپڑوں کو دیکھا اور اُس سے کہیں زیادہ حیرت سے امی اور مامی جی کی باتیں سنیں۔ جو وہ سحر کی شادی سے متعلق کر رہی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے؟" مامی جی کے جاتے ہی وہ امی سے پوچھنے لگی۔ "کس کے ساتھ ہو رہی ہے سحر آپی کی شادی!"

"وہ جو اس روز رشتہ آیا تھا۔ جواد نام ہے لڑکے کا۔" امی، مامی جی کے لائے ہوئے کپڑے دیکھتے ہوئے بتانے لگیں۔ "اچھا لڑکا ہے کسی پرائیوٹ کمپنی میں ملازم ہے۔"

"لیکن امی! اتنی جلدی اور ہمیں بتائے بغیر آپ نے بات طے کر دی؟"

"بیٹا! میں نے تو سب تمہارے ماموں جی پہ چھوڑ دیا تھا۔ اُنہوں نے ہی سب طے کیا ہے!"

"سحر آپی سے پوچھا آپ نے؟ میرا مطلب ہے، اُن کی مرضی معلوم کی کہ انہیں یہ رشتہ پسند بھی ہے یا نہیں۔"

"مہرو!" امی نے سرزنش کے لہجے میں ٹوکا۔ "تم چھوٹی بچی اور نادان نہیں ہو۔ اچھی طرح سمجھ سکتی ہو کہ ہم اپنے بارے میں سوچنے تک کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ایسے حالات میں میری بیٹیاں عزت سے اپنے گھروں کی ہو جائیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"سحر سمجھدار ہے اور مجھے یقین ہے۔ وہ کسی بات سے اختلاف نہیں کرے گی۔ کیونکہ وہ حالات کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہے۔"

"حالات کو سمجھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ۔!"

"بس۔" امی نے اُسے بولنے سے روک دیا۔ "میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے سحر کا دماغ خراب کرنے کی کوشش مت کرنا۔ جو ہو رہا ہے، وہی ٹھیک ہے۔"

وہ ششدر سی امی کی طرف دیکھے گئی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ اُن کے سامنے پھیلے سارے کپڑے اُٹھا کر دور پھینک دے۔ اسی وقت سحر آپی اندر آئیں۔ غالباً چولہے کے پاس سے آ رہی تھیں۔ دوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھتی ہوئی اُس کے پاس بیٹھیں تو وہ تلخی سے ہنستی ہوئی بولی۔

"مبارک ہو سحر آپی! جمعے کو آپ کی شادی ہو رہی ہے۔" اور بے چاری سحر آپی امی کی وجہ سے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو امی سے پوچھ لیں۔"

"مہرو! تم جاؤ یہاں سے۔"

امی نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ پھر جب دوبارہ کمرے میں آئی تو سحر آپی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی جان گئی کہ انہیں بھی ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ اُن کی شادی جواد سے ہو رہی ہے۔ اسے اپنی اس بزدل سی بہن پر بے طرح رحم آیا۔

"کاش آپی! میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔"

اس نے سوچا اور اس رات سب کے سونے کا یقین کر کے وہ چپکے سے اُٹھی اور دبے پاؤں میں آذر بھائی کے کمرے میں آ گئی۔ وہ اپنی ٹیبل پر بیٹھے بڑے انہماک سے اسٹڈی میں مصروف تھے۔ ہلکے سے کھٹکے کی آواز پر انہوں نے سر اونچا کیا اور اسے دیکھ کر چونکتے ہوئے آواز دبا کر بولے۔

"خیر تو ہے مہرو؟" وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ آئی۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے، صبح کر لینا۔" انہوں نے دانستہ وال کلاک کی طرف دیکھا جو ایک بجا رہا تھا۔

"نہیں ابھی۔" وہ بہت آہستگی سے دوسری کرسی کھسکا کر اُن کے مقابل آ بیٹھی تو وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ کو پتا ہے۔ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔"

‘‘کیا ہو رہا ہے؟’’ وہ اُلٹا اسی سے پوچھنے لگے۔

‘‘سحر آپی کی شادی ہو رہی ہے۔’’ اپنے تئیں اُس نے جیسے دھماکہ کیا، لیکن اُن کا کوئی ردِعمل نہ دیکھ کر حیرت سے بولی۔

‘‘آپ کو حیرت نہیں ہوئی۔’’

‘‘یہ حیرت کی نہیں، خوشی کی بات ہے۔’’ وہ ذرا سا مسکرائے۔

‘‘آپ کے ساتھ نہیں ہو رہی۔’’ اُس کا انداز جھنجھوڑنے والا تھا۔

‘‘کیا کہنا چاہتی ہو تم؟’’ وہ کرسی کی پشت سے کمر لگا کر سیدھے ہو بیٹھے۔ اور دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر سنجیدگی سے اُس کی طرف دیکھنے لگے تو وہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر کہنے لگی۔

‘‘میں جانتی ہوں، آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ سحر آپی کے ہونٹوں پر حالات نے مجبوری و بزدلی کے قفل لگا دیے ہیں۔ لیکن آپ تو مرد ہیں آذر بھائی! آپ کو خاموش نہیں رہنا چاہیے۔’’

‘‘لیکن مہرو۔!’’

‘‘آپ اسٹینڈ کیوں نہیں لیتے؟’’ وہ اُن کی بات سنے بغیر بولی۔ ‘‘ابھی بھی وقت ہے کہہ دیجیے ماموں سے کہ آپ سحر آپی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔’’

‘‘میں یہ سب نہیں کہہ سکتا۔’’

‘‘کیوں؟ کیوں؟’’

‘‘اس لیے کہ ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میری تعلیم۔ اُس کے بعد کوئی جاب پھر سیما اور صبا ہیں۔’’

‘‘یہ سب ٹھیک ہے، اور میں بھی یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ ابھی شادی کریں۔ میرا مطلب ہے ماموں سے بات کر لیں۔ پھر جتنا عرصہ بھی آپ کہیں گے۔ سحر آپی انتظار کریں گی۔’’

‘‘نہیں مہرو! میں ایسا نہیں چاہتا۔ جو کام وقت پر ہو رہا ہے، اُسے ہو جانے دو۔’’ وہ اُس پر سے نظریں ہٹا کر پھر میز پر جھک گئے۔ وہ پنسل سے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے کہنے لگے۔

‘‘اور تم سے کس نے کہا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ایسی کوئی بات نہیں، یقین کرو، سحر کے لیے اس انداز سے میں نے کبھی نہیں سوچا۔’’

‘‘جھوٹ مت بولیں۔’’ وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔ ‘‘صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ بزدل ہیں۔ اپنی بات نہیں منوا سکتے۔’’

‘‘مہر۔!’’ اُنہوں نے بے حد حیران ہو کر اُسے دیکھا۔

‘‘میں غلط نہیں کہہ رہی۔ اتنی آسانی سے اپنی محبت سے نہ صرف منکر بلکہ دستبردار بھی ہو رہے ہیں۔ یہ بزدلی نہیں تو اور کیا ہے۔’’

‘‘بے وقوف ہو تم۔’’ وہ اُسے سمجھانا چاہتے تھے کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

‘‘مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ آپ کچھ بھی کہیں کتنے ہی پردے ڈالیں۔ اپنی ذات پر لیکن میں سب جانتی ہوں۔’’

‘‘تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔’’ وہ اُٹھنے لگے تھے کہ وہ جس طرح آئی تھی۔ اُسی طرح اُن کے کمرے سے نکل گئی۔

اگلے دن وہ امی کے کہنے سے پہلے ہی مشین لے کر بیٹھ گئی۔ اور جو سوٹ انہوں نے کاٹ کر رکھا تھا۔ وہ سینے لگی۔ بظاہر بڑے سکون سے کام کر رہی تھی۔ لیکن اندر جو غبار بھرا تھا، اُس کا اظہار مشین چلانے کے انداز سے ہو رہا تھا۔

‘‘سنو۔!’’ وہ کوئی تیسری مرتبہ سلائی کر کے اُسے اُدھیڑ رہی تھی کہ سحر آپی کہنے لگیں۔ ‘‘جب نہیں دل چاہ رہا تو رہنے دو۔’’

‘‘رہنے دوں، اور جو دل چاہ رہا ہے۔ وہ کروں؟’’

‘‘کر دیکھو۔’’ سحر آپی اُس کے ہاتھ سے کپڑا لیتے ہوئے دھیمی آواز میں بولیں۔

‘‘میرا دل چاہ رہا ہے۔ اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔’’

‘‘بے وقوف ہو تم۔!’’

‘‘صرف بے وقوف نہیں پاگل بھی کہیے آپ سب!’’ اُس کا غبار نکلنے کو تھا کہ سحر آپی نے بند باندھ دیا۔

‘‘مہرو! تم نے اچھا نہیں کیا۔ جن جذبوں کو میں نے سینت سینت کر رکھا تھا۔ انہیں آذر بھائی کے سامنے عیاں کر کے تم نے میرا بھرم کھو دیا۔’’

‘‘آپ کو کیسے معلوم ہوا؟’’ وہ بوکھلائی۔

‘‘رات جب تم اُن کے کمرے میں گئی تھیں۔ میں تمہارے پیچھے آئی تھی۔ تم کیوں گئی تھیں مہرو۔ تم سے کس نے کہا تھا۔’’

‘‘میرے دل نے۔’’ وہ پھر لاپرواہ ہو گئی۔

‘‘دل کی بات مت مانا کرو، سوائے پچھتاووں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔’’ سحر آپی کا لہجہ بھیگا تھا۔ اور شاید آنکھیں بھی جبھی اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر تک اُن کے پیچھے نظریں دوڑاتی رہی پھر سر جھٹک کر دوبارہ مشین پر جھک گئی۔ امی آئیں تو اُسے سلائی کرتے دیکھ کر اطمینان تو ہوا پھر بھی کہنے لگیں۔

‘‘دھیان سے سینا۔ یہی چند جوڑے ہیں۔’’

‘‘انہی چند جوڑوں میں رخصت کریں گی سحر آپی کو؟’’ وہ ہاتھ روک کر شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

‘‘میں کیا کر سکتی ہوں۔’’

‘‘میں نے کہا تو تھا میں نوکری کر لوں گی پھر۔’’

''تم تو یوں بات کرتی ہو جیسے تمہیں ہزاروں کی نوکری مل جائے گی۔ اور مہینے بھر میں تم اُس کا جہیز تیار کرلوگی۔''

''مہینے میں نہ سہی، سال بھر میں ہو جاتا۔''

''بس رہنے دو۔ ویسے بھی جواد کے گھر والوں نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ اللہ چاہے گا سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔''

''اللہ تو ٹھیک ٹھاک ہی کرتا ہے بس بندہ۔'' امی کے گھورنے پر وہ خاموش ہو گئی۔

سحر آپی کی شادی جس طرح بغیر کسی ہلے گلے کے ہوئی اس سے وہ از خود ان حقیقتوں کو سمجھنے لگی جو شروع ہی سے امی اور سحر آپی اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھیں کہ اس گھر اور اس کی کسی چیز پر اُن کا کوئی حق نہیں۔ ماموں جی کی محبت کم احسان ہے، جو اس گھر میں جگہ دینے کے ساتھ ضروریاتِ زندگی کی دوسری اشیاء بھی بساط بھر فراہم کرتے ہیں۔ تب مامی کا رویہ بھی فطری سا لگا۔ اور وہ جو ہمیشہ اُن کے خلاف آواز اُٹھانے کا سوچتی تھی۔ اب خود بخود خاموش ہو گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اُسے اُن کی باتیں بری نہیں لگتی تھیں۔ اندر ہی اندر تلملاتی اب بھی تھی۔ لیکن ضبط سے کام لیتی۔

پہلے امی کو اُسے خاموش رہنے کا اشارا کرنا پڑتا۔ اُس کی آواز دبانی پڑتی، اور اب وہ خود ہی ہونٹ بھینچ لیتی تھی۔ ایسے میں اُس کا چہرہ قدرے سرخی مائل ہو جاتا۔ اور پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو جاتی تھیں۔ اس وقت بھی مامی جی بظاہر مہنگائی کا رونا رو رہی تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ حقیقت میں وہ سحر آپی کی شادی میں ہونے والے اخراجات کی تفصیل بتاتے ہوئے ایک طرح سے جتا رہی ہیں۔

بے چاری امی چپ چاپ سن رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک الماری کے اندر سر دیے اپنے آپ کو مصروف پوز کرتی رہی، پھر ضبط جواب دینے لگا تو کمرے سے نکل کر کچن میں آ گئی۔ رات کا کھانا وہی بنایا کرتی تھی۔ پہلے اُس نے دوپہر کے بچے ہوئے سالن کا جائزہ لیا۔ جو اتنا نہیں تھا کہ رات میں سب کو پورا ہو سکے۔

''کیا پکاؤں؟'' وہ سبزی وغیرہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی ہوئی سوچنے لگی۔ اسی وقت آذر بھائی کچن کے دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ یونہی اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کمال ہے۔ کچن میں کھڑی ہو اور کچھ نہیں کر رہیں چائے ہی بنا لو۔'' اُس نے خاموشی سے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ پھر ریک پر سے مگ اُتارنے لگی۔

''سنو!'' انہوں نے پہلے اُسے متوجہ کیا پھر کہنے لگے۔ ''یہ تم اتنی چپ چپ سی کیوں رہنے لگی ہو۔''

''نہیں تو۔''

''میرا خیال ہے۔ سحر کے جانے سے تم اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگی ہو۔ یا پھر مجھ سے خفا ہو۔''

''آپ سے کیوں خفا ہوں گی؟'' وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''اُس رات۔''

''اُس رات کی بات جانے دیں۔'' اُس نے فوراً ٹوک دیا۔

''کیسے جانے دوں۔ تم نے مجھے بزدل ہونے کا جو طعنہ دیا تھا۔ اُس نے میرے احساسات کو خاصا متاثر کیا ہے۔'' وہ خاموش رہی تو کہنے لگے۔

''میں بزدل نہیں ہوں اور اپنی بات منوانا بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وقت آنے پر ثابت کر دکھاؤں گا۔''

''چائے لیجیے۔'' اُن کی باتوں کے جواب میں مگ اُٹھا کر اُن کی طرف بڑھا دیا تو وہ جھنجلا گئے۔

''عجیب لڑکی ہو تم۔!''

''مجھ پر تبصرہ بعد میں کیجیے گا۔ پہلے یہ بتائیے۔ رات کے کھانے میں کیا پکاؤں۔''

''میرا سر۔!'' وہ جل کر بولے۔

''ارے۔!'' وہ ہنس پڑی۔ ''آخر کس بات پر اتنا بگڑ رہے ہیں آپ! اگر ابھی تک اُس بزدلی والی بات پر غصہ ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتی ہوں۔''

''منہ سے نکلی بات واپس نہیں ہوتی۔''

''چلیے تو معافی مانگ لیتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ میں عملاً ثابت کروں گا۔'' وہ خالی مگ ریک پر پٹخ کر اندر چلے گئے۔ تو وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔

''جس پر ثابت کرنا تھا۔ اُس پر تو کیا نہیں۔''

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کے امتحان شروع ہوئے تو وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر پوری سنجیدگی سے امتحانوں میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران دو تین بار سحر آپی آئیں اور وہ بس کھڑے کھڑے ہی اُن کا حال احوال پوچھ سکی۔ انہوں نے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا بلکہ خود سے کہا تم جا کر اسٹڈی کرو۔ تمہارے امتحانوں کے بعد آؤں گی تو پھر فرصت سے مل بیٹھیں گے۔ پھر جب امتحان ختم ہوئے تو ایک دم فراغت ہی فراغت گھر کا کام وہ اور صبا مل کر کر لیا کرتی تھیں۔

سیما البتہ دور ہی رہتی۔ ویسے بھی اُسے شروع سے گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس بیٹھے بیٹھے حکم چلایا کرتی۔ اور جب سے اُس نے یونیورسٹی جوائن کی تھی، تب سے تو وہ اپنے آپ کو کوئی بہت اونچی شے سمجھنے لگی تھی۔ مامی اُس کی شادی کے لیے خاصی فکر مند تھیں۔ دو ایک اچھے رشتے بھی موجود تھے۔ لیکن سیما خود انکار کر رہی تھی۔ اور اُس کا انکار ہی مامی جی کی پریشانی کا سبب تھا۔ گو کہ مامی جی دوسری اور باتوں کی طرح علی الاعلان اپنی اس پریشانی کا ذکر نہیں کرتی تھیں۔ پھر بھی اُن کے انداز ظاہر کر دیتے تھے۔ اب وہ اس قسم کی باتیں

کرنے لگی تھیں۔

"سیما کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں، پہلے وہ ایم۔اے کرلے، اُس کے بعد اُس کی شادی کا سوچوں گی۔" اور اُس وقت وہ چونکی جب وہ کہہ رہی تھیں۔

"اگر جلدی اُس کی شادی کرنی ہوتی تو جواد سے نہ کردیتی اس کے گھر والے اتنی چاہت سے مانگنے آئے تھے۔ لیکن میں نے اُس کے بجائے سحر کو آگے کردیا۔"

اُس نے امی کے چہرے کی افسردگی اپنے اندر اُترتی محسوس کی اور اُٹھ کر اُن کے پاس چلی آئی۔ بہت آہستگی سے اُن کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنایا اور دھیمی آواز میں بولی۔

"آپ مامی جی کی باتوں کو محسوس مت کریں۔" اور امی رو پڑیں۔

"ہمیشہ اپنی بیٹی کی چھوڑی ہوئی چیز میری بیٹی کے آگے رکھی میں نے شکوہ نہیں کیا۔ بلکہ احسان سمجھ کر صبر و شکر کے ساتھ قبول کیا، لیکن یہاں انہوں نے احسان نہیں کیا بلکہ پتا نہیں کس جنم کا بدلہ لیا ہے کہ میری بیٹی کو جہنم میں جھونک دیا ہے۔"

"امی!" وہ حیران ہوئی۔ "کیا کہہ رہی ہیں آپ! سحر آپی ٹھیک تو ہیں ناں؟"

"کیا ٹھیک ہے۔ زندگی تنگ کر رکھی ہے سسرال والوں نے اُس پر۔"

"کیوں؟" اُس کی نگاہوں میں سحر آپی کا خاموش سراپا آسمایا۔

"وہ اپنے ساتھ لمبا چوڑا جہیز جو نہیں لے کر گئی۔" دوپٹے کے پلو میں آنسو جذب کرتے ہوئے امی نے وجہ بتائی تو وہ ایک دم سناٹے میں آگئی۔

"لیکن آپ نے تو کہا تھا۔ اُنہوں نے کوئی فرمائش نہیں کی۔"

"اُس وقت تو کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ لیکن اب ہر بات میں سحر کو طعنہ دیتے ہیں یہاں تک کہ گھر سے نکال دینے کی بات بھی کرتے ہیں۔"

"اور جواد بھائی؟" وہ کسی آس میں گھر کر پوچھنے لگی۔

"وہ بھی کم نہیں ہے۔" امی کے آنسو پھر ایک تواتر سے بہہ نکلے۔

"دیکھنے میں تو جواد بھائی ایسے نہیں لگتے اور آپ نے مجھے پہلے نہیں بتایا۔"

"تم کیا کرسکتی ہو، سوائے پریشان ہونے کے۔" ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں امی کہ وہ کیا کرسکتی ہے۔ اُس نے سوچا پھر اُنہیں حوصلہ دینے لگی۔

پھر وہ جو یہ سوچ کر اطمینان سے تھی کہ رزلٹ آنے کے بعد جاب کے لیے کوشش کرے گی تو اُس کا سارا اطمینان رخصت ہوگیا۔ اُس نے سوچا۔ سحر آپی کے لیے زیادہ تو نہیں کرسکتی۔ لیکن کوشش کر کے انہیں میکے کا مان تو دے سکتی ہے۔ اور کسی بھی لڑکی کے لیے یہ آسرا بھی بہت ہوتا ہے۔

اگلے دن سے ہی اُس نے اخبار میں "ضرورت ہے" کے اشتہار دیکھنے شروع کردیے۔ اور جہاں کوئی

مطلب کا، اشتہار نظر آیا۔ فوراً اس کے لیے درخواست بھیج دی۔ تین چار جگہوں پر وہ درخواستیں بھیج چکی تھی۔ اور اب بڑی بے چینی سے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک اُس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ جاب کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ اس کا خیال تھا جب کہیں سے بلاوا آئے گا تو بتائے گی، اور شاید اسی لیے اُس کی نظریں ہر وقت دروازے پر رہنے لگی تھیں کہ کہیں کوئی انٹرویو کال کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ ذرا ذرا سے کھٹکے پر چونکتی اور آنے والے کے ہاتھوں کو بغور دیکھنے لگتی تھی۔

اس وقت وہ اتفاق سے آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ جب پوسٹ مین کی آواز کے ساتھ ایک لفافہ دروازے سے اندر آگرا۔ وہ جھاڑو وہیں پھینک کر بھاگی اور لفافہ اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اُسے حیرت ہوئی لفافے پر اُس کے بجائے امی کا نام تھا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے راستے ہی میں اُس نے لفافہ کھول کر خط نکال لیا۔ اور تیزی سے تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔ آخر سطریں پڑھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"کس کا خط ہے؟" امی کے پوچھنے پر وہ پہلے چونکی پھر کچھ اُلجھ کر پہلے امی پھر خط کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"نام نہیں لکھا کیا؟" امی اسے خط کو اُلٹتے پلٹتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"لکھا ہے۔ ملک امتیاز" نام پڑھتے ہی اُس نے نظریں امی کے چہرے پر جمادیں جو اس نام کو سنتے ہی زرد پڑنے لگا تھا۔ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں اُتریں۔ اور کچھ کہنے کی کوشش میں ہونٹ ذرا سے متحرک ہوئے۔ اُس کے اندر بے شمار سوال اُٹھنے لگے جن کا وہ فوری جواب بھی چاہتی تھی۔ لیکن امی کی حالت کے پیشِ نظر وہ خاموش رہی، بس خط اُن کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لینے کے بجائے امی نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"اسے پڑھ کر تو دیکھیں۔ ملک امتیاز نے۔"

"میں کسی ملک امتیاز کو نہیں جانتی۔" امی نے فوراً ٹوک دیا۔

"لیکن انہوں نے تو بڑے دعوے سے اپنے آپ کو ملک شہباز یعنی ابو جی کا بڑا بھائی لکھا ہے۔" اس نے خط امی کے سامنے رکھ دیا۔ پھر خود اُن کے برابر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں نے جب بھی آپ سے اپنے ددھیال والوں کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کہ کوئی نہیں ہے۔ جبکہ ملک امتیاز کا یہ خط جس میں انہوں نے دادا، چچا، پھپھو کا ذکر کیا ہے۔ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سب ہیں۔"

"ہوں گے لیکن تمہارے لیے نہیں۔" امی نے سخت لہجے میں کہہ کر بات ختم کرنی چاہی۔ لیکن اُس کے لیے تو بات اب شروع ہوئی تھی۔

"ایسا کہہ دینے سے رشتے ٹوٹ نہیں جاتے امی اور وہ بھی خون کے رشتے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"دادا جی بیمار ہیں۔ اور وہ ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں۔" پھر سر جھکا کر بولی۔ "میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ آپ کے دادا جی سے کیا اختلافات رہے جن کی بدولت ہمارے درمیان اتنی دوریاں رہیں۔ میں تو بس یہ

چاہتی ہوں کہ اب جبکہ وہ بیمار ہیں اور ہم سے ملنا چاہتے ہیں تو ہمیں اُن کی خواہش رد نہیں کرنی چاہیے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اُن سے ہمدردی کرنے کی۔ وہ ہرگز اُس کے مستحق نہیں ہیں۔" امی غصے سے بولیں۔

"لیکن امی۔!"

"خاموش رہو۔" انہوں نے فوراً ٹوکا پھر سامنے رکھا خط اُٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بولیں۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے ددھیال میں کوئی نہیں ہے تو بس میری اُسی بات کا یقین رکھو۔"

"اب تک یقین کرتی رہی ہوں۔ لیکن اب جبکہ حقیقت سامنے آ گئی ہے تو جھٹلا نہیں سکتی۔" وہ اپنی آواز دبا نہیں سکی۔ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ نے کبھی ہمیں ابوجی کے بارے میں نہیں بتایا۔ اور میں اگر خاموش رہی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے اپنے باپ سے دلچسپی نہ تھی یا اُن کے بارے میں جاننے کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ محض آپ کو آزردگیوں سے بچانے کی خاطر میں نے اپنے دل میں اُٹھتے ہر سوال کو زبان تک آنے سے روکے رکھا۔ اب بھی میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔ بس آپ مجھے دادا جی سے ملنے کی اجازت دیں۔"

"ہرگز نہیں۔" امی کا لہجہ اٹل تھا اور تھوڑی خودسری اور ضد تو اُس کی سرشت میں بھی شامل تھی۔ اس وقت تو خاموش ہو رہی لیکن رات میں دسترخوان پر ماموں جی کی موجودگی میں کہنے لگی۔

"آج میرے تایا ملک امتیاز کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے، دادا جی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مہرو!" امی نے سختی سے ٹوکا لیکن وہ باز نہیں آئی۔ کہنے لگی۔

"امی آپ نہیں جانا چاہتیں لیکن میں ضرور جاؤں گی۔"

اُس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کا خیال تھا امی آتے ہی اُسے ڈانٹیں گی اور اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی۔ لیکن کافی دیر بعد جب امی کمرے میں آئیں تو بہت خاموش سی تھیں۔ بس ایک نظر اُس پر ڈالی۔ اُس کے بعد بالکل لاتعلق ہو گئیں۔ یہ یقیناً اُن کی خفگی کا اظہار تھا جس نے اُسے پریشان بھی کیا۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی امی اسی وقت کہہ سن کر دل کا غبار نکال لیں تاکہ بعد میں وہ سہولت سے اپنی بات منوا سکے۔ لیکن امی اسی طرح خاموشی سے لیٹی رہیں اور پھر سو بھی گئیں۔ جبکہ وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ کسی کسی وقت امی کے چہرے پر نظر پڑتی تو دکھ کی شدید لہر اُس کے پورے وجود میں سرایت کر جاتی۔ سوتے میں بھی اُن کے چہرے پر گئے دنوں کی صعوبتوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اور...... اُسے لگا جیسے اُس نے اُن کے دکھوں میں اضافہ کیا ہو۔ اچانک ڈھیر ساری پشیمانی نے اُسے گھیر لیا تب وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ پھر جب نیند آنے لگی تو کروٹ بدلتے ہوئے اُس نے سوچا۔

"میں امی کو خفا نہیں کروں گی۔ جب تک وہ خود نہیں کہیں گی۔ میں دادا جی سے ملنے نہیں جاؤں گی۔"

اگلے دن وہ ابھی امی کو منانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ سحر آپی آ گئیں۔ اس تمام عرصے میں اُس نے پہلی بار

بغور اُنہیں دیکھا۔ شادی کے بعد ابتدائی دنوں میں گالوں پر جو گلال جھلکتے ہیں اور بات بے بات ہونٹوں کی کلیاں چٹک کر نئے موسموں سے آشنائی کی نوید دیتی ہیں تو سحر آپی اُس کے برعکس نظر آئیں۔ پہلے بھی وہ کوئی بہت زیادہ شوخ مزاج اور کھلکھلانے والی تو نہیں تھیں پھر بھی ایک مبہم سی مسکراہٹ ہمہ وقت اُن کے ہونٹوں کا احاطہ کیے رکھتی تھی۔ جس کا کہ اب نام ونشان تک نہیں تھا۔ امی کے ساتھ آہستہ آواز میں قدرے رازداری کے ساتھ وہ پتا نہیں کیا باتیں کر رہی تھیں کہ وہ اُن کے سر پر جا کر کھڑی ہوئی۔

"اس طرح آپ کے مسئلے حل نہیں ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟" سحر آپی ایکدم سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"میرا مطلب ہے سسرال والوں کی زیادتیاں یوں چپکے چپکے امی سے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ کیا کر سکتی ہیں۔ سوائے پریشان ہونے کے، میری مانیں تو ماموں جی اور مامی سے کہیں جنہوں نے یوں آناً فاناً آپ کی شادی کر دی۔"

"تم خاموش رہو۔" امی نے ہمیشہ کی طرح اسے چپ کرانا چاہا۔

"کیوں خاموش رہوں۔ انہیں جو ہر تیسرے دن جواد بھائی کسی فرمائش کے ساتھ بھیجتے ہیں تو مامی جی سے کہیں، پورا کریں۔" اتفاق سے اسی وقت مامی جی اِدھر آ گئیں۔ شاید سحر کی آمد کا سن کر اُس سے ملنے آئی تھیں۔ اُس کی بات سن کر یہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ وہ کس سلسلے میں اور کیا کہہ رہی ہے۔

"ہم کہاں سے پورا کریں۔ ہمارے پاس قارون کا خزانہ ہے کیا؟" فوراً ماتھے سے اُکھڑتے ہوئے کہنے لگیں۔ "ہم نے شادی کر دی یہی بہت ہے اب اس سے زیادہ کی ہم سے اُمید مت رکھو۔"

"شادی ہی کرنی تھی تو دیکھ بھال کر...... کی ہوتی۔ آپ نے تو جیسے بوجھ اُتار پھینکا ہے۔" امی کے گھورنے اور اشارا کرنے کے باوجود وہ خاموش نہیں رہ سکی۔

"دیکھ رہی ہوں اسے۔ کیا صلہ دے رہی ہے۔" مامی جی امی کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔ "کبھی کسی چیز کی کمی کی یا کوئی فرق رکھا۔"

"اس کا تو دماغ خراب ہے۔" امی نے اُس کی کمر پر زوردار ہاتھ مارا۔ جس سے وہ دو قدم تک لڑکھڑاتی رہی پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔

"اگر فرق نہیں رکھا تو پھر پوچھیں۔ جواد بھائی سے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ کیوں سحر آپی ہر تیسرے دن روتی ہوئی چلی آتی ہیں۔ اگر اُن کی جگہ سیما آپی ہوتیں تو کیا آپ خاموش رہتیں۔"

"اب یہ اُس کا نصیب۔"

"نصیب کو الزام دے کر آپ بری الذمہ نہیں ہو سکتیں مامی جی، جب امی نے سارے اختیار آپ . . ے تھے تو اب آگے بھی آپ ہی کو کرنا ہے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔" مامی چمک کر بولیں۔

"یا اُنہیں سمجھائیں یا اُن کی فرمائشیں پوری کریں۔"
"اُن کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگ جاؤں تو آگے اور کھڑی ہیں۔ اُن کا کیا ہوگا۔ اور اگر تمہیں زیادہ خیال ہے تو جا تو رہی ہو اپنے دادا کے پاس۔ اُن سے کہنا تمہارے باپ کی جاگیر تمہارے نام لکھ دیں۔ پھر اُس سے سحر تو سحر اپنے لیے بھی خوشیاں خرید لینا۔"
"ضرور خریدوں گی۔" وہ اُس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن امی کو روتے دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ وہ بے حد دکھ سے کہہ رہی تھیں۔
"خوشیاں نصیب سے ملتی ہیں۔ جاگیروں سے نہیں ملتیں۔"
"یہی بات اپنی بیٹی کو بھی سمجھادو۔" مامی جی پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں تو وہ کچھ دیر تک گم صم سی کھڑی رہی۔ اور رات جو یہ سوچ کر سوئی تھی کہ امی کو خفا نہیں کرے گی۔ اور اُن کی اجازت سے ہی دادا جی سے ملنے جائے گی تو اب مامی جی کی بات سے وہ پھر اپنی بات پر قائم ہوگئی۔ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے پیچھے سے آ کر امی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
"یہ صحیح ہے کہ خوشیاں نصیب سے ملتی ہیں پھر بھی خود چل کر نہیں آتیں۔ انہیں حاصل کرنا پڑتا ہے۔"
"تم حاصل کرو گی کیسے؟" امی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔
"کچھ دیر پہلے تک تو میں بھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن ابھی ابھی مامی جی ایک راستہ دکھا گئی ہیں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولی۔
"پاگل مت بنو۔ تمہاری مامی جی یونہی ایک بات کہہ گئی ہیں۔"
"کچھ بھی ہو۔ آپ مجھے نہیں روکیں گی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر...... کمرے سے نکل گئی۔
پھر امی، سحر آپی یہاں تک کہ ماموں جی نے بھی اُسے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ بضد تھی کہ دادا جی کے پاس ضرور جائے گی، اور اس کے لیے اُس نے اپنے تایا ملک امتیاز کو خط بھی لکھ دیا تھا کہ وہ آ کر اسے لے جائیں۔ اُن دنوں وہ بڑی شدت سے اپنے تایا جی یا اُن کی طرف سے کسی بھی جواب کی منتظر تھی کہ اس روز آذر بھائی اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہنے لگے۔
"یہ کیا حماقت کر رہی ہو تم؟"
"کون سی؟" فوری طور پر وہ واقعی نہیں سمجھی۔
"میں نے سنا ہے۔ تم اپنے دادا جی کے پاس جانے کا سوچ رہی ہو۔"
"سوچ نہیں رہی، بلکہ جا رہی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "اور دادا جی کے پاس جانا حماقت نہیں ہے۔"
"میں اسے حماقت ہی کہوں گا۔" وہ اس کے اتنے اطمینان پر چڑ کر بولے۔
"آپ کچھ کہیں۔ میں ضرور جاؤں گی۔"
"جانتی ہو۔ پھوپھو جی کتنی پریشان ہیں۔"

"امی کی پریشانی بے بنیاد ہے۔"
"بے بنیاد نہیں ہے مہرو! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" اُن کا انداز جھنجوڑنے والا تھا۔
"آخر آپ لوگ کیا سمجھانا چاہتے ہیں مجھے۔" وہ بے حد اُلجھ کر پوچھنے لگی۔ "صاف کوئی بات بتاتے نہیں اور چاہتے ہیں کہ خود ہی سمجھوں۔ آخر کیا سمجھوں؟"
اس کی بات بھی ٹھیک تھی۔ آذر بھائی کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے، جیسے سوچ رہے ہوں کہ اُسے کس طرح سمجھائیں پھر ایکدم رُک کر پوچھنے لگے۔
"کیا جانتی ہو کہ تمہارے ابو کا انتقال کیسے ہوا؟"
"کیا مطلب؟"
"انہیں قتل کیا گیا تھا!"
"کیا؟" وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کس نے کیا تھا؟"
"آرام سے بیٹھو۔" آذر بھائی نے اُس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر دوبارہ اُسے بٹھا دیا پھر اُس سے قدرے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔
"اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ وہ تمہارے دادا کے بھیجے ہوئے آدمی تھے۔"
"نہیں آذر بھائی!" وہ تاسف سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ "کیسی بات کر رہے ہیں آپ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو...... نہیں میں یقین نہیں کر سکتی۔"
"واقعی یقین کرنے کی بات نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ اور اصل قصہ کچھ یوں ہے کہ تمہارے دادا جی کا مقصد پھوپھو سحر اور تمہیں راستے سے ہٹانا تھا۔ لیکن اندازوں کی غلطی سے تمہارے ابو نشانہ بن گئے۔ اور وہ جو کہتے ہیں۔ نا کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں۔ اس میں خود ہی گرتے ہیں تو یہ مثل تمہارے دادا پر صادق آتی ہے۔"
"لیکن کیوں؟ دادا جی ہمیں کیوں راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔"
"کیونکہ تمہارے ابو جی نے اپنی ٹھیکرے کی مانگ کو چھوڑ کر پھوپھو جی سے شادی کر لی تھی۔ وہ بھی اپنے گھر والوں سے چھپ کر اور جب تمہارے دادا جی کو معلوم ہوا تو انہوں نے فوراً پھپھو جی کو چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ لیکن اس کے برعکس تمہارے ابو جی کا قتل ہوا۔" آذر بھائی خاموش ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگے، تو وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔
"تو اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ سب دادا جی نے کروایا ہے۔"
"ظاہر ہے اور تو ایسا کوئی نہیں ہے جو۔"
"فرض کریں آذر بھائی۔!" وہ اُن کی بات کاٹ کر بولی۔ "اگر یہی سچ ہے، تب تو میرا جانا اور بھی ضروری

ہو گیا ہے۔"
"بیوقوفی کی باتیں مت کرو مہرو۔ تم نہیں جانتیں کہ۔"
"میں جان گئی ہوں۔" وہ پھر اُن کی بات کاٹ گئی۔ اور پلٹ کر براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
"آپ یہی کہیں گے ناں کہ وہاں میری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ تو ہوا کرے۔ کیا کریں گے وہ لوگ زیادہ سے زیادہ یہی کہ مجھے مار ڈالیں گے، مار ڈالیں، پروا نہیں، ویسے بھی کیا رکھا ہے زندگی میں کس کو ضرورت ہے میری ایک طرح سے بوجھ ہی ہوں۔ جسے کسی بھی وقت سحر آپی کی طرح اُتار پھینکا جائے گا۔ اور میں آپی کی طرح گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتی۔" پتا نہیں کیسے اُس کی آنکھوں میں نمکین پانی اُتر آیا اور وہ فوراً اُن کی طرف سے رُخ موڑ گئی۔
"مہرو!" وہ اُٹھ کر اُس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ "کیا ہوا ہے سحر کو؟ کیا اُس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے؟"
"اگر زیادتی ہوئی ہے یا ہو رہی ہے تو آپ کو اس سے کیا؟"
"اچھا چلو۔ سحر کا معاملہ میں خود دیکھ لوں گا۔ اس وقت تم اپنی بات کرو۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں یا تم بوجھ ہو۔"
"بس میں نے جان لیا ہے۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی۔
"تم کچھ نہیں جانتیں۔ بس خود سے ہی ساری باتیں فرض کر لیتی ہو۔"
"پاگل ہوں ناں میں۔"
"اس میں کیا شک ہے۔" وہ اُس کا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے ذرا سا مسکرائے لیکن وہ اسی طرح منہ پھلائے کھڑی رہی تب سنجیدگی سے کہنے لگے۔
"دیکھو پھپھو جی تمہارے جانے کے خیال سے بہت پریشان ہیں۔ تم اُن کی خاطر اپنے دادا کے پاس جانے کا خیال دل سے نکال دو۔"
"نہیں آذر بھائی!" وہ اُن سے زیادہ سنجیدگی سے بولی۔
"عام حالات میں تو شاید میں جانے کا ارادہ ترک کر دیتی۔ لیکن ابھی جو آپ نے ابو جی کے قتل کا بتایا ہے تو میں حقائق جاننے ضرور جاؤں گی۔"
"تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے سامنے اعتراف کر لیں گے۔"
"نہیں لیکن کہیں نہ کہیں حقیقت خود ہی سامنے آ جائے گی۔ اور پلیز آذر بھائی! آپ میرے بجائے امی کو سمجھائیں کہ وہ پریشان نہ ہوں میں جلد واپس آ جاؤں گی!"
"اور اگر تمہارے دادا نے وہیں تمہیں اپنے کسی نواسے یا پوتے سے بیاہ دیا تب۔"

"تب بھی ضرور آؤں گی۔" وہ ہنستے ہوئے اُن کے کمرے سے نکل گئی۔
اور اگلے ہی دن اُس کے تایا جی ملک امتیاز خود اُسے لینے آ گئے۔ چھٹی کا دن تھا۔ ماموں بھی گھر پر تھے۔ وہ اُن سے مل کر بھاگتی ہوئی امی کے پاس آئی۔ اور انہیں تایا جی کی آمد کا بتایا جواب میں انہوں نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ جہاں تھی وہیں رُک گئی۔ اور نظریں چراتے ہوئے بولی۔
"آپ اُن سے مل تو لیں۔ وہ بہت جلدی میں ہیں۔"
"مجھے نہیں ملنا۔" امی نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ "اب جا ہی رہی ہو تو سن لو، وہاں ایسی کوئی بات مت کرنا جو کسی کو بھی ناگوار گزرے۔ کسی سے زیادہ میل جول بڑھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنے دادا جی سے مل کر واپس چلی آنا۔"
"آپ فکر مت کریں۔ میں جلدی آ جاؤں گی۔" اُس نے امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو ساری خفگی بھول کر انہوں نے اسے سینے میں بھینچ لیا۔
"بھئی تمہارے تایا جی جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔" آذر بھائی نے دروازہ بجا کر متوجہ کیا۔ تو وہ امی کے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔
"جاؤ" اُنہوں نے کہا تو وہ اپنا بیگ اُٹھانے کو بڑھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی آذر بھائی نے اٹھا لیا۔ اور اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے رک کر امی کو خدا حافظ کہا پھر جلدی سے باہر نکل آئی۔
"جو باتیں تم یہاں رہ کر نہیں سمجھ پائیں۔ وہ شاید کچھ وقت کی دوری تمہیں سمجھا دے۔" آذر بھائی نے اس کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد شیشے میں جھک کر اُس سے کہا تھا۔

اس اتنی بڑی حویلی میں بہت زیادہ افراد نہیں تھے۔ دادا جی جن کے بارے میں اُس کا خیال تھا کہ وہ بہت ضعیف العمر ہوں گے۔ اور بوجہ بیماری اُن کا کمزور وجود صرف پلنگ کا ہو کر رہ گیا ہوگا۔ لیکن اُس کے برعکس اُن کی عمر اگر زیادہ تھی بھی تو قابلِ رشک صحت نے انہیں بوڑھا نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر اونچے لمبے قد، سرخ و سفید رنگت کے ساتھ۔ گرج دار آواز نے اُنہیں بہت بارعب بنا دیا تھا۔ کہ وہ انہیں دیکھ کر دہلیز پر ہی ٹھٹھک کر رُک گئی تھی۔
"اباجی! یہ مہرو ہے، شہباز کی چھوٹی بیٹی۔"
تایا جی نے اُس کے بارے میں بتایا تو سرتاپا اسے دیکھنے کے بعد انہوں نے اپنے بازو وا کر دیے۔ پھر تایا جی، تائی جی اور اُن کی تین اولادیں دو بیٹے اور ایک بیٹی اور منجھلی پھپھو تھیں۔ بس اتنے ہی افراد حویلی میں رہتے تھے۔ بڑی اور چھوٹی پھپھو بیاہی ہوئی اپنے گھر بار والی تھیں۔ جبکہ چھوٹے چچا اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے۔
البتہ منجھلی پھپھو کے بارے میں وہ فوری طور پر نہیں جان سکی تھی کہ وہ یہاں دادا جی کے پاس کیوں رہتی ہیں۔ پھر دادا جی نے اُن کے تعارف میں اسی قدر کہا تھا کہ یہ تمہاری منجھلی پھپھو ہیں۔ اُن کا ایک ہی بیٹا ہے جو آج کل

اپنے ماموں کے پاس اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ اُن کے شوہر اور گھربار کے بارے میں دادا جی نے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ اور نہ ہی وہ خود سے کوئی سوال کر سکی تھی۔ البتہ دادی جان کے بارے میں اُس نے خود سے پوچھا تھا۔ اور اُن کے بارے میں بتاتے ہوئے دادا جی نے اُس کے ابو کا ذکر بھی کیا۔

''تمہارے ابو کے انتقال کے دو ماہ بعد ہی تمہاری دادی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ نیک بخت جوان جہان بیٹے کا صدمہ برداشت نہیں کر پائی تھی۔ فوراً بستر سے جا لگی اور دو ماہ بعد ہی اُس سے جا ملی تھی۔''

اُس سے دادا کی آنکھوں میں آنسو تھے جو چھلک کر رخساروں سے ڈھلکتے ہوئے اُن کی گود میں گرنے لگے تھے۔ پھر وہ اُس کا چہرا دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بولے تھے۔

''تم ہو بہو شہباز کی تصویر تو نہیں ہو۔ لیکن اُس سے تھوڑی مشابہت ضرور رکھتی ہو۔ اور تمہارے اندر جو اُس کا لہو گردش کر رہا ہے تو اس کی مہک سے میری حویلی کے در و دیوار بھی کھل اُٹھے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح شہباز کی آمد پر کھل اٹھتے تھے۔''

انہوں نے ایک بار پھر اُسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔ اُس کے بعد انہوں نے اُسے آرام کے لیے اُس کے کمرے میں بھیج دیا جہاں پچھلے دو گھنٹے سے وہ ایک ہی جگہ پر صم گم سی بیٹھی تھی۔ اصل میں یہاں آنے سے پہلے آذر بھائی نے جس طرح ابو کی موت کا ذمہ دار دادا جی کو ٹھہرایا تھا اور پھر اُسے بھی خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ انہی باتوں کی روشنی میں سب کا ردِعمل ڈھونڈتی رہی تھی۔ لیکن اس کے برعکس جس محبت سے سب لوگ ملے تھے۔ اُس سے وہ نہ صرف حیران تھی بلکہ اب تو یہ سوچ رہی تھی کہ آخر آذر بھائی نے اُس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا۔

''بی بی!'' کسی ملازمہ نے دروازے سے جھانک کر اُسے متوجہ کیا تو وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ لسی پئیں گی یا چائے؟''

''چائے، اور ذرا جلدی لانا۔''

اُس نے کچھ تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لینے کو ذرا سی گردن موڑی تو۔ نظریں ابو جی کی فریم شدہ تصویر پر جا ٹھہریں۔ وہ فوراً اُٹھ کر اُس طرف آ گئی اور تصویر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ امی کے پاس بھی اُس نے ابو کی دو تین تصویریں دیکھی تھیں۔ لیکن اُن میں ایسی کوئی بھی نہیں تھی۔ ایک خوبصورت مسکراہٹ جسے کیمرے کی آنکھ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا وہ کھو سی گئی۔ پھر بے اختیار اپنے ہونٹ تصویر کی پیشانی پر رکھ دیے۔ چپ چاپ کتنے موتی پلکوں پر آن رُکے اور ٹوٹ کر گرنے کو تھے کہ دروازے پر آہٹ سن کر وہ سنبھل گئی۔ تصویر کو دوبارہ اُسی جگہ رکھ کر پلٹ کر دیکھا۔ ملازمہ چائے لیے کھڑی تھی۔

''کیا یہ کمرا میرے ابو کا تھا؟'' وہ اُس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''جی!''

''کیا تم نے میرے ابو کو دیکھا تھا؟''

''جی پر اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ البتہ میری ماں بتاتی ہے، وہ بہت اچھے آدمی تھے۔'' پھر وہ اُس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ انہی کا کمرا ہے اور یہاں ہر چیز انہی کی رکھی ہوئی ہے۔''

''اچھا۔!'' وہ نئے سرے سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اور بے اختیار ایک ایک چیز کے پاس رُک کر اُسے چھو کر دیکھتی، پھر ڈریسنگ ٹیبل پر سجی ساری چیزیں اُس نے اٹھا اٹھا کر دیکھیں پرفیومز میں زیادہ تعداد پرفیسی اور چارلی کی تھی۔ دھیمی مہک والے ٹالک اور بالوں کے لیے برل کریم، جسے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائی۔ کیونکہ یہی برل کریم سحر آپی بھی استعمال کرتی تھیں۔

اور سحر آپی کا خیال آتے ہی اُس نے بے اختیار ابو کی تصویر کی طرف دیکھا پھر قدرے اونچی آواز میں بڑبڑائی۔

''کس قدر مشابہہ ہیں سحر آپی، ابو سے۔''

''جی مجھ سے کچھ کہا۔'' ملازمہ اُس کی آواز سن کر پوچھنے لگی۔

''آں۔'' وہ پلٹی پھر خالی کپ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''نہیں تم جاؤ۔''

ملازمہ چلی گئی تو وہ کچھ دیر لیٹنے کی غرض سے بیڈ تک آئی، پھر اپنے بیگ پر نظر پڑی تو سوچا پہلے کپڑے الماری میں رکھ دے۔ فوراً اپنی سوچ پر عمل کرتے ہوئے بیگ اُٹھا کر الماری کے پاس آئی۔ اور جب الماری کھولی تو اس میں پہلے سے کپڑے موجود تھے۔ وہ سمجھ گئی یہ سب اُس کے ابو کے ہوں گے۔ تب وہ بہت احتیاط سے اُن کے کپڑوں کے ساتھ اپنے کپڑے رکھنے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا سوٹ بیگ میں سے نکالا تو ساتھ ایک کاغذ ہاتھ آ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' ہلکے سے بڑبڑاتے ہوئے سوٹ رکھ کر کاغذ کھول کر دیکھنے لگی۔

اداس شامیں، اجاڑ رستے کبھی بلائیں تو لوٹ آنا!
کسی کی آنکھوں میں رتجگوں کے عذاب آئیں تو لوٹ آنا
ابھی نئی وادیوں نئے منظروں میں رہ لو مگر میری جان
یہ سارے ایک ایک کر کے تم کو جب چھوڑ جائیں تو لوٹ آنا

''کون ہے!'' اُس نے حیران ہو کر سوچا۔ اور آگے پڑھنے کے بجائے کاغذ اُلٹ پلٹ کر لکھنے والے کا نام تلاش کرنے لگی۔ لیکن کہیں کوئی نام نہیں تھا۔ تب بے دلی سے کاغذ دوبارہ بیگ میں ڈال دیا اور پورا بیگ نچلے خانے میں رکھ کر الماری بند کر دی پھر آ کر بیڈ پر لیٹی تو مسافتوں کی تھکن غالب آ گئی۔ اور جلد ہی نیند نے آ لیا۔

وہ بہت دیر تک سوئی رہی تھی۔ جس وقت اُس کی آنکھ کھلی کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اُس نے فوراً اُٹھ کر

کھڑکی سے پردہ سرکا کر دیکھا۔ شام رخصت ہو رہی تھی۔ اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کرتی ہوئی الماری سے ایک سوٹ ڈال کر باتھ روم میں گھس گئی۔ گو کہ فضا میں کچھ خنکی سی تھی۔ پھر بھی اس نے شاور لے لیا۔ پھر جلدی جلدی گیلے بالوں کو سلجھا کر ہیر بینڈ میں قید کیا۔ دوپٹہ سر سے اوڑھتی ہوئی کمرے میں سے نکل آئی۔ گیلری سے ہال کمرے میں آئی تو منجھلی پھپھو کے ساتھ تایا جی آ گئی۔ اور سر کو قدرے خم دے کر پھپھو جی کو سلام کیا۔ جواب میں اُنہوں نے جیتی رہو کہہ کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"تم بہت دیر تک سوتی رہیں۔" شہوار غالباً بات کرنے کی غرض سے بولی تھی۔

"ہاں کسی نے مجھے اٹھایا ہی نہیں۔"

"میں نے کہا تھا لیکن پھپھو جی نے منع کر دیا۔ تم تھکی ہوئی تھیں ناں۔"

"تھکی ہوئی تو تھی لیکن اب رات میں نیند نہیں آئے گی۔"

"یہ تو ہے خیر کوئی بات نہیں، میں تمہیں کمپنی دوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" پھر پھپھو جی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی دانستہ جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔

"مجھے آپ سب سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ کیونکہ امی اکثر آپ سب کا ذکر کرتی ہیں۔"

"تمہاری ماں کیسے ہمارا ذکر کرتی ہے۔ وہ کبھی ہم سے ملی نہ کبھی ہمیں دیکھا۔" پھپھو جی کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔ جسے محسوس کرنے کے باوجود وہ نظر انداز کر گئی۔

"یقیناً ابو جی نے انہیں آپ سب کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہوگا۔"

"ہاں شہباز۔!" بھائی کے نام پر ایک آہ پھپھو جی کے سینے سے خارج ہوئی پھر وہ فوراً ہی دونوں بھتیجیوں کے درمیان سے اُٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر کے لیے ایکدم خاموشی چھا گئی۔ پھر شہوار کو احساس ہوا تو کہنے لگی۔

"اصل میں پھپھو جی شہباز چچا کے ساتھ بہت زیادہ اٹیچڈ تھیں۔ اور امی بتاتی ہیں دونوں میں بہن بھائی کی محبت کے علاوہ دوستی بھی بہت تھی۔ اور پھر۔" شہوار پتا نہیں کیا کہنے جا رہی تھی کہ ایکدم زبان دانتوں میں دبا کر بات روک لی۔ اُس نے دیکھا تو فوراً موضوع بدلتی ہوئی بولی۔

"یہ بتاؤ۔ تمہارے کیا مشاغل ہیں۔ پڑھ چکی ہو یا ابھی پڑھ رہی ہو؟"

"بی۔ اے کا امتحان دیا ہے۔ رزلٹ کا انتظار ہے۔" اُس نے بھی موضوع تبدیل ہونے پر اطمینان کا سانس لیا۔

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"جاب کروں گی۔"

"کیوں؟" شہوار حیرت کے ساتھ ہنسی۔ "میرا مطلب ہے تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت تو ہے۔" وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولی۔ "ہم شروع سے ماموں جی کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اور اب میں چاہتی ہوں اپنے لیے خود کچھ کروں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اب تمہیں خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ تم دادا جی کے پاس جو آ گئی ہو اور دادا جی۔"

"لیکن میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں آئی۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔

"پھر؟" شہوار کچھ متعجب سی ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ "میرا مطلب ہے کیا تم واپس چلی جاؤ گی۔"

"ظاہر ہے، میں امی اور سحر آپی کو تو نہیں چھوڑ سکتی۔ اور امی سے تو میں کچھ دنوں کا کہہ کر آئی ہوں۔"

"اچھا۔!" شہوار نے کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں سر جھٹکا پھر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ملازمہ نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

"چلو، پہلے کھانا کھا لیں۔" شہوار اُٹھی تو وہ بھی اُس کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

ڈائننگ ہال میں دادا جی موجود نہیں تھے۔ اُس نے سرگوشی میں شہوار سے اُن کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا وہ رات کا کھانا نہیں کھاتے۔ تب خاموشی سے کھانا کھا کر وہ سب سے پہلے اُٹھی تو تائی جی اُس سے کہنے لگیں۔

"ابا جی نے کہا تھا۔ تم کھانے کے بعد ان کے کمرے میں چلی آ جانا۔"

"جی بہتر۔" وہ وہاں سے نکلی تو ملازمہ کی راہنمائی میں دادا جی کے پاس آ گئی۔

"آؤ بیٹا!" وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔ "میں نے جب تمہارے بارے میں پوچھا، معلوم ہوا سو رہی ہو۔"

"جی، وہ گہری نیند آ گئی تھی۔"

"اپنے گھر آئی ہو ناں۔ اس لیے اطمینان سے سوئیں۔"

"شاید۔" وہ اسی قدر کہہ سکی۔

"اور سناؤ۔ اپنی ماں اور بہن کیا نام ہے اُس کا۔"

"جی سحر۔!"

"ہاں سحر، وہ کیسی ہے، سُنا ہے اُس کی شادی ہوگئی ہے۔"

"جی۔!"

"کیا حال ہے اُس کا۔ خوش تو ہے ناں؟" اور اُس نے سوچا۔ وہ اُس کے دادا ہیں جن کا نام اب بھی وہ مختلف کاغذات پر اپنے نام کے آگے لکھتی ہے۔ اور جو وہ سر پر ہاتھ رکھ دیں تو ماں کے بعد اُن سے زیادہ حقدار اور کوئی نہیں پھر وہ اُن سے کیوں چھپائے قدرے۔ جھجک کر بولی۔

"سحر آپی خوش نہیں ہیں۔"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"اصل میں امی اور سحر آپی مجھے کچھ نہیں بتاتیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے سحر آپی خوش نہیں ہیں۔" اُس نے دانستہ

گول مول سا جواب دیا۔
''کیا نام ہے لڑکے کا اور کیا کام کرتا ہے؟''
''جواد بھائی، کسی پرائیوٹ فرم میں ملازم ہیں۔''
''اُس کا پتا لکھوا دینا مجھے۔ میں دیکھ لوں گا۔'' اُنھوں نے اطمینان سے کہا اور وہ بوکھلا گئی۔
''آ۔ آپ دادا جی۔!''
''ہاں میں۔ دادا ہوں اُس کا۔ میں اُس کی خبر گیری نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔''
''کیا خوب۔!'' اُس نے سوچا۔ ''اب تک تو جیسے آپ ہی خبر گیری کرتے رہے ہیں۔''
''تم فکر مت کرو۔'' وہ اسے سوچتے دیکھ کر پتا نہیں کیا سمجھے، اس کا کندھا تھپک کر کہنے لگے۔ ''میں سب ٹھیک کرلوں گا۔''
''جی۔!'' وہ یونہی سر ہلانے لگی۔
''تمھاری ماں کی غلطی ہے۔ کم از کم ہمیں شادی میں ہی بلا لیتی۔ اور پھر میں تو کہتا ہوں جب گھر میں لڑکے موجود ہیں تو باہر لڑکی بیاہنے کی کیا ضرورت تھی۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔
''خیر ایسی غلطی ہم اسے دوبارہ نہیں کرنے دیں گے۔'' وہ اُن کا اشارہ سمجھ کر لمحہ بھر کو سُن ہوگئی۔ جبکہ ذہن کے کینوس پر کسی تحریر کا عکس جھلملانے لگا تھا۔

جو شام ڈھلتے ہی اپنی اپنی پناہ گاہوں کو لوٹتے ہیں
اگر وہ پنچھی کبھی کوئی داستان سنائیں تو لوٹ آنا

''کون؟'' وہ چونکی اور ایکدم سر جھٹک کر کھڑی ہوگئی۔
''کیا ہوا؟'' اسے ایکدم اُٹھتے دیکھ کر دادا جی قدرے حیرت سے پوچھنے لگے۔
''کچھ نہیں۔ اب آپ آرام کریں۔''
''میں تو آرام کرلوں گا یہ بتاؤ، تم جو ساری دوپہر سوتی رہی ہو اب نیند نہ آنے کی صورت میں کیا کرو گی؟'' وہ بہت دوستانہ لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ اور وہ سوچتے ہوئے بولی۔
''ابو جی کی الماری سے کوئی اچھی سی کتاب لے لوں گی۔''
''اچھی بات ہے۔ اور اگر کتاب پڑھنے میں طبیعت نہ لگے تو شہوار سے کہو ٹی وی اور وی سی آر تمہارے کمرے میں رکھوا دے۔'' اُس نے حیرت سے دیکھا تو کہنے لگے۔
''میں اچھی فلم دیکھنے سے منع نہیں کرتا۔''
''میں بھی اچھی فلم ہی دیکھتی ہوں۔'' وہ بہت آہستہ سے ہنسی اور انہیں شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔
پھر جب دادا جی نے خود ہی فلم دیکھنے کی اجازت دے دی تھی تو وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے شہوار

کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کا کمرا کون سا ہے۔ اور یوں ہر کمرے میں جھانکتے پھرنا اسے اچھا نہیں لگا۔ اس لیے ہال کمرے میں رُک کر وہ کسی کے اس طرف آنے کا انتظار کرنے لگی۔ تاکہ شہوار کے بارے میں پوچھ سکے۔
''ہاؤ۔'' پیچھے سے کسی نے اُس کے کان میں زور سے ہاؤ کی آواز نکالی تو وہ اچھل کر دو قدم آگے بڑھی، پھر پلٹ کر دیکھنے لگی۔ پتا نہیں کون تھا۔ اور جو کوئی بھی تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔
''آئی۔ ایم سوری۔ میں سمجھا تھا شہوار'' وہ اپنی حرکت کی معذرت کرتے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔ وہ خاموش رہی اور یونہی دو قدم مزید پیچھے ہٹ گئی۔
''ویسے آپ ہیں کون؟''
''مہرو۔'' وہ اسی قدر کہہ سکی۔ اور وہ خوشگوار حیرت کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا۔
''ارے وہی مہرو جس نے پچھلے جنم میں میرے کبوتر اُڑائے تھے۔''
''کیا؟''
''یاد نہیں جب میں نے پوچھا تھا۔ مہرو! میرا کبوتر کیسے اُڑا اور تم نے دوسرا کبوتر اُڑاتے ہوئے کہا تھا ایسے؟''
''نان سینس۔'' وہ ہٹنے لگی کہ وہ سامنے آ گیا۔
''نان سینس نہیں۔ خادم کو جہانگیر کہتے ہیں ملک جہانگیر۔''
''او۔!'' وہ اس کی باتوں کا مطلب سمجھتے ہوئے طویل سانس لے کر بولی۔ ''اور میں ملک شہباز کی دختر نیک اختر۔''
''او۔!'' وہ اسی جیسی آواز نکالنے کے بعد بولا۔ ''پھر تو بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مدتوں سے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے ہم۔''
''میری۔'' وہ اپنی طرف اشارہ کرکے خوامخواہ ہنسی۔
''جی! اور اب تو آنکھیں پتھرانے لگی تھیں۔''
''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے لگی کہ پھپھو جی کو آتے دیکھ کر رُک گئی۔ اور دوسرے پل وہ امی کہہ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔
''کچھ تو خیال کرو۔'' پھپھو جی نے بمشکل اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑایا پھر اس سے کہنے لگیں۔
''مہرو! میرا بیٹا ہے۔ جہانگیر۔''
''اور امی! یہ وہی لڑکی ہے ناں جس کا آپ بہت ذکر کیا کرتی ہیں۔''
اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی جسے وہ تو نہیں سمجھی پھپھو جی شاید سمجھ گئی تھیں۔ جبھی اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔ وہ کچھ کنفیوز سی ہوگئی۔

''پھپھو جی! شہوار کا کمرا کہاں ہے؟'' انہوں نے جس طرف اشارہ کیا، وہ فوراً اسی طرف چل پڑی۔

اُسے یہاں آئے تیسرا چوتھا دن تھا۔ اور سب کی اتنی محبتوں کے باوجود وہ بہت زیادہ دن یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اتنی جلدی اپنی واپسی کے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ جبکہ اب اُسے امی بہت یاد آ رہی تھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال کہ اُس کے یہاں آنے پر پتا نہیں مامی جی انہیں کیا کیا باتیں سناتی ہوں گی۔ کیونکہ وہ تو جب اُس نے اپنے یہاں آنے کا ذکر کیا تھا تب بھی طنزیہ سی گفتگو کرنے لگی تھیں۔ اُنہوں نے ہی کہا تھا

''جا تو رہی ہو اپنے دادا جان کے پاس۔ اُن سے کہنا تمہارے باپ کی جاگیر تمہارے نام لکھ دیں۔ پھر اس سے اپنے اور سحر کے لیے خوشیاں خرید لینا۔''

''جاگیر اور خوشیاں۔'' وہ اس وقت پچھلی طرف کے لان میں ٹہل رہی تھی۔ مامی جی کی بات یاد آئی تو تلخ سی ہنسی اُس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ بڑھتے ہوئے قدموں کو اُس نے وہیں روک دیا۔ اور سر اونچا کر کے سنگ مرمر سے بنی اس بلند و بالا عمارت کو دیکھنے لگی جس کی مکین بظاہر بہت مطمئن اور خوش و خرم نظر آتے تھے۔

''پتا نہیں۔ یہ لوگ واقعی اتنے مطمئن اور خوش ہیں یا نہیں۔'' اس نے سوچا اور وہیں گھاس پر گھٹنے ٹیک دیے۔ عجیب طرح کی اداسی من میں اُترنے لگی تھی۔ شاید پہلی بار شدت سے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا تھا کہ اسی گھر کی فرد ہوتے ہوئے وہ محروم کیوں رہی۔ پھر کبھی امی اور تائی جی کا موازنہ کرنے لگتی اور کبھی سحر آپی کو شہوار کے ساتھ ملاتی۔ اپنی سوچوں میں اس قدر محو تھی کہ جہانگیر کے آنے کا پتا نہیں چلا۔

''میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ آیا ہوں۔'' وہ اُس کے سامنے بیٹھتا ہوا بے تکلفی سے بولا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئی۔

''یوں کیا دیکھ رہی ہو۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا شرارت سے مسکرایا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ سر جھکا کر گھاس کے تنکے نوچتی ہوئی جیسے اپنے آپ سے لڑنے لگی۔

''لگتا ہے، تم یہاں آ کر خوش نہیں ہو۔''

''نہیں۔ مجھے یہاں آ کر خوشی ہوئی۔ لیکن اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''ارے اتنی جلدی۔!''

''اصل میں، میں امی سے کبھی الگ نہیں ہوئی۔ اور یہ تین چار دنوں کی دوری مجھے صدیوں پر محیط لگ رہی ہے۔''

''پھر بھی اتنی جلدی تمہاری واپسی ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' وہ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ اور بس یونہی دونوں ابروؤں کے درمیان گہری لکیر کھینچ گئی تھی۔

''ظاہر ہے۔ تم پہلی بار یہاں آئی ہو۔ اور ہم تو کبھی غیروں کو بھی اتنی جلدی نہیں جانے دیا کرتے۔ اس سے ہماری مہمان نوازی پر حرف آتا ہے۔''

''فکر مت کرو، میں تمہاری مہمان نوازی کے بہت چرچے کروں گی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چند قدم ہی چلی تھی کہ وہ ایک ہی جست میں سامنے آ گیا۔

''سنو۔ کیا صرف مہمان نوازی کے چرچے کرو گی؟''

''پھر؟'' وہ بے ساختہ مسکراہٹ بمشکل روک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''بے چارے میزبان۔''

''لازم و ملزوم ہیں دونوں۔'' وہ ہنستی ہوئی تیز قدموں سے اندر چلی آئی تو پہلے مرحلے پر پھپھو جی سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

''تم نے جہانگیر کو تو نہیں دیکھا؟''

''جی، وہ لان میں ہیں۔''

''تمہارے ساتھ تھا۔'' گو کہ پھپھو جی نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ لیکن اُن کے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا کہ اُسے اپنی دھڑکنیں رُکتی ہوئی سی لگیں۔ بہت آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''پتا نہیں کیا سوچتی ہوں گی پھپھو جی!'' اُس نے سوچا اور کتنی دیر تک اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرتی رہی تھی۔

پھر رات کے کھانے کے بعد وہ دادا جی کے پاس آ بیٹھی۔ پہلے یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

''دادا جی۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''اتنی جلدی۔'' جہانگیر کی طرح اُنہوں نے بھی یہی کہا۔

''میں امی سے یہی کہہ کر آئی تھی کہ جلدی آ جاؤں گی۔'' اس نے جلدی جانے کی وجہ بیان کی پھر کہنے لگی۔ ''اصل میں سحر آپی کی شادی ہو جانے سے امی کچھ اکیلی سی ہو گئی ہیں۔ پھر میں بھی یہاں آ گئی ہوں۔ وہ پریشان ہو جائیں گی۔''

''کیوں کیا گھر میں اور لوگ نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے تمہارے ماموں اور اُن کے بال بچے۔''

''وہ سب تو ہیں لیکن۔'' اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

''بیٹا! اگر تم اپنی ماں کے لیے اداس ہو تو ہم اُسے بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔'' اُنہوں نے اتنی سہولت سے بات کہی کہ وہ کتنی دیر تک اُن کی طرف دیکھتی رہی جیسے اُسے یقین نہ آیا ہو پھر کچھ الجھ کر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

''مشکل ہے۔''

''کیا مشکل ہے۔''

''میرا مطلب ہے۔ امی یہاں نہیں آئیں گی۔'' وہ سر جھکا کر صاف گوئی سے بولی۔

''کیوں؟''

"ظاہر ہے، جب ابو جی کی زندگی میں یہاں نہیں آئیں تو اب کیسے آسکتی ہیں۔"

اس کی بات کے جواب میں وہ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکے تو وہ دُزدیدہ نظروں سے اُنہیں دیکھنے لگی کہ کہیں انہیں اس کی بات ناگوار تو نہیں گزری۔ اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار تو نہیں تھے۔ البتہ انداز سوچتا ہوا تھا۔ کافی دیر بعد کہنے لگے۔

"اب جب کبھی میں تنہائی میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ اس وقت میرے پیش نظر صرف اپنی بیٹی کی ذات، اس کا گھر اور اُس کی خوشیاں تھیں۔ شہباز کیا چاہتا ہے۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور پھر اسے میں نے انا کا مسئلہ بھی بنالیا تھا کہ شہباز نے ایک تو غیر برادری میں اپنے سے کمتر لڑکی سے دوسرے میری مرضی کے خلاف نکاح کرلیا ہے۔ اور میں نے اپنے زعم میں اس پر حویلی کے دروازے بند کردیے۔ لیکن ہاتھ تو پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ البتہ دل پر گہرے زخم ضرور لگے۔ شہباز کا قتل پھر بیٹی کا گھر اُجڑا۔ اُس کے بعد تمہاری دادی۔" وہ ذرا دیر کو خاموش ہوئے تھے اور اس ذراسی دیر کی خاموشی میں اُس کا ذہن کتنی بہت ساری باتیں ایک ساتھ سوچ گیا۔

"بچپن کی مانگ کو ٹھکرا کر امی سے شادی پھر پھپھو جی کا گھر بچانے کے لیے ضروری تھا کہ ابو جی امی کو چھوڑ کر اپنی بچپن کی مانگ یعنی پھپھو جی کی نند سے شادی کرتے۔ اور جب ابو جی اُس کے لیے تیار نہیں ہوئے تو امی کو راستے سے ہٹانے کی سازش اور سازش کا شکار ابو جی۔" اُس کے اندر باہر ایک محشر برپا ہوگیا۔ بے پناہ شور اور اس شور میں نمایاں آواز آذر بھائی کی۔

"ہمارا خیال ہے، وہ آدمی تمہارے داداجی کے بھیجے ہوئے تھے۔ وہ پھپھو جی۔ سحر اور تمہیں راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ لیکن اندازے کی غلطی سے تمہارے ابو نشانہ بن گئے۔"

"میرے خدا۔" شور تھم گیا۔ سنّاٹوں کا راج ہوگیا۔ اور وہ سانس روکے ایک ٹک داداجی کو دیکھے گئی۔ دل چاہا، ایک زوردار چیخ کے ساتھ سب کو اکٹھا کرے اور پھر سامنے بیٹھے شخص کی عمر کا خیال کیے بغیر اُس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہے۔

میری ماں کے سر پر بیوگی کی چادر ڈالنے والا یہی ہے۔

یہی ہے ہمارے سروں سے سائبان چھیننے کا سزاوار۔

اور لوگو۔

اگر جو منصف ہو تو انصاف کرو۔

"اگر اس وقت۔" کچھ دیر بعد اُس کی حالت سے بے خبر وہ اسی پُرسوچ انداز میں گویا ہوئے۔ "میں غصے کے بجائے مصلحت اندیشی سے کام لیتا تو اتنے گہرے زخم نہ لگتے۔ بیٹی کا گھر بچانے کی ہی بات تھی، تو شہباز کے بعد شجاعت موجود تھا میں اُس کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کردیتا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ غصے میں انسان کی مت ماری جاتی ہے تو میرے ساتھ بھی یہی ہوا، یہ ساری باتیں تو اس وقت سمجھ میں آئیں جب شہباز۔"

اُن کی آواز بھر گئی تھی۔ شاید اس لیے وہ خاموش ہوگئے۔ اور وہ جو اُن کے لیے دل میں بے پناہ نفرت لیے بیٹھی تھی۔ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

"آپ جانتے ہیں، ابو جی کو کس نے قتل کیا؟" یہ سوال اُن کے لیے شاید غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لیے کوئی نیا تاثر اُن کے چہرے پر نہیں اُبھرا۔ البتہ کچھ دیر خاموش ضرور رہے، پھر اسی طرح نفی میں سر ہلانے لگے۔

"آپ نے جاننے۔ میرا مطلب ہے قاتلوں کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی۔"

"بہت کوشش کی لیکن کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ کون لوگ تھے اور انہیں شہباز سے کیا دشمنی تھی۔"

"آپ کو کسی پر شبہ تو ہوا ہوگا؟"

"شبہ نہیں یقین۔"

"کس پر؟" وہ بے صبری کا مظاہرہ کرگئی۔

"اپنے آپ پر۔" اُن کے اتنے اطمینان پر وہ پہلے حیران ہوئی پھر نا یوں کہ وہ کہہ رہے تھے۔ "اس لیے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ اگر میں شہباز کی خوشی کی خاطر اُس کی بیوی اور بچیوں کو گھر لے آتا تو کسی کی مجال نہیں تھی اُس پر ہاتھ ڈالنے کی۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ امی سحر آپی اور مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہو، لیکن غلطی سے ابو جی!" وہ اُن پر نظریں جما کر بولی تھی۔ جبھی اُن کا چونکنا چھپا نہیں رہ سکا۔ پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگے۔

"اس نہج پر بھی ہم نے سوچا تھا۔ لیکن کوئی سراغ نہیں ملا بہرحال۔" وہ طویل سانس لے کر خاموش ہوگئے تو وہ کچھ دیر تک اُن کی طرف دیکھتی رہی پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے واپس چھوڑنے کون جائے گا؟"

"کوئی بھی اور اگر کہو تو میں خود چھوڑ آؤں گا۔ لیکن بیٹا ابھی نہیں۔ ابھی کچھ عرصہ تم یہیں رہو۔"

"نہیں داداجی! میں اب مزید یہاں نہیں رُک سکتی۔" ایک دم سے اجنبی سی ہوگئی۔

"اچھی بات ہے جیسے تم خوش۔" وہ افسردگی سے مسکرائے، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"صرف امی کی وجہ سے جانا چاہتی ہو یا کوئی اور بات بھی ہے؟"

"اور باتیں بھی ہیں۔"

"مثلاً"

"جو محرومیاں میری امی کا مقدر کی گئیں۔ مجھے اُن کے ازالے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اور یہاں رہ کر وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ میں جا کر اپنی کوششیں تیز تر کردوں۔"

"کیا کرو گی تم؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگے۔

"آپ کچھ غلط کہہ گئے۔ غالباً آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں کیا کرسکتی ہوں۔"

"نہیں!" وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ پھر اُس کی پیشانی چوم کر بولے۔ "میں جانتا ہوں تم بہت بہادر ہو۔"

"اب آگے یہ مت کہہ دیجئے گا، اپنے باپ کی طرح۔"

"کیوں کیا تم اُس سے انکار کرو گی؟"

"نہیں۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "کل چلیں گے۔"

"جیسے تم کہو۔" اُنہوں نے رضامندی ظاہر کی تو وہ انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور وہ تنہا نہیں تھی۔ ایک انجانا سا خوف اس کے ساتھ ساتھ آیا تھا۔

"کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو...... نہیں میں یقین نہیں کر سکتی۔" اس نے آذر بھائی کی بات کو جھٹلایا تھا۔ اور اب جیسے سب سے بڑا سچ یہی تھا۔ اسے ان در و دیوار تک سے گھن آنے لگی۔ گزشتہ دنوں میں اس کمرے میں تنہا بیٹھ کر اُس نے کیا کچھ نہ سوچا تھا۔ وقت کا پہیہ اُلٹا چلا کر اُن دنوں کو اس کمرے میں سمیٹ لائی تھی۔ جب ابو کا ساتھ میسر تھا۔ اور اب وہ ابو جی کی تصویر بھی یہاں چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اسی وقت اُسے اُٹھا کر اپنے بیگ میں رکھنے لگی کہ پھر وہی تہہ شدہ کاغذ ہاتھ میں آ گیا۔

نئے زمانوں کا کرب اوڑھے ضعیف لمحے نڈھال یادیں
تمہارے خوابوں کے بند کمرے میں آئیں تو لوٹ آنا

اس وقت وہ اس تحریر میں نہیں اُلجھ سکی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑوں کے ساتھ ابو جی کی کچھ چیزیں بھی بیگ میں بند کیں اور اپنے تئیں صبح واپسی کی تیاری مکمل کر لی۔ لیکن صبح ناشتے کی ٹیبل پر اُسے معلوم ہوا کہ دادا جی نماز کے بعد ہی زمینوں پر چلے گئے ہیں۔ اور جاتے ہوئے وہ خاص طور سے تاکید کر گئے ہیں کہ اُن کی واپسی تک وہ یہیں رہے۔ اُس نے بے حد جھنجلا کر پوچھا۔

"کب تک آئیں گے دادا جی؟"

"آ جائیں گے، تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟"

"اسے امی یاد آ رہی ہیں۔" جہانگیر نے شرارت سے اُسے چھیڑا۔

"ہاں، مجھے امی یاد آ رہی ہیں۔" وہ سختی سے کہتی ہوئی ڈائننگ ہال سے نکل آئی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے پیچھے آ گیا۔

"سوری تمہیں میری بات بری لگی۔"

"نہیں۔" وہ جان چھڑانے کی غرض سے بولی۔

"اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو، تمہیں کہیں گھما لاؤں۔" اُسے اچانک کل شام کا پھپھو جی کا لہجہ یاد آیا تو صاف انکار کر دیا۔

"نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی!"

"چلی چلو میں بہت کم کسی کو ایسی آفر کرتا ہوں۔"

"پھر بھی نہیں۔"

"کیا نہیں۔" پھپھو جی اسی طرف آ رہی تھیں اس کی بات سن کر پوچھنے لگیں تو وہ فوراً بولا۔

"میں اس سے کہہ رہا ہوں تمہیں کہیں گھما لاؤں۔ لیکن یہ انکار کر رہی ہے۔"

"کیوں؟" انہوں نے اُس کی طرف دیکھا پھر خود ہی کہنے لگیں۔

"چلی جاؤ۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی ہو گی۔ کچھ بہل جاؤ گی۔"

"جی وہ۔" وہ کوئی عذر تراشنا چاہتی تھی کہ وہ اُس کی کلائی تھام کر کھینچتا ہوا بولا۔

"چلو۔ کم از کم امی کی بات تو مان لو۔"

"شہوار کو بھی ساتھ لے لوناں۔" وہ اُس کی گرفت سے کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ نہیں جائے گی۔" وہ اسے اسی طرح تقریباً کھینچتا ہوا باہر تک لایا۔ گیٹ کے سامنے دو گاڑیاں اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ اُس نے جیپ کا انتخاب کیا۔ اور پہلے اُسے بٹھا کر پھر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"اب تو موڈ ٹھیک کر لو۔" وہ جیپ اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

"میرا موڈ بالکل خراب نہیں ہے۔ بس میری شکل ہی ایسی ہے۔"

"اچھا۔!" وہ خوشدلی سے ہنسا۔

پھر مختلف جگہوں پر گھماتے ہوئے دوپہر کے قریب وہ اسے ریسٹ ہاؤس میں لے آیا۔ اس کے ساتھ آتے ہوئے واقعی اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن دلکش قدرتی مناظر اور ماحول کی خوبصورتی نے بہت جلد اُس کے اندر ایک خوشگوار سے احساس کو بے دار کر دیا تھا۔ کہ وہ نہ صرف اُس سے باتیں کرنے لگی تھی۔ بلکہ بات بے بات کھلکھلانے بھی لگی تھی۔ اور ریسٹ ہاؤس آنے تک تو جیسے مدتوں سے ساتھ چلتے آ رہے ہوں۔

"بابا۔!" درمیانی کمرے میں رُک کر اس نے اونچی آواز میں پکارا تو فوراً ہی برآمدے کی طرف سے ایک بوڑھا ملازم بھاگا چلا آیا۔

"بابا! یہ مہرو ہے۔ شہباز ماموں کی بیٹی۔"

"اپنے شہباز سائیں کی۔" بابا نے حیرت و خوشی کے ملے جلے اظہار میں اُسے دیکھا۔ پھر بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بابا! ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ملے گا۔" وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ پھر فوراً جھک کر شوز اُتارنے لگا۔

"کھانا بھی ہے سائیں! ابھی لاتا ہوں۔" بابا چلے گئے تو وہ اُس سے کہنے لگا۔

"کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو ناں یا اگر منہ ہاتھ دھونا ہو تو۔"

"ہاں منہ دھوؤں گی۔" اُس کے ساتھ ہی وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ البتہ بابا قالین پر کھیس بچھانے کے بعد اُس پر دسترخوان بچھا رہے تھے۔

''جہانگیر کہاں ہے؟'' وہ کیس پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''چشمے کی طرف جا رہے تھے۔شاید ہاتھ منہ دھونے گئے ہوں۔''

پھر دسترخوان ٹھیک ٹھاک کر کے اُس کی طرف دیکھا تو چپ چاپ دیکھے گئے کہ وہ نروس سی ہو گئی۔لاتعلق نظر آنے کی کوشش میں گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر نظریں دوڑانے لگی۔

''سنو بیٹا!'' بہت دھیمی آواز میں انہوں نے پکارا تو وہ خاصی لاپروائی سے متوجہ ہوئی۔

''تم یہاں کیوں آئیں؟ میرا مطلب ہے، بڑے سائیں کی حویلی میں۔'' اُس کے اعصاب تن گئے ساری لاپروائی جاتی رہی۔اور وہ بغور اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم فوراً واپس چلی جاؤ۔''

''کیوں؟'' اُس نے چونک کر انجانے خوف میں گھر کر پوچھا۔

''تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔بس اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔''

''آپ کچھ نہ بھی کہیں۔تب بھی میں جان گئی ہوں کہ۔''

جہانگیر کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔اور بابا اُٹھ کر کچن کی طرف چلے گئے۔

پھر کھانا کھاتے ہی وہ واپسی کے لیے ضد کرنے لگی۔وہ کہتا رہ گیا کہ کم از کم فارم دیکھ لو لیکن وہ نہیں مانی اور اُس سے پہلے ہی آ کر جیپ میں بیٹھ گئی۔

''تم بہت ضدی ہو۔'' وہ ہار مان کر اُس کے برابر آ بیٹھا۔پھر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد بولا۔

''ویسے مجھے ضدی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔اور تم تو خیر پہلی نظر میں اچھی لگی تھیں۔'' وہ اَن سُنی کر کے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''سُنو! مجھ سے شادی کرو گی؟'' وہ متعجب ہوئی اور بے حد خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا تو پھر بے خیالی میں دیکھے گئی۔اور وہ پتا نہیں کیا سمجھا۔شوخی سے بولا۔

''دیکھ لو، ٹھیک ٹھاک بندہ ہوں۔بلکہ اچھا خاصا ہینڈسم۔'' وہ سنبھل گئی اور قدرے اعتماد سے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے بولی۔

''میرے لیے ظاہری خوبصورتی اہمیت نہیں رکھتی۔''

''فکر مت کرو جیسا میرا ظاہر ہے ویسا ہی باطن۔''

''یہ تو تم خود اپنے بارے میں کہہ رہے ہو ناں۔!''

''جس سے چاہو، تصدیق کرا لو۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے۔''

''نہیں، تم غلط سمجھے ہو۔'' وہ اُس کی پوری بات سنے بغیر فوراً بولی۔

''گویا تم انکار کر رہی ہو۔'' اُس کا دل چاہا ہاں کہہ کر بات ہی ختم کر دے۔لیکن نہیں جانتی تھی کہ اُس کا ردِعمل کیا ہوگا۔اور اس وقت جبکہ مکمل طور پر اُس کے رحم و کرم پر تھی تو اپنے لیے فرار یا دفاع کی کوئی صورت نہ دیکھ کر مصلحت سے کام لیتے ہوئے بولی۔

''نہ انکار، نہ اقرار۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی، میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔امی ہیں ناں وہ جو مناسب سمجھیں گی۔کریں گی۔'' وہ سہولت سے اپنا دامن بچا گئی۔

''یہ تو اچھی بات ہے، لیکن تمہاری امی تمہاری رائے بھی تو لیں گی۔''

''ہاں اور میں کہہ دوں گی جو اُن کا دل چاہے کریں۔''

''اتنی سعادت مند لگتی تو نہیں ہو کہ جو تمہاری امی کہیں گی مان لو گی۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''ارے!'' وہ دل ہی دل میں قائل ہو کر بظاہر ہنس کر بولی۔''خاصے مرد شناس ہو۔''

''اُڑتی چڑیا کے پر بھی گن لیتا ہوں۔''

''میں نے تعریف کر تو دی ہے پھر مزید میاں مٹھو بننے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ کچھ خجل سا ہو کے سر کھجانے لگا تھا۔پھر جب حویلی کے احاطے میں لے جا کر جیپ روکی اور وہ اُتر کر اندر جانے لگی تو پکار کر بولا۔

''سُنو، تمہاری امی جب میرے بارے میں پوچھیں تو منع مت کرنا۔''

اُس نے لمحہ بھر سوچا پھر ایک مسکراتی ہوئی نظر اُس پر ڈال اندر چلی گئی۔

''ارے واہ۔'' شہوار اسے دیکھتے ہی بولی۔''بڑی بے مروت ہو تم، مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا اور اکیلی ہی چلی گئیں۔''

''نہیں شہوار! یقین کرو۔اول تو میں جانا ہی نہیں چاہتی تھی......اور پھر جب پھپھو جی کے کہنے پر جانے لگی تو بار بار کہا، شہوار کو ساتھ لے چلتے ہیں۔لیکن جہانگیر نے سُنا ہی نہیں۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''چلو کوئی بات نہیں۔یہ بتاؤ کیسا لگا ہمارا چھوٹا سا شہر؟'' شہوار اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں آتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اچھا ہے بلکہ بہت خوبصورت ہے۔''

''اور جہانگیر کی کمپنی؟''

''بس ٹھیک تھی۔'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا پھر سینڈل اتار کر اُس کے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

''کہیں سونے کا ارادہ تو نہیں۔''

''نہیں سونے کا وقت کہاں ہے۔بس ذرا لیٹوں گی اور تم بھی میرے پاس آ کر بیٹھو ناں۔''

''آتی ہوں۔پہلے چائے کا کہہ آؤں۔'' شہوار وہیں سے پلٹ گئی۔کچھ دیر بعد واپس آئی تو اطمینان سے

اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔اب سناؤ۔''

''ایک ہی خبر ہے میرے پاس۔'' وہ مسکرائی۔

''کیا؟''

''ابھی ابھی جہانگیر نے مجھے پروپوز کیا ہے۔''

''واقعی۔'' شہوار کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی پھر فوراً آواز دبا کر پوچھنے لگی۔ ''تم نے کیا جواب دیا۔''

''کچھ نہیں۔ ویسے بھی یہ تو امی پر منحصر ہے۔ پتا نہیں، وہ حویلی والوں سے رشتہ جوڑنا پسند بھی کریں نہیں۔''

''تم اپنی بات کرو۔''

''میں اپنی بات کروں تو صاف گوئی کے لیے معاف کرنا شہوار کہ میں خود اس حویلی میں دوبارہ کبھی نہیں چاہتی۔'' قدرے توقف کے بعد طویل سانس لے کر بولی۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے میرے ابو جی کا قا یہیں کہیں اسی حویلی میں موجود ہے۔''

''بے وقوف ہو تم۔ اگر وہ یہاں موجود ہوتا تو کیا دادا جی اُسے زندہ چھوڑ دیتے۔ خیر اس حویلی کو چھوڑو۔''

''میرا خیال ہے، اس ذکر کو ہی چھوڑو۔ بس ایک بات تھی میں نے بتادی۔'' وہ ملازمہ کو چائے لاتے د اُٹھ بیٹھی۔

''بات ختم تو نہیں ہوئی بلکہ اب شروع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ کافی آگے تک چلے گا۔'' شہوار نے ٹرالی سے کپ اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے کہا تو وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

''دیکھنا یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ مجھے پھپھو جی کا رویہ بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کسی وقت مہربا اور کسی وقت لگتا ہے جیسے ایک پل کو میرا وجود گوارا نہ ہو۔ میں نے ان کی آنکھوں میں مختلف اوقات میں مختل رنگ دیکھے ہیں۔''

''یہ ایک فطری بات ہے۔'' شہوار کے منہ سے غالباً بلا ارادہ ہی نکل گیا اور اُس نے اُس کی بات گرفت م لے لی۔

''مجھے بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ پھپھو جی کا رویہ ایسا کیوں ہے؟'' اور اس کے اتنے اصرار سے شہوار مجبور ہوگئی۔

''اصل میں بچپن میں جہاں پھپھو جی کی نسبت طے ہوئی، وہیں بدلے میں تمہارے ابو کی نسبت بھی ہوئی تھی۔ اور خاص طور سے ہمارے ہاں تو زبان سے نکلی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ پھر جب پھپھو جی کی شا ہوئی تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شہباز چچا بدلے میں اُن کی نند کو بیاہ لاتے لیکن اُنہوں نے تمہاری امی سے شا کر لی۔ اُدھر پھپھو جی کے سسرال والے زور دے رہے تھے کہ ہماری لڑکی کو بیاہ کر لے جاؤ، ورنہ ہم تمہاری لڑ چھوڑ دیں گے۔ اور پھپھو جی کو اُن کے گھر میں آباد رکھنے کی خاطر ہی دادا جی نے شہباز چچا سے کہا کہ وہ بیوی

چھوڑ دیں۔ لیکن وہ کسی طرح نہیں مانے۔ بلکہ یہ حویلی ہی چھوڑ گئے۔ یوں پھپھو جی کو اُن کے میاں نے طلاق دے دی۔''

''تو اس میں امی کا کیا قصور؟'' وہ تاسف سے بولی۔

''یقیناً وہ قصور وار نہیں تھیں لیکن یہ بھی ایک فطری سی بات ہے کہ پھپھو جی اپنی تباہی کا ذمہ دار انہیں ہی سمجھتی ہوں گی۔ اور اس لیے تم سے محبت سے بات کرتے کرتے اچانک اُن کا ذہن بھٹکتا ہوگا تو رویہ بھی بدل جاتا ہوگا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' وہ یوں بولی جیسے اُسے یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

''تمہیں شاید پھپھو جی کی کوئی بات بری لگی ہے۔'' شہوار اُس کے لہجے کی ناگواری محسوس کر کے پوچھنے لگی۔

''نہیں۔ ویسے پھپھو جی کو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ جس عورت کو وہ اپنی بربادی کا ذمہ دار سمجھتی ہیں۔ اُس کے ساتھ بھی تو اچھا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ زیادہ قابل رحم ہے کیونکہ کم از کم پھپھو جی کو زندگی کے کسی دوسرے مقام پر تو پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک حویلی سے نکلیں تو دوسری حویلی میں آ گئیں، جہاں درد بانٹنے والے اور دلجوئی کرنے والے بھی موجود تھے جبکہ ساری بدنصیبیاں میری ماں کے حصے میں آئیں۔ میکے کے نام پر صرف ایک بھائی وہ بھی بال بچوں والا۔ اور دادا جی نے اپنی بیٹی کا درد تو محسوس کر لیا۔ اُنہیں سینے سے بھی لگا لیا۔ ہمارا خیال کبھی نہیں آیا۔ کہاں ہیں کس حال میں ہیں؟'' قدرت توقف کے بعد کہنے لگی۔

''بہرحال وقت خواہ کیسا بھی ہو۔ اچھا برا گزر ہی جاتا ہے۔ ہم نے بھی کٹھن وقت گزار لیا۔ اور میں یہاں کسی سے کوئی شکوہ کرنے نہیں آئی۔ نہ ہی رشتہ داریاں جوڑنے آئی ہوں۔ بس تایا جی نے دادا جی کی بیماری کا لکھا تھا۔ میں انہیں دیکھنے چلی آئی۔''

وہ خاموش ہوئی تو شہوار کے پاس جیسے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ کتنا وقت یونہی خاموشی کی نذر ہو گیا۔ اُس کی باتوں سے ماحول میں افسردگی چھا گئی تھی۔ جسے دور کرنے کی خاطر شہوار کہنے لگی۔

''ہم نے خاصے خوشگوار ماحول میں اور بہت اچھی بات شروع کی تھی۔''

''اس بات کو وہیں رہنے دو۔'' اُس نے فوراً ٹوک دیا۔ ''میں نے یونہی کچھ دیر انجوائے کرنے کے لیے وہ بات چھیڑی تھی۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے شہوار! کہ میں جہانگیر تو کیا اس خاندان کے کسی بھی فرد سے رشتہ جوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا مطلب ہے کوئی نیا رشتہ۔''

''چلو چھوڑو۔ میں تمہیں ایک اور خبر سناتی ہوں۔'' شہوار نے وہ موضوع بھی چھوڑ دیا۔ اور نیا موضوع تلاش کر لیا۔'' پتا ہے چھوٹے چچا اس بار الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔''

''اچھا!'' اُس کی ہنسی کچھ استہزائیہ سی تھی۔ اور شہوار اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو۔ شام ہو رہی ہے۔ کمرے میں بند ہو کر بیٹھنا اچھی بات نہیں۔''

''چلو۔'' وہ اُٹھ کر اُس کے ساتھ باہر آ گئی۔

رات میں جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو تھکن کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ ذہن پر کوئی خاص بوجھ تو نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی ایک خیال پر گرفت۔ بس پہلے امی کا خیال آیا تو اُن کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر دادا جی اور اُن کا اچانک زمینوں پر چلے جانا، اُس کے بعد آج دن بھر کے واقعات جن میں خاص طور سے جہانگیر کے بدلتے انداز اور اُس کا پروپوز کرنا۔ کچھ دیر تک اُس کی باتوں پر غور کرتی رہی پھر سر جھٹکا تو شہوار کا خیال آیا اور اُس کے ساتھ اپنی گفتگو کو دل ہی دل میں دہراتے ہوئے اُسے بڑا عجیب سا لگا۔ اور اُس نے سوچا۔ اسے شہوار کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ پتا نہیں اُس نے کیا خیال کیا ہوگا جب میں نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ آئندہ کبھی اس حویلی میں نہیں آنا چاہتی۔ اور یہ بھی کہ حویلی کے کسی فرد سے کوئی رشتہ جوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

''چ چ!'' اُس نے اپنے آپ کو ملامت کی پھر سوچا صبح شہوار سے معذرت کر لے گی۔

''ابھی کیوں نہیں۔ ویسے بھی نیند نہیں آ رہی اور اگر شہوار جاگ رہی ہوگی تو اس کے ساتھ کوئی مووی دیکھ لوں گی۔''

وہ اپنے آپ سے کہتی ہوئی اُٹھ گئی۔ کمرے سے باہر آ کر دیکھا، کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی کہیں کسی طرف سے کوئی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے شہوار کے کمرے کی طرف چل پڑی پھر اس کے کمرے کے کھلے دروازے اور اندر جلتی لائٹ نے اُسے مزید مطمئن کر دیا۔ ذرا سا سر اندر کر کے دوستانہ انداز میں بولی۔

''اگر تم سو نہیں رہیں تو میں آ جاؤں۔''

''آؤ۔ آؤ۔'' شہوار نے مسکرا کر بلایا تو اندر داخل ہوتے ہی اُس کی تائی جی پر نظر پڑی وہ قدرے محتاط ہو گئی۔

''تم سوئیں نہیں۔'' تائی جی نے یونہی پوچھ لیا۔

''نیند نہیں آ رہی۔''

''میرا خیال تھا تم تھکی ہوئی ہو سو چکی ہو گی۔ اس لیے نہ میں تمہارے پاس آئی اور نہ تمہیں بلایا۔'' شہوار اُسے بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے بولی۔

''میرا بھی یہی خیال تھا کہ میں سو جاؤں گی لیکن۔'' وہ ہنس کر چپ ہو گئی۔

''اچھا شہوار! صبح پھر تم جلدی اُٹھ جانا۔'' تائی جی شہوار کو ہدایت کرتے ہوئے چلی گئیں تو وہ پوچھنے لگی۔

''کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، کوئی خاص بات ہے اور تم بتانا نہیں چاہتیں۔'' وہ اُس کی ہاں اور نہیں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے بولی۔

''ارے نہیں۔!'' شہوار جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔ ''اصل میں لیاقت پور میں میری خالہ جی بیمار ہیں صبح امی وہاں جا رہی ہیں۔''

''تم نہیں جا رہیں؟''

''امی تو کہہ رہی ہیں، چلنے کے لیے، لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔''

''کیوں؟''

''تمہاری وجہ سے۔ تم بور ہو جاؤ گی۔ اور پھپھو جی سے ویسے بھی تم کچھ نالاں سی ہو ورنہ۔''

''میں پھپھو جی سے نالاں نہیں ہوں۔'' وہ اُس کی پوری بات سنے بغیر بول پڑی۔ ''وہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ اور آئی ایم سوری شہوار! میں اس وقت کچھ ایسی باتیں کہہ گئی جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھیں۔''

''کم آن مہرو! میں نے تمہاری کسی بات کو مائنڈ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ جس طرح میں نے پھپھو جی کے رویے کو فطری کہا تھا۔ اسی طرح مجھے تمہاری باتیں بھی فطری لگی تھیں۔''

شہوار نے ہلکے پھلکے انداز میں اُسے اس بوجھ سے نجات دلانے کی کوشش کی جو وہ اچانک اپنے دل پر محسوس کرنے لگی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں جانب داری سے کام لے گئی تھی۔''

''کسی غلطی کا احساس ہو جانا بہت بڑی بات ہے مہرو! جبکہ تم اعتراف بھی کر رہی ہو۔'' شہوار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے دباتے ہوئے کہنے لگی۔

''اور اس مقام پر میں تم سے یہی کہوں گی کہ گزشتہ باتوں کو بھلا دینا ہی اچھا ہے اور اب جبکہ تم یہاں آ ہی گئی ہو تو کوشش کرو کہ آپس کی رنجشیں اور بدگمانیاں دور ہو سکیں۔ تم اپنے خلوص اور محبت سے پھپھو جی کو یہ سمجھا سکتی ہو کہ تمہاری امی قصوروار نہیں تھیں۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''یقین کرو، دادا جی بہت پہلے سے بلکہ جب شہباز چچا کا انتقال ہوا اس وقت سے تم لوگوں کو یہاں لانا چاہتے تھے۔ لیکن محض پھپھو جی کی وجہ سے مجبور ہو رہے ہے۔ بہرحال تم پھپھو جی کی طرح مت سوچو۔ بلکہ میں تو کہوں گی اُن کا دل جیت لو۔''

کچھ دیر رُک کر شرارت سے بولی۔ ''اُن کے بیٹے کا دل تو جیت ہی چکی ہو۔''

''کیا؟'' وہ جو سنجیدگی سے سُن رہی تھی۔ اُس کی آخری بات پر چیخ پڑی۔

''غلط نہیں کہا میں نے، کیونکہ ملک جہانگیر جیسے بندے کو متاثر کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ اور تم ایسا کر چکی ہو۔''

''جی نہیں۔''

''جی ہاں۔ اُس نے یونہی تو تمہیں پروپوز نہیں کیا۔'' پھر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔ ''ویسے تم ہو بھی بہت پیاری۔ اور سنو محض گزشتہ باتوں کی وجہ سے یا انتقاماً اسے ریجیکٹ مت کرو، اگر ہو سکے تو کچھ دیر کو ساری باتیں

بھلا کر صرف ملک جہانگیر کے بارے میں سوچ لینا۔شاید تمہارا دل آمادہ ہو جائے۔''

''دل کی بات مت مانا کرو، سوائے پچھتاووں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔'' اچانک اُسے سحر آپی کی کہی بات یاد آئی تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں دل کی بات نہیں مانتی۔''

''چلو تو دماغ سے سوچ لینا۔'' شہوار شاید ہر صورت اُسے آمادہ کرنا چاہتی تھی۔لیکن وہ سہولت سے بات بدل گئی۔

''چھوڑو اس قصے کو، یہ بتاؤ صبح اگر تم تائی جی کے ساتھ جاؤ تو تمہاری واپسی کب ہوگی؟''

''کل شام میں۔'' شہوار سوچتی ہوئی بولی۔''امی اگر وہاں رہ بھی گئیں تو میں شام تک ضرور آجاؤں گی۔ کیونکہ ابو جی میرا کہیں رہنا پسند نہیں کرتے۔''

''پھر تم میری وجہ سے اپنا جانا ملتوی مت کرو۔''

''دیکھوں گی۔اگر امی نے اصرار کیا تو چلی جاؤں گی ورنہ نہیں۔''

''بہر حال ہر دو صورتوں میں جس وقت خود اُٹھنا مجھے بھی اُٹھا دینا۔'' پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔''اب چلو نیند آنے لگی ہے۔اور اب تمہیں بھی سو جانا چاہئے۔تاکہ صبح جلدی اُٹھ سکو۔''

''اوکے شب بخیر۔'' شہوار نے مسکرا کر کہا پھر جب وہ دروازے سے نکلنے لگی تو پکار کر بولی۔

''سنو مہرو! اُس کے بارے میں ضرور سوچنا''

اُس کا اشارا جہانگیر کی طرف تھا اور مہرو اُسے انگوٹھا دکھاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کر آئی۔ہال کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے یونہی بلا ارادہ اوپر دیکھا، جہاں آخری سرے پر جہانگیر کا کمرا تھا۔وہ فوراً سر جھٹک کر آگے بڑھ آئی تو پھپھو جی کے کمرے سے آتی آواز میں اپنا نام سُن کر اس کے قدم آپ ہی آپ وہیں رُک گئے۔وہ یقیناً جہانگیر کی آواز تھی جو کہہ رہا تھا

''میں نے مہرو سے شادی کی بات کی ہے۔اب پتا نہیں وہ مانتی بھی ہے کہ نہیں۔'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''تمہیں ہر صورت اُسے منانا ہے۔شادی کے لیے راضی کرنا ہے۔''

پھپھو جی دبے لہجے میں اصرار کے ساتھ کہنے لگیں۔''میں نے برسوں اس دن کا انتظار کیا ہے۔اور اب جبکہ وہ خود یہاں تک آ گئی ہے تو اُسے ایسے واپس نہیں جانا۔جس طرح میں تمہارے باپ کی حویلی سے نکالی گئی تھی۔اسی طرح وہ طلاق کی کالک ماتھے پر سجا کر یہاں سے جائے گی۔''

''میرے خدا۔!'' اس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی تو اُس نے بہت آہستگی سے اپنا وجود دیوار کے ساتھ لگا لیا۔

''لیکن مجھے خدشہ ہے، کہیں آپ کے انتقام کی آگ میری زندگی کو نہ خاک کر دے۔'' جہانگیر کا اندیشوں

میں گھرا ہوا لہجہ سوچتا ہوا سا تھا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' پھپھو جی یقین سے بولیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ مہرو سے شادی پھر اسے طلاق دینے کے بعد کیا شجاعت ماموں ندا سے میری شادی کریں گے۔''

''اُس کی فکر مت کرو۔ندا سے تمہاری شادی ضرور ہوگی۔''

''سوچ لیں۔ندا میری زندگی ہے۔وہ نہ ملی تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''میں نے کہا ناں، تم اس کی فکر مت کرو۔''

''اوکے۔'' وہ جیسے مطمئن ہو گیا تھا۔جو کچھ دیر بعد اُس کی آواز آئی تھی۔''میں تو کہتا ہوں امی چھوڑیں یہ سب آپ مہرو کو اس کی ماں کے حوالے سے مت دیکھیں۔بلکہ یہ سوچیں کہ وہ شہباز ماموں کی بیٹی ہے۔''

''تم مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔'' پھپھو جی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ اچانک غصے میں آ گئی ہیں۔

''میں آپ کو نہیں سمجھا سکتا لیکن ایک بات ضرور دھیان میں رکھیے گا کہ جس طرح اندازے کی غلطی سے شہباز ماموں کی جان گئی۔اسی طرح میں بھی۔''

''جہانگیر!'' پھپھو جی کی کانپتی ہوئی آواز آئی اور شاید وہ دروازے کی طرف آ رہا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔فوری طور پر اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔اور پورا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔کتنی دیر تک گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ ایک طرح سے جیسے اپنے آپ کو سہارا دیے بیٹھی تھی۔

''آپ یہیں کہیں گے ناں کہ وہاں میرے لیے خطرہ ہے۔'' اُس نے آذر بھائی کی بات کاٹ کر دھڑلے سے کہا تھا۔''کیا کریں گے وہ لوگ زیادہ سے زیادہ یہی ناں کہ مجھے مار ڈالیں گے تو مار ڈالیں۔پروا نہیں۔''

''پھر اب میں کس بات سے ڈر رہی ہوں۔'' اُس نے اپنے آپ سے کہا اور گھٹنوں پر پیشانی ٹکائی تو کتنے موتی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گود میں گرنے لگے۔

''میں آپ کو نہیں سمجھا سکتا لیکن ایک بات ضرور دھیان میں رکھیے گا کہ جس طرح اندازے کی غلطی سے شہباز ماموں کی جان گئی اسی طرح میں بھی۔''

جہانگیر کی بات سارے شبہات کو یقین میں بدل گئی تھی اور وہ جو اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتی تھی۔یہ یقین ہوئے ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔شاید اس کے اندر کہیں یہ خواہش دبی تھی کہ ان ساری باتوں، امی کے شبہات اور خدشات میں کہیں کوئی حقیقت نہ ہوتی کہ وہ جو اک عمر ان قریبی رشتوں سے دور بلکہ لاعلم رہی ہے تو اب ایسی دوری درمیان میں حائل نہ ہو۔وہ یہاں نہ رہے تب بھی اُن کے ہونے کا احساس مان بن کر اس کے ساتھ جائے۔اور وہ ایک عالم کو ان قریبی رشتوں کی خبر دے خاص طور سے سحر آپی سے کہے۔ماموں جی کی چھت سے نکل کر انہیں کھلے آسمان تلے نہیں رہنا پڑے گا۔لیکن مان تو کیا ملتا اندر دبی معصوم سی خواہش یوں پامال ہوئی تھی

کہ اپنا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

اسے یاد آیا یہاں آنے سے پہلے جب اُس نے دسترخوان پر اعلان کیا تھا کہ وہ دادا جی کے پاس جا رہی ہے تو اُس کے بعد مامی جی اُٹھتے بیٹھتے طنز کرنے لگی تھیں۔ اور اُن کی طنزیہ باتوں سے تنگ آ کر ایک دن اُس نے کہا تھا۔

"ہاں میں اپنے دادا جی کے پاس جا رہی ہوں۔ دوبارہ پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گی۔ بلکہ اُن سے کہوں گی امی کو بھی وہیں بلا لیں۔" اور اب اسے لگا جیسے مامی جی اُس کا تمسخر اُڑا رہی ہوں۔

"دیکھ لی اپنے دادا کی حقیقت۔"

"نہیں۔!" اُس کے آنسو اور شدت سے بہنے لگے۔ دل میں کروٹیں لیتے درد نے اس قدر بے چین کیا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنوں کے درمیان آ کر بھی کس قدر تنہا ہو گئی تھی وہ اپنی ذات میں تو تنہا ہوئی، اب اچانک یوں لگا جیسے سب قصداً اُسے تنہا چھوڑے جا رہے ہوں۔ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پہلے دادا جی زمینوں پر چلے گئے۔ صبح تائی جی اور تایا جی کے ساتھ شہوار بھی جا رہی تھی۔ اُس کے بعد۔

وہ الجھنے لگی۔ ایک تواتر سے بہتے آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے صاف کیا پھر فوری طور پر ساری باتوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نئی صورت حال پر غور کرنے لگی تھی کہ پھر وہی تحریر۔

اگر اندھیروں میں چھوڑ کر تم کو بھول جائیں تمہارے ساتھی
اور اپنی خاطر ہی اپنے اپنے دیے جلائیں تو لوٹ آنا

"لوٹنا تو ہے۔" وہ طویل سانس لے کر پھر مسہری پر ڈھے گئی۔ لیکن یہ کون ہے جو ہر مقام پر مجھے واپسی کی راہ دکھاتا ہے۔"

رات کے آخری پہر میں کہیں جا کر وہ سوئی تھی۔ اس لیے صبح حسب معمول اُس کی آنکھ نہیں کھلی۔ جس وقت وہ اُٹھی گیارہ بج رہے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلی تو کمرے میں پھپھو جی کو دیکھ کر ایک دم رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ اور وہ ٹھٹھک کر اُن سے فاصلے پر ہی رُک گئی۔

"اتنی دیر تک سوئی رہیں۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" پھپھو جی لاکھ لہجے میں شہد گھولیں اب وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

"جی ٹھیک ہوں۔" وہ اُن کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بولی۔ "اصل میں رات دیر تک ایک کتاب پڑھتی رہی تھی۔ اس لیے اب اُٹھنے میں دیر ہو گئی۔" پھر اچانک یاد آیا تو پوچھنے لگی۔

"شہوار ہے یا تائی جی کے ساتھ چلی گئی؟"

"چلی گئی۔ اُس نے صبح تمہیں اُٹھایا تھا لیکن تم اُٹھیں نہیں۔ ویسے شام تک وہ آ جائے گی۔"

"جی اُس نے بتایا تھا مجھے اور دادا جی کب آئیں گے؟"

"اُن کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ایک دن بعد یا ایک ہفتے بعد۔"

"ایک ہفتے بعد۔" اُس نے دہرایا پھر کہنے لگی۔ "لیکن پھپھو جی، میں اتنے دن یہاں نہیں رُک سکتی۔ امی پریشان ہوں گی۔"

"پریشانی کی کیا بات ہے۔ اپنے گھر میں ہو۔" شاید امی کے ذکر پر پھپھو جی کا لہجہ بدلا تھا پھر اُس کے پاس رکیں نہیں جاتے جاتے بولیں۔

"ناشتا کرنا چاہو تو ڈائننگ روم میں چلی جاؤ۔"

"جی میں صرف چائے پیوں گی۔" وہ اُن کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ پھر ڈائننگ روم کی طرف مڑ گئی اور وہاں کھڑے کھڑے چائے پی رہی تھی کہ جہانگیر اُسے ڈھونڈتا ہوا وہیں آ گیا۔

"عجیب لڑکی ہو تم میں صبح سے تمہارے اُٹھنے کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ بمشکل اپنے لہجے کی ناگواری چھپا سکی۔

"میں بڑی خالہ کی طرف جا رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی لیتا چلوں گا تاکہ تم ان سب سے بھی مل لو۔"

"بڑی پھپھو کے ہاں۔!" وہ بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تو کیا اب نہیں جا رہے؟"

"جا رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے رُکا ہوا تھا۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے عجلت کا مظاہرہ کرنے لگا۔

"سوری۔ آج میں کہیں نہیں جا سکوں گی۔" اُس نے سہولت سے منع کر دیا۔

"کیوں؟"

"بس طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" پھر جاتے جاتے بولی۔

"پھپھو جی کے ہاں سب کو میرا سلام کہہ دینا اور یہ بھی کہ میں اب نہیں تو پھر کبھی اُن سے ضرور ملوں گی۔"

"کمال ہے۔" وہ اس کے پیچھے آتے بولا۔ "میں تمہاری وجہ سے رُکا رہا اور تم۔"

"آئی ایم سوری!" وہ جلدی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

پھر دوپہر کے کھانے پر پھپھو جی نے اُسے بتایا کہ وہ خاصا خفا ہو کر گیا ہے۔ اُسے اُس کی خفگی کی پروا نہیں تھی۔ اور نہ ہی اُس سے کوئی دلچسپی۔ اس لیے پھپھو جی کی باتوں کو بہت سرسری انداز سے سنتی رہی، جو وہ اُس سے متعلق بتا رہی تھیں۔

پھر کھانے کے بعد پھپھو جی تو سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اور وہ کیونکہ کچھ دیر پہلے سو کر اُٹھی تھی۔ اس لیے اب سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر تک یونہی اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھی رہی پھر اُکتا کر باہر نکل آئی۔ اُسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ گھر کے افراد میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ یونہی چلتی ہوئی ہال کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی تو وسیع لان میں دائیں طرف آخری سرے پر آم کے گھنے پیڑ

تلے چارپائی پر کوئی بوڑھا ملازم بیٹھا نظر آیا۔ اُسے اچانک پتا نہیں کیا خیال آیا کہ خاصی محتاط ہو کر اُس کے پاس چلی آئی۔ پہلے سلام کیا پھر پوچھنے لگی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔''

''ہاں، پر تم ہو کون؟'' بوڑھا ملازم بغور اُسے دیکھتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں مہرو ہوں ملک شہباز کی بیٹی۔'' پھر بغیر کسی تمہید کے اندھیرے میں تیر چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''وہی ملک شہباز جیسے قتل کیا گیا تھا۔ اور قاتل یہی حویلی والے ہیں۔ داداجی، تایاجی، پھپھوجی سب۔!''

''سب کو الزام نہ دو بیٹی۔'' بوڑھے نے تاسف کا اظہار کیا۔ ''بے چارے امتیاز سائیں اور بڑے سائیں تو آج تک شہباز سائیں کا غم سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔''

''تو کیا صرف پھپھوجی!'' اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا اور اپنی حیرت پر بمشکل قابو پا کر بولی۔

''چھوڑیں بابا۔ یہ اکیلی عورت کا کام نہیں ہے۔ ضرور داداجی اور تایاجی ساتھ ہوں گے۔''

''ناں بیٹا! اُنہیں تو کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ اور تم اکیلی عورت کی بات کر رہی ہو تو میں تمہیں بتاؤں بیٹا کہ اکیلی عورت ہی خطرناک ہوتی ہے۔''

ایک اَن پڑھ جاہل شخص کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر اُسے واقعی بہت حیرت ہوئی اور وہ کہہ رہا تھا۔

''بے چارے بڑے سائیں جیتے جی مر گئے۔ اگر اُنہیں ذرا بھی بی بی کے ارادوں کی خبر ہو جاتی تو ایسا نہ ہوتا۔''

''بعد میں داداجی نے کیا کیا؟'' وہ شاکی لہجے میں بولی اور اُسے ذرا احساس نہیں تھا کہ وہ داداجی کی شکایت کس سے کر رہی ہے۔

''کیا کرتے؟ بیٹی کا معاملہ تھا۔ اندر ہی اندر دبا گئے۔ البتہ جن آدمیوں کے ذریعے بی بی نے قتل کروایا تھا۔ وہ اب تک تہہ خانے میں بند ہیں۔''

''اُنہیں بند رکھنے کا کیا فائدہ؟ اصل مجرم تو اب بھی آزاد اور نئے جال بننے میں مصروف ہیں۔'' اُس نے سوچا اور مزید کوئی سوال کیے بغیر وہاں سے اُٹھ آئی۔ اپنے کمرے میں آنے تک جہاں اُس کے اندر داداجی کے خلاف چھائی کدورتیں چھٹنے لگی تھیں۔ وہاں اکیلی عورت کا خوف نفرت کے ساتھ آکاس بیل کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔

شام میں شہوار آئی تو وہ اپنے کمرے میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ شہوار کو دیکھ کر بھی کوئی حرکت نہیں کی۔

''تم ٹھیک تو ہو۔'' شہوار اُس کے سامنے بیٹھی اور اُس کی کلائی چھو کر پوچھنے لگی۔ ''پھپھوجی بتا رہی ہیں۔ تم سارا دن اپنے کمرے سے نہیں نکلیں۔''

''بس یونہی۔'' اس کے ہونٹ ذرا سی حرکت کر کے پھر بند ہو گئے۔

''کمال ہے۔ میں تو سمجھی تھی۔ آج تم پھپھوجی کو اپنا گرویدہ کر چکی ہو گی۔''

''سوری شہوار۔!'' وہ سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے بولی۔ ''جب یہ طے ہے کہ مجھے یہاں سے جانا ہے۔ دوبارہ کبھی نہ آنے کے لیے تو پھر کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو گرویدہ بنانے کی۔''

''لیکن میں تو تمہاری گرویدہ ہو چکی۔''

''اچھا!'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ''جب کبھی میری یاد آئے مجھ سے ملنے آجایا کرنا۔''

''اور تم؟''

''میں صرف تمہیں یاد کر سکوں گی۔'' پھر یاد آیا تو پوچھنے لگی۔ ''تمہاری خالہ جی اب کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں پھر بھی امی ابھی وہیں رُک گئی ہیں۔'' پھر اُٹھ کر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''اب کمرے سے نکلو بھی پتا ہے پھپھوجی تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔''

''اچھا!'' وہ تلخی سے ہنسی پھر کچھ سوچ کر اُس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

اگلے دن دوپہر سے ذرا پہلے داداجی آگئے۔ اُسے معلوم ہوا تو اُسی وقت اُن کے پاس جا کر واپس جانے کی بات کرنے لگی۔

''ابھی کچھ دن رہو ناں میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔'' انہوں نے محبت سے اصرار کیا ''تمہاری یہاں موجودگی سے مجھے لگتا ہے جیسے شہباز میرے آس پاس چل رہا ہو۔''

''داداجی۔!'' پتا نہیں کیا ہوا وہ بے اختیار اُن کے سینے سے جا لگی اور یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ ضبط کرتے کرتے وہ بھی رو پڑے......شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح روئی تھی۔ اور دوسری بار اس وقت جب یہاں سے جا کر اُس نے امی کی گود میں سر رکھا تھا۔ امی شاید اُس کی کیفیت سمجھ کر خاموش تھیں جبکہ مامی جی پریشان ہو گئیں۔ اپنے دوپٹے سے اُس کا چہرا صاف کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''ہم اسی لیے تمہیں وہاں جانے سے منع کر رہے تھے۔ لیکن تم نے کسی کی نہیں مانی۔ اب معلوم ہوا ناں۔ حقیقتوں کا سامنا کرنا کتنا مشکل ہے۔ ارے جب تک انجان تھیں، سکون سے تھیں۔ اب تو ساری عمر یہ احساس کچوکتا رہے گا کہ زخم لگانے والے اپنے ہی ہیں۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی مامی جی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔

''چلو منہ ہاتھ دھو لو۔ آتے ہی ماں کو پریشان کر دیا۔ ایک تو وہ پہلے ہی تمہارے لیے اتنی پریشان رہی ہے۔''

اُس کے لیے مامی جی کا یہ انداز نیا اور حیران کن تھا۔ کیونکہ اُس کی سوچ کے مطابق تو اُنہیں اُسے دیکھتے ہی کہنا چاہیے تھا۔

''تم تو کبھی نہ آنے کے لیے گئی تھیں پھر کیوں آگئیں۔'' بہرحال یہ حیران کن تبدیلی اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اور فی الحال وہ سمجھنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ اس لیے منہ دھو کر آئی تو چپ چاپ پھر امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''اب پھر نہ رو کر ماں کو پریشان کرنا۔'' مامی جی نے کہا تو وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''امی تو یونہی پریشان ہو جاتی ہیں۔'' پھر اُن کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے بولی۔
''میں اپنے دادا جی کے پاس ہی تو گئی تھی۔ کہیں اور تو نہیں جو آپ پریشان ہو گئیں۔''
''ہائیں جب اپنے دادا کے پاس سے آ رہی ہو تو پھر اتنا رونا دھونا کاہے کو مچایا۔'' مامی جی کے چبھتے ہوئے لہجے کے باوجود وہ اطمینان سے بولی۔
''میں تو اس لیے روئی مامی جی کہ امی سمیت آپ سب نے اور آپ کی باتوں میں آ کر میں نے بھی اپنے دادا پر شبہ کرتے ہوئے انہیں قاتل بنا ڈالا تھا۔''
''بس بی بی! اب انہوں نے کوئی نئی کہانی سنا دی ہو گی۔''
''انہوں نے مجھے کوئی کہانی نہیں سنائی میں نے خود حقیقت جانی ہے۔'' پھر اُس نے جو جانا تھا۔ اُس کی تمام تفصیل کہہ سنائی۔ آخر میں کہنے لگی۔
''پھپھو جی اب بھی اپنے انتقام کی آگ میں خود ہی جل رہی ہیں۔ اور جب تک وہ اس آگ کو دہکائے رکھیں گی۔ اسی طرح جلتی رہیں گی، اور میں اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ آئی ہوں۔ کیونکہ اُن کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ بقیہ ساری عمر پلان بناتی رہیں۔ کبھی مہرو کو تباہ کرنے کے کبھی سحر اور کبھی امی کو اور ہر بار کی ناکامی اُن کے اندر کی آگ کو اور ہوا دے گی۔ بالآخر ایک دن اس آگ کی لپیٹ میں وہ خود آئیں گی۔'' اس کی باتیں سن کر بھی امی خاموش تھیں۔ جبکہ مامی جی کہنے لگیں۔
''پھر بھی ایسی عورت سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''
''ہاں اکیلی عورت بہت خطرناک ہوتی ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔
''اکیلی کہاں۔ سب ہیں اُس کے۔'' مامی جی اپنی سمجھ کے مطابق چمک کر بولیں۔
''اکیلی عورت وہ نہیں مامی جی کہ جس کا کوئی نہ ہو بلکہ صرف اپنی من مانی کرنے والی عورت اکیلی ہوتی ہے۔ اور بے حد خطرناک۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی ''لیکن یہ بھی ہے کہ جو جتنا خطرناک ہوتا ہے، وہ اتنی ہی بڑی ٹھوکر بھی کھاتا ہے۔''
''ٹھیک کہتی ہو۔'' مامی جی نے پہلے سر ہلایا پھر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ''اللہ معاف کرے۔''
''سحر آپی کیسی ہیں؟'' وہ امی کی مسلسل خاموشی توڑنے کی خاطر ان ہی سے پوچھنے لگی۔
''ٹھیک ہے۔'' امی نے اسی قدر کہا تھا کہ مامی جی بول پڑیں۔
''کہاں ٹھیک ہے۔ ابھی کل تو یہاں سے گئی ہے۔ وہ بھی آذر جا کر جواد کو سمجھا بجھا کر آیا تھا۔ تب کہیں جا کر سحر کو لے گیا ہے۔''
''اب کیا ڈیمانڈ تھی اُن کی؟'' وہ اب مامی جی سے ہی بات کرنے لگی۔
''کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے۔ اُسی کے لیے پیسہ چاہیے۔ تمہارے ماموں کے پاس تو اتنا نہیں ہے البتہ آذر کہہ رہا تھا۔ کہیں سے انتظام کر دوں گا۔''

''کہاں سے؟'' بلا ارادہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر فوراً کہنے لگی۔
''آذر بھائی کو کہیں سے انتظام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''کیوں؟''
''اس لیے کہ اب جو کریں گے۔ دادا جی کریں گے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا ہے اور یہ بھی کہ وہ آپ کے بعد ماموں جی کے بہت مشکور ہیں کہ آپ نے اُن کے بیٹے کے بال بچوں کو سہارا دیا۔''
''ہمارے تو جیسے کچھ نہیں لگتے۔'' مامی جی برا مانتی ہوئی بولیں۔
''یہ بات نہیں ہے مامی جی!'' وہ اُن کا ہاتھ دبا کر بولی۔ ''دادا جی خود ہم سب سے زیادہ آپ کا حق تسلیم کرتے ہیں اور۔''
''مہرو!'' آذر بھائی کے آنے اور پکارنے سے اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔
پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اُسے دادا جی کی طرف سے ایک رجسٹری لفافہ موصول ہوا۔ جس میں اُس کے نام ایک خط میں اُنہوں نے لکھا تھا۔
''بیٹی مہرو!
خوش رہو!
میں نے شہباز کی جاگیر تمہاری والدہ کے نام کر دی ہے۔ یہ نہ تو اُس کی ایک عمر کی محرومیوں کا ازالہ ہے اور نہ کسی کے گناہوں کا کفارہ۔ بس اپنی والدہ سے کہو، یہ قبول کر لیں۔ شہباز کی چیز سمجھ کر۔
اور بیٹی! میں جانتا ہوں تم پھر کبھی حویلی نہیں آؤ گی۔ اس لیے مجھے اجازت دو کہ میرا جب دل چاہے، تم سے ملنے آ سکوں۔''
''آپ جب چاہیں آ سکتے ہیں دادا جی۔!'' وہ ہلکے سے بڑبڑائی اور بقیہ کاغذات دیکھ کر امی کے حوالے کر دیے۔ جنہیں دیکھنے کے بعد وہ کہنے لگیں۔
''میں ان کا کیا کروں گی؟''
''آپ یہ ماموں جی کو دے دیجئے۔ وہ جو چاہیں کریں جیسے چاہیں اس جائیداد کو سنبھالیں آخر وہی اس گھر کے کرتا دھرتا ہیں۔ اور ہم بھی اسی گھر کے فرد ہیں۔'' اُس نے نیک نیتی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا تو امی پُرسوچ انداز میں سر ہلانے لگی تھیں۔
اسی شام سحر آپی آ گئیں۔ بے حد مرجھائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ جان گئی کہ جواد بھائی نے انہیں آخری وارننگ دے کر بھیجا ہو گا اور گو کہ اب انہیں دینے کے لیے امی کے پاس بہت کچھ تھا۔ پھر بھی وہ اُن کی اس حالت کا ذمہ دار آذر بھائی کو سمجھتے ہوئے ان کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہ اُن سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آخر کیا کمی تھی سحر آپی میں کہ وہ اُن کے لیے اسٹینڈ لینے کے بجائے بہت خاموشی سے دستبردار ہو گئے تھے۔
آذر بھائی کمرے میں موجود نہیں تھے۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر وہ اُن کے انتظار میں وہیں [illegible] ہو گئی۔ اُس کے اندر اُن کے خلاف غصہ بھرا تھا۔ اور اس وقت وہ ہر صورت انہی پر نکالنا چاہتی تھی۔ [illegible]

چاہ رہا تھا زور زور سے باتھ روم کا دروازہ پیٹ کر انہیں فوراً باہر آنے کے لیے کہے۔ چند قدم آگے بڑھی بھی۔
پھر فوراً کچھ اُکتا کر کچھ جھنجلا کر پٹخنے کے انداز میں کتاب رکھی تو نظر کھلے پیڈ پر جا ٹھہری۔

میں روز یونہی ہوا پہ لکھ لکھ کر اس کی جانب بھیجتا رہا ہوں
کہ اچھے موسم اگر پہاڑوں پہ آئیں تو لوٹ آنا!

''ارے!'' وہ بے تحاشا حیرتوں میں آن گھری اور دوسرے ہی پل جانے کتنے لمحات، کتنی باتیں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگی تھیں۔

''ابھی بھی آپ کو یاد کر رہے تھے۔ کس کا نام لوں کہ آپ کو خوشی ہوگی۔'' جس طرح اُس نے امی اور سحر آپی کا خیال کیے بغیر پوچھا تھا۔ اسی طرح انہوں نے بھی اُن دونوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر کہہ دیا تھا۔

''اپنا نام لے لو۔''

''میں بزدل نہیں ہوں مہرو! دیکھنا وقت آنے پر ثابت کر دکھاؤں گا۔''

''جو باتیں تم یہاں رہ کر نہیں جان پائیں۔ ہو سکتا ہے، وہ کچھ وقت کی دوری تمہیں سمجھا دے۔''

''آذر بھائی۔!'' باتھ روم کا دروازہ کھلنے پر وہ وہیں کھڑے کھڑے پوری گھوم گئی۔ وہ تولیے سے اپنے سر کو رگڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ پھر اُس پر نظر پڑی۔ نیم وا ہونٹ اور پوری کھلی آنکھوں کے ساتھ انہیں ہی دیکھے جا رہی تھی۔

''مہرو! اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ اور اُن کے قریب سے نکل کر جانے لگی کہ انہوں نے پکار لیا۔ ''سنو۔!'' اُس نے پلٹ کر دیکھا تو کہنے لگے۔

''کم از کم اپنی بے وقوفی کا اعتراف تو کرتی جاؤ۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ایک دم سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔

''کہ جو بات تمہیں بہت پہلے جان لینی چاہیے تھی۔ وہ اب جان پائی ہو۔''

''کون سی بات؟'' وہ نظریں چرا گئی۔

''یہی کہ آذر خان 'سحر' سے نہیں تم سے محبت کرتا رہا ہے۔ اور تمہارے لیے میں سب سے لڑ سکتا ہوں سمجھیں تم۔'' وہ بات کرتے ہوئے اُس کی طرف آ رہے تھے۔

''اگر نہیں سمجھیں تو اپنی محبت کا ثبوت پیش کروں۔''

اُن کی مسکراہٹ میں شوخی کا رنگ سمایا تب اُن کی بات سمجھ کر دھڑکنوں نے اچانک یوں شور مچایا کہ اُس نے گھبرا کر پلٹنے کے بجائے اُن کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اور اگلے ہی قدم پر تو وہ کھڑے تھے۔ محبتوں کا ساگر لیے جس کی ایک ایک بوند پر بس اُسی کا نام تھا۔



سب منظور ہے

''ہیلو، رملہ! ابھی آ رہی ہو ناں؟'' اُس کے بے تاب لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔ ایسا کبھی ہوا ہے جازی؟''

''ہوا تو نہیں لیکن!''

''ہوگا بھی نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔

''بس تو جلدی سے آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''کوئی خاص بات ہے کیا؟'' وہ متجسس ہوئی۔

''یہ تم آؤ گی تو بتاؤں گا۔''

''نہیں ابھی بتاؤ۔''

''اوں ہوں۔ اوکے بائے۔''

''ہیلو جازی، سنو تو۔'' لائن کٹ چکی تھی۔ اُس نے مسکرا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور جیسے ہی پلٹی سامنے سے احسن آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اپنی تمام تر ڈشنگ پرسنالٹی کے باوجود اُسے اپنا یہ کزن کبھی بھی اچھا نہیں لگا اور ہمیشہ کی طرح اُسے نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اس کا ارادہ بھانپ کر تیز قدموں

سے چلتا ہوا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''ہمیشہ کی طرح ٹھیک ٹھاک۔'' اُس نے ایک انداز تفاخر سے اپنے کندھوں کو ہلکے سے جھٹکا دیا اور پھر حد درجہ بے نیازی دکھاتی ہوئی اُس کے قریب سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے سوچنے لگی کہ پتا نہیں جازی نے کیوں بلایا ہے۔ ویسے اُس کی عادت سے واقف تھی وہ ہمیشہ سرپرائز دیا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ قیاس آرائی کرتے ہوئے گاڑی کی چابیاں اُٹھا کر کمرے سے نکلی تو زارا، احسن کے ساتھ برآمدے ہی میں بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر زارا کے چہرے پر سوالیہ نشان اُبھر آئے۔ تو اُسے کہنا پڑا۔

''زارا، میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔''

''کہاں؟''

''یہ بتانا ضروری ہے کیا؟'' وہ تنک کر بولی۔

''تمہارا قصور نہیں ہے رملہ، ڈیڈی کے لاڈ پیار نے نہ صرف تمہیں بلکہ تمہاری زبان کو بھی آزادی دے دی ہے۔'' زارا نے تاسف اور ناگواری کا اظہار کیا پھر احسن کے لئے چائے بنانے لگی تو وہ اس خیال سے کہ کہیں اُس سے اُلجھ کر موڈ خراب نہ ہو جائے تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔

جاذب گیلانی ہمیشہ کی طرح گیٹ پر ہی منتظر کھڑا تھا۔ گاڑی سے اُترتے ہوئے اُس نے دیکھا سیاہ پینٹ پر یلو شرٹ اُس پر خوب سج رہی تھی۔ اُس کی سحر انگیز شخصیت میں جانے ایسی کیا بات تھی۔ کہ اُس پر نظر پڑتے ہی وہ کچی ڈور سے بندھ جاتی۔ اور وہ شاید اُس کی کمزوری بھانپ چکا تھا۔ جبھی اس کی طرف آنے کے بجائے اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہو گیا۔

''ہیلو۔'' وہ خود ہی اس کے قریب آ گئی۔ جواب میں وہ ہلکے سے مسکرایا اور اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آیا۔ اس کے ساتھ ہال کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ چونک گئی، ہر طرف رنگین آنچلوں کی بہار اُتری ہوئی تھی۔ مختلف پرفیوم اور سگریٹ کی ملی جلی مہک نے اندر کی فضا کو عجیب طرح کا سرور بخش دیا تھا۔ وہ ذرا سی گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی تو وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔

''آج میری برتھ ڈے ہے۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' وہ خفا ہونے لگی۔

سرپرائز۔'' وہ ہنسا۔

''لیکن یہ سرپرائز تمہیں مہنگا پڑا جازی۔''

''کیسے؟''

''ایک اچھے گفٹ سے محروم رہ گئے۔''

''کم آن رملہ! میرے بلانے پر تم آ کر جو میرا مان بڑھا دیتی ہو، وہ میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں۔'' اس کی بات پر وہ ایک دم بہت مغرور ہوئی۔ اور بڑے اعتماد سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی سب کے

درمیان آئی۔

پھر یہ پارٹی غالباً بہت دیر تک جاری رہی تھی۔ کھانے کے بعد میوزک کا پروگرام شروع ہونے لگا تو وہ جازی سے اجازت لے کر گھر آ گئی۔ کیونکہ ڈیڈی نے اُسے جتنی آزادی دے رکھی تھی تو کچھ پابندیاں بھی لگائی تھیں، جن میں یہ پابندی بھی شامل تھی کہ رات نو بجے سے پہلے اسے گھر میں ہونا چاہئے۔ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی نو بج رہے تھے۔ حسب معمول زارا اُس کے انتظار میں لاؤنج ہی میں بیٹھی تھی۔ اور اس وقت اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا جبھی کترا کر نکل جانے کے بجائے زارا کے پاس آ بیٹھی۔

''رملہ! تمہیں اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہنا چاہئے۔'' روزانہ یہی جملہ بولنا شاید زارا کی عادت بن گئی تھی۔

''ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔ اور پتا ہے میں پارٹی کا بہت اہم حصہ چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ حالانکہ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا آنے کو۔''

''کیسی پارٹی؟''

''جازی کی برتھ ڈے تھی۔'' اُس نے خوشی سے بتایا لیکن زارا ہنوز سرد لہجے میں بولی۔

''تمہیں بتا کر جانا چاہئے تھا کہ تم اس کی برتھ ڈے میں جا رہی ہو۔''

''مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ وہاں جا کر پتا چلا۔''

''کم از کم یہی بتا دیتیں کہ تم جازی کے ہاں جا رہی ہو۔''

''میرا خیال ہے زارا، تم جانتی تھیں۔'' اُس کے اتنے آرام سے کہنے پر زارا سلگ کر بولی۔

''مجھے الہام نہیں ہوتا رملہ!''

''تو خفا کیوں ہوتی ہو۔'' وہ بھی چڑ گئی۔

''خفا اس لئے ہوتی ہوں کہ مجھے جازی بالکل پسند نہیں اور نہ ہی میں تمہارا اُس سے میل جول پسند کرتی ہوں۔'' زارا کی صاف گوئی پر وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔

''کیوں۔''

''مجھے لگتا ہے، وہ تمہارے ساتھ فلرٹ کر رہا ہے۔''

''یہ کیسے جانا تم نے!'' اُسے ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''اگر وہ تمہارے ساتھ مخلص ہوتا رملہ تو پہلے اپنے گھر والوں کو بھیجتا۔'' زارا اُس کی خشمگیں نظریں محسوس کرنے کے باوجود آرام سے اپنی بات کہہ گئی تو وہ تڑخ کر بولی۔

''وقت آنے پر گھر والوں کو بھی بھیج دے گا تم کیوں فکر کرتی ہو۔''

''میں فکر نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔ ہمارے سر پر ماں نہیں بیٹھی جو تمہیں اونچ نیچ سمجھائے گی۔ اور تم سے بڑی ہونے کے ناتے یہ کام میرا ہے کہ میں تمہیں اچھے بُرے کی پہچان کراؤں۔ اور زمانے کی اونچ نیچ

بھاؤں۔"

"اور میرا خیال ہے زارا! تین سال کی چھوٹائی بڑائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر تم گھر کے اندر بیٹھ کر مجھے اونچ نیچ سمجھاؤ گی۔ میں خود تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔"

"بہتر سمجھتیں تو یوں آنکھیں بند کر کے جازی کے پیچھے نہیں چل پڑتیں اوّل درجے کا لوفر لگتا ہے مجھے۔ جازی کے بارے میں وہ ایسی باتیں بھلا کیوں سن سکتی تھی۔ بمشکل خود پر قابو پا کر پھر طنزآمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"شاید دوسری لڑکیوں کی طرح تم بھی کچھ جیلس ہو گئی ہو۔"

"رملہ!" زارا کسی طرح ضبط نہیں کر سکی۔ تنبیہی انداز میں زور سے چیخی اور وہ اس کے چیخنے کی پروا نہ کرتے ہوئے سینڈل ہاتھوں میں لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ رملہ! اور میری بات سنو۔" اُس نے دیکھا زارا کے چہرے کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی سرخ ہو گئی تھیں پھر بھی اسی طرح کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"تم نے یہ بات سوچی کیسے کہ میں تم سے جیلس ہوں گی۔" زارا کی آواز کی لرزش اُس کے اندر کے دکھ کو ظاہر کر رہی تھی تب اُسے تھوڑا افسوس ہوا۔ سینڈل قالین پر پھینک کر اس کے برابر آ بیٹھی۔ اور نرمی سے اس کا کندھا چھو کر کہنے لگی۔

"میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا زارا تم خود سوچو۔ کیا کمی ہے جازی میں۔ اتنا اسمارٹ اور ہینڈسم ہے۔ اعلیٰ پیمانے پر بزنس کرتا ہے۔ اور گھر دیکھو تو محل کا گمان ہوتا ہے۔ اور یقین کرو زارا جس محفل میں جاتا ہے لڑکیاں اس کی راہوں میں یوں پلکیں بچھاتی ہیں جیسے وہ کوئی پرنس ہو۔ ایسے میں جب وہ سب کو نظرانداز کر کے میرا ہاتھ تھام لیتا ہے تو میں آپ کی آپ معتبر ہو جاتی ہوں۔" زارا کچھ دیر تک اُسے دیکھے گئی اُسے اپنی نادان بہن سے ڈر لگنے لگا تھا۔ پتا نہیں کس راستے پر چل نکلی تھی وہ اسے کیسے سمجھائے۔ دھیرج سے بولی۔

"تم اس کی ظاہری شان و شوکت سے مرعوب ہو گئی ہو۔"

"اُس کی شان و شوکت ہے ہی مرعوب کر دینے والی اور اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لیے یہ ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو ناں۔"

"نہیں، وہ بارہا مجھ سے اظہار کر چکا ہے۔"

"صرف اظہار کرنے سے کیا ہوتا ہے رملہ! اگر واقعی وہ تمہارے ساتھ مخلص ہے تو اُسے اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہیے۔" زارا شاید آج اُسے قائل کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔ اور وہ اُکتا کر بولی۔

"بھیج دے گا، اتنی جلدی کیا ہے۔"

"جلدی یوں ہے کہ ڈیڈی چاہتے ہیں وہ ہم دونوں کی ایک ساتھ شادی کر دیں۔ اس لیے کہ میرے جانے کے بعد تم اکیلی رہ جاؤ گی۔"

"ڈیڈی نے اس بارے میں کچھ کہا تم سے!"

"مجھ سے براہِ راست تو ڈیڈی نے بات نہیں کی۔ لیکن عاصم کے گھر والے تاریخ لینے آئے تھے تو اُن سے ڈیڈی نے یہی کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں رملہ کی کہیں بات ہو جائے تو دونوں کی ایک ساتھ شادی کریں۔"

"یعنی میری وجہ سے تمہارا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ خیر تم فکر نہیں کرو، میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی، میری وجہ سے تمہاری شادی نہ روکیں۔"

عجیب لڑکی تھی کسی طرح اُس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر زارا زچ ہو گئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو، میں خود بھی ایسا ہی چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میرا دھیان تمہاری طرف لگا رہے گا۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تو میں بھی بے فکر رہوں گی۔"

"زارا! آخر تم میری آزادی کیوں چھین لینا چاہتی ہو؟"

"کس آزادی کی بات کرتی ہو رملہ تم! یوں جازی کے ساتھ کوئی ناتا نہ ہوتے ہوئے آزاد گھومنے پھرنے کو تم آزادی کہتی ہو۔ یہ آزادی نہیں ہے میری بہن بے راہ روی ہے۔ چھوڑ دو یہ راستہ بلکہ میں تو کہتی ہوں اس کا خیال ہی دل سے نکال دو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا زارا۔ اس کی محبت پر مجھے یقین ہی نہیں...... ایمان بھی ہے۔ اور میں خود اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر اس سے کہو اپنے گھر والوں کو بھیجے، ورنہ آج احسن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے لیے اپنی امی کو بھیجنا چاہتا ہے۔"

"کیا؟" وہ ایک دم چیخ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "احسن کی جرأت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی۔"

"یہ جرأت اس کے اعلیٰ کردار کی نشانی ہے رملہ! ورنہ اب تک جازی نے ایسی جرأت کیوں نہ کر لی۔"

"جازی کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کرو زارا، تم نہیں جانتیں جازی کیا ہے میرے لیے اور احسن ہونہہ! مائی فٹ۔" وہ نفرت سے پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ جازی کی برتھ ڈے میں جتنا انجوائے کیا تھا...... اب زارا کی باتوں نے اتنا ہی موڈ خراب کر دیا تھا۔ خصوصاً احسن پر تو بس نہیں چل رہا تھا کہ آخر کیا سوچ کر اُس نے ایسی بات کی تھی۔ جبکہ وہ تو ہمیشہ ہر مقام پر نہ صرف اُسے نظرانداز کرتی رہی تھی بلکہ اُس کے ساتھ اس کا رویہ بھی بڑا توہین آمیز ہوا کرتا تھا جس سے اس کی نفرت صاف جھلکتی تھی۔ اور وہ اسی بات پر بری طرح تپ رہی تھی کہ جب احسن جانتا ہے کہ وہ اُسے سخت ناپسند کرتی ہے پھر اُس نے اس کے بارے میں کیسے سوچ لیا۔ اب بھی کہیں سے وہ سامنے آ جائے تو وہ کھڑے کھڑے اُسے اس کی اوقات یاد دلا دے۔

''جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے افسری کرتے بن کر آ گیا میرا دعویدار۔ ہونہہ۔'' دل ہی دل میں اُسے بے شما گالیاں دینے کے باوجود اس کا غصہ کم نہیں ہوا تو لابی میں آ کر اس کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''یس، ایس پی احسن کمال۔'' وہ دانت پیستے ہوئے چبا چبا کر بولی۔ ''میں رملہ احسان بول رہی ہوں۔''

''کہو رملہ کیسی ہو؟'' وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولا۔

''اس کا جواب میں شام ہی میں تمہیں دے چکی ہوں۔''

''اچھا تو ہمیشہ کی طرح ٹھیک ہو۔'' اُس کے انگارے سے چبانے کے باوجود وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔ تو وہ مزید سلگ گئی۔

''سنو احسن کمال! میں لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی قائل نہیں ہوں۔ سیدھی اور صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''کہو، میں سن رہا ہوں۔''

''صاف صاف سن لو احسن کہ میں تمہیں سخت ناپسند کرتی ہوں اور ایک لمحے کے لئے بھی تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ کہاں تم عمر بھر کی رفاقت جوڑنے کی بات کر گئے ہو۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی کہ شاید وہ کچھ کہے گا لیکن دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ تب وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''اور سنو، میرے سلسلے میں اپنی امی کو بھیجنے کی غلطی کبھی نہیں کرنا ورنہ منہ کی کھاؤ گے۔''

''رملہ!'' اس کے لہجے میں سختی در آئی۔ ''جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''ہاں اچھی طرح جانتی ہوں اور تم بھی اچھی طرح جان جاؤ کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ سمجھے تم۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ریسیور پٹخ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اپنے تئیں وہ اس کی تذلیل کر کے مطمئن ہو گئی تھی کہ اس میں تھوڑی بہت بھی غیرت ہو گی تو آئندہ اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچے گا۔ لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب تیسرے دن ڈیڈی اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہنے لگے۔

''بیٹا! آج احسن کی امی تمہارے لیے اس کا پروپوزل لے کر آئی تھیں، میرا خیال ہے احسن اچھا لڑکا ہے۔ محنتی اور اعلیٰ کردار کا مالک ہے اور سب سے بڑی بات کہ اپنے گھر کا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکی بلکہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈیڈی اس سے احسن کی خوبیوں کا اعتراف چاہتے ہیں یا اُس کے حق میں اقرار۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگی۔

''ڈیڈی! آپ نے فیصلہ کر لیا ہے یا میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔''

''بالکل گنجائش ہے۔ تمہاری بات سننے کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔'' ڈیڈی شروع ہی سے اس سے بہت دوستانہ ماحول میں بات کیا کرتے تھے۔ پھر بھی اس وقت وہ کچھ اُلجھ گئی سمجھ میں نہیں آیا انہیں جازی کے بارے میں کیسے بتائے۔ اور اسے الجھن میں دیکھ کر وہ نرمی سے بولے۔

''کہو بیٹا! جو بات کہنی ہو بلا جھجک کہہ ڈالو۔''

''وہ ڈیڈی! مجھے احسن پسند نہیں۔'' وہ سر جھکا کر ناخنوں سے کھیلتے ہوئے قدرے جھجک کر بولی۔

''کوئی وجہ؟''

''وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے۔ بس میں نے اُس کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔'' وہ اندر ہی اندر خاصی جز بز ہو رہی تھی۔

''سوچنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اب سوچ لو کیونکہ میرے خیال میں یوں بنا کسی وجہ کے اُسے ریجیکٹ کر دینا حماقت ہے۔''

''لیکن ڈیڈی! وہ مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔''

''پھر؟'' اس کے انداز سے ڈیڈی نے چونک کر سوالیہ نظریں اس پر جما دیں تو وہ قدرے سٹپٹا سی گئی۔ کچھ ڈرتے ڈرتے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ تو وہ بڑے دوستانہ انداز میں مسکرائے۔

''کہو بیٹا! میں سن رہا ہوں۔'' اور وہ پھر سر جھکا کر بولی۔

''آپ جاذب گیلانی سے مل لیں ڈیڈی اس کے بعد کوئی فیصلہ کریجئے گا۔'' وہ کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر اس کا کندھا تھپک کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو وہ اُن کے پاس سے اُٹھ کر زارا کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی اور کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

''آؤ رملہ!''

''زارا! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ احسن کی امی آئی تھیں۔'' اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اُس نے پہلا سوال یہی کیا۔

''اگر میں تم سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتی تو تم یقیناً مجھ سے اُلجھ پڑتیں اس لیے میں نے ڈیڈی سے کہا، وہ خود بات کر لیں۔'' زارا کی صاف گوئی پر وہ خاموش ہو گئی۔ اور اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگی۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ آخر زارا کو خود ہی پوچھنا پڑا۔

''ڈیڈی نے کیا کہا تم سے؟''

''اس بات کو چھوڑو، البتہ یہ سن لو کہ میں نے ڈیڈی کو جازی کے بارے میں بتا دیا ہے۔''

''اچھا!'' زارا نے قصداً اشتیاق ظاہر کیا۔ ''پھر کیا کہا ڈیڈی نے؟''

''ڈیڈی اس سے ملنے کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔'' وہ بظاہر خود کو بہت نارمل پوز کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن اپنے روٹھے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکی۔

''پھر کب بلا رہی ہو اُسے؟'' زارا نے اس سلسلے میں دلچسپی ظاہر کی۔

''میں کل ہی اس سے بات کروں گی۔''

''اچھی بات ہے۔خدا کرے وہ تمہارے ساتھ مخلص ہو اور ڈیڈی کے معیار پر بھی پورا اُترے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' وہ یقین سے کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''او کے وش یو بیسٹ آف لک۔''

''تھینک یو اینڈ گڈ نائٹ!'' وہ کھل کر مسکرائی اور اس کے کمرے سے نکل آئی۔

پھر اگلے روز ہی وہ جازی کے پاس پہنچ گئی۔وہ اُسے اچانک سامنے دیکھ کر کھل اُٹھا۔لیکن جب اُس نے اپ
آمد کا مقصد بتایا تو وہ کچھ خاموش سا ہو کر اُسے دیکھے گیا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' اُس کے ٹوکنے پر وہ چونک کر بولا۔

''کچھ نہیں۔''

''پھر یوں خاموش کیوں ہو گئے؟''

''نہیں تو۔'' پھر اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔''رملہ! شاید تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔اور تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا میری اولین تمنا ہے۔تمہیں یہ کہنے ضرورت نہیں تھی کہ میں تمہارے ڈیڈی سے مل لوں میں خود اُن سے ملنا چاہتا ہوں لیکن آج کل میں اپنے بزنس کی وجہ سے کچھ پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں اور میں چاہتا ہوں اس طرف سے مطمئن ہو جاؤں تو پھر اطمینان سے تمہارے ڈیڈی کے پاس آؤں۔''

''اب اطمینان کا وقت نہیں ہے جازی۔اگر تم نے دیر کر دی تو ڈیڈی احسن کے حق میں فیصلہ دے د
گے۔'' وہ اس کی پوری بات سن کر بولی۔

''ہاں اگر تمہارے کزن کا معاملہ درمیان میں نہ ہوتا تو میں تم سے یہی کہتا کہ کچھ دن انتظار کرو۔لیکن اب مجھے جلدی آنا پڑے گا۔''

''تھینک یو جازی!تم نے میرا مان رکھ لیا۔'' وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

''بے وقوف!تم میری زندگی ہو،تمہارے بغیر جینے کا تصور ہی میرے لیے سوہان روح ہے۔بس تم میری طرف سے کسی قسم کے اندیشے کو دل میں جگہ نہیں دینا۔''

''مجھے تمہارا یقین ہے جازی،پھر میں ڈیڈی سے کیا کہوں۔تم کب آؤ گے؟''

''ہوں۔'' وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔''کل شام میں آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی۔'' وہ خاصی پُرجوش ہو گئی۔تو وہ اُسے دیکھ کر مسکرایا پھر پوچھنے لگا۔

''ویسے تمہارا وہ کزن کیا کرتا ہے؟''

''کون احسن!وہ ابھی حال ہی میں ایس پی تعینات ہوا ہے۔''

''او۔'' اس کے ہونٹ سیٹی بجنے کے انداز میں سکڑ گئے اور کتنی دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھا رہا تو وہ اس کا کند
کر بولی۔

''تمہیں کیا ہوا؟''

''میں سوچ رہا ہوں،پھر تو اس کا چانس زیادہ ہے۔''

''کیوں؟''

''خیر چھوڑو،یہ بتاؤ۔تمہارے ڈیڈی مزاجاً کیسے ہیں۔'' وہ بات بدل گیا۔

''بہت اچھے،تمہیں اُن سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی۔''

''ظاہر ہے جن کی بیٹی سے مل کر زندگی سے محبت بڑھ جاتی ہے تو اُن سے مل کر تو۔'' وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر شرارت سے اُسے دیکھنے لگا تو وہ ذرا سا جھینپ کر ہنس پڑی۔

پھر جازی کے پاس سے آکر وہ بہت مطمئن تھی۔اول تو اُس کی طرف سے اس کے دل میں کسی قسم کا کوئی اندیشہ تھا ہی نہیں اور جو تھوڑی بہت اُلجھن زارا کی باتوں نے پیدا کر دی تھی،وہ اس سے ملنے اور اس سے بات کرنے کے بعد خود بخود دور ہو گئی تھی۔پھر اُسے یقین تھا ڈیڈی جازی کو پسند کریں گے۔اس کی شخصیت تھی ہی مرعوب کر دینے والی اور وہ اپنی خوبصورت باتوں سے لمحوں میں مقابل کے دل میں گھر کر جاتا تھا۔

پھر اگلے روز سرِ شام ہی وہ آ گیا۔اُس وقت تک ڈیڈی آفس سے نہیں آئے تھے۔وہ اُسے......ڈرائنگ روم میں بٹھا کر زارا کے پاس آ گئی۔

''کچھ جلدی نہیں آ گیا۔'' زارا نے شرارت سے اُسے دیکھا۔

''جلدی کہاں،پانچ تو بج رہے ہیں۔''

''اچھا۔تم اُسے بٹھاؤ،ڈیڈی بھی آتے ہی ہوں گے۔''

''میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔اور میرا خیال ہے،ڈیڈی کے آنے تک تم اُس کے پاس جا بیٹھو۔''

''میں۔'' زارا اپنی طرف اشارا کیے جانے پر سوچنے لگی تو وہ چڑ کر بولی۔

''کیوں ویسے تو میری آپا جان بننے کی کوشش کرتی ہو،اب کیا یہ تمہارا فرض نہیں ہے۔''

''خفا کیوں ہوتی ہو،جا رہی ہوں۔'' زارا اس کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر فوراً کھڑی ہو گئی۔اور ابھی اپنا دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی کہ ڈیڈی کی گاڑی کی آواز سن کر دونوں اُدھر متوجہ ہو گئیں۔

''چلو،اب ڈیڈی آ گئے ہیں،میں کچن میں جا رہی ہوں۔'' زارا یوں بولی جیسے اس کی جان چھوٹ گئی ہو۔اور وہ اپنے غصے کو دباتی ہوئی باہر نکل آئی۔اور ڈیڈی کو جازی کے آنے کا بتا کر زارا سے پہلے ہی کچن میں آ گئی۔پھر جب وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں گئی۔ڈیڈی،جازی سے اس کے بزنس سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔اُسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔اور اُس کے چائے بنانے تک مکمل خاموشی رہی جس سے وہ سمجھ گئی کہ ڈیڈی اس کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتے۔اس لیے جلدی سے دونوں کو چائے دے کر کمرے سے نکل آئی۔

لیکن اُس کا دھیان مسلسل اُسی طرف رہا۔کوئی گھنٹے بھر بعد ڈیڈی اُسے رخصت کر کے ان دونوں بہنوں کے

پاس ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھے۔ اُس کا خیال تھا ڈیڈی، جازی کے بارے میں کچھ کہیں گے۔ لیکن اُنہوں نے بات نہیں کی۔ تب وہ ان کے تاثرات جاننے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اُنہیں اپنے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود کوئی اندازا نہیں لگا سکی۔ اور اتنی بولڈ ہونے کے باوجود یہ جرأت بہر حال اُس کے اندر نہیں تھی کہ براہِ راست اُن سے پوچھ سکتی۔ پھر جب کھانے وغیرہ کے بعد ڈیڈی سونے لئے اپنے کمرے میں جانے لگے تب زارا کے منع کرنے کے باوجود اُس نے اُسی وقت جازی کو فون کر ڈالا۔ اُس کی آواز سنتے ہی وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

"کیا رہا رملہ! تمہارے ڈیڈی نے کیا فیصلہ کیا؟"

"میں نے بھی یہی پوچھنے کے لئے تمہیں فون کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے نہیں پتا، یہ بتاؤ ڈیڈی نے تم سے کیا باتیں کیں؟" وہ خواہ مخواہ پریشان ہونے لگی اور دوسری طرف بھی جاننے کے لئے بے تاب تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں کی، میرے بزنس کے متعلق پوچھا پھر یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، تم انہوں نے فیصلہ کیا کیا؟"

"پتا نہیں جازی! تمہارے جانے کے بعد اُنہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔"

"تم نے پوچھا نہیں؟"

"میں کیا پوچھتی۔"

"یہی کہ میں اُنہیں کیسا لگا۔" اُس کے اتنے اطمینان سے کہنے پر اُسے ہنسی آ گئی۔

"کم آن جازی کیسی باتیں کرتے ہو۔ یعنی اب میں خود جا کر ڈیڈی سے پوچھوں!"

"اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ کل آؤ گی ناں؟"

"کل!" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ "نہیں کل نہیں آسکوں گی۔ اصل میں زارا کے سسرال وا آ رہے ہیں، اس لیے کچھ مصروفیت رہے گی۔"

"اچھا تو جب بھی آنا اچھی خبر لے کر آنا۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہ ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ڈیڈی نے اس سلسلے میں بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ جبکہ وہ جا کو بے چین تھی۔ جس قدر اُس کی خاموشی طویل ہو رہی تھی۔ اتنا ہی اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ اِدھر جاز کی بے تابی عروج پر تھی۔ روزانہ فون کر کے پوچھتا اور اس کے لاعلمی کے اظہار پر جھنجلا جاتا۔ وہ بھی کیا کرتی اب تو ڈیڈی کی خاموشی کوفت میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ اور اس وقت وہ زارا سے اُلجھ پڑی۔

"بتاؤ زارا! ڈیڈی نے جازی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ آخر وہ اس طرح خاموش کیوں ہوئے ہیں

کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"زندگی کے فیصلے جلد بازی میں نہیں کیے جاتے رملہ! نقصان وہ ثابت ہوتے ہیں۔" زارا نے رسان سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ تو وہ پوچھنے لگی۔

"ڈیڈی نے تم سے کوئی بات کی ہے؟"

"ہاں۔" زارا کی لاپروائی پر اس کی جان جل گئی پھر بھی بظاہر بڑے ضبط سے پوچھنے لگی۔

"کیا کہہ رہے تھے۔"

"یہی کہ وہ جازی کے بارے میں انکوائری کر رہے ہیں۔"

"واٹ۔" وہ چیخ پڑی۔ "کیسی انکوائری؟"

"شاید، وہ اس کے بزنس سے مطمئن نہیں ہیں۔ اور پلیز رملہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی اگر تم تفصیل جاننا چاہتی ہو تو ڈیڈی سے بات کرو۔" زارا نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئی۔ اچانک کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

"ایک بات بتاؤ زارا! جازی کی انکوائری کون کر رہا ہے؟"

"احسن!" پتا نہیں یہ نام غیر ارادی طور پر زارا کے منہ سے نکل گیا تھا یا اُس نے کچھ جتانے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر جس طرح اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اُس سے وہ کچھ ٹھٹھک سی گئی۔ ایک دم ہی جانے کہاں سے ڈھیر سارے اندیشوں نے دل کا راستہ دیکھ لیا تھا کہ دروازے بند کرتے کرتے بھی وہ اس میں مکیں ہو گئے۔ وہ احسن سے کوئی اچھی بات کی امید نہیں رکھ سکتی تھی۔ جس طرح ہر قدم پر اس کی تذلیل کرتی آئی تھی۔ اُس سے یہ خیال دل میں جڑ پکڑ گیا کہ وہ ڈیڈی کو جازی سے متنفر کرنے کے لئے اوچھے ہتھکنڈوں سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ اب اس مقام پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ احسن کو کیسے اُس کے ارادوں سے باز رکھے ابھی وہ خود اس سے نہیں اُلجھنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس طرح وہ مزید ضد پر اُتر آئے گا۔ البتہ زارا سے اُس نے کہہ دیا کہ اگر احسن نے جازی کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا تو اُس سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اور زارا اُس سے اُلجھ پڑی۔

"اسے کیا ضرورت ہے غلط بیانی سے کام لینے کی۔"

"ظاہر ہے، وہ اپنی راہ ہموار کرنا چاہے گا۔" وہ زارا سے یوں شاکی تھی جیسے وہ احسن کے ساتھ مل کر اس کے خلاف محاذ بنا رہی ہو اور زارا بے حد تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"تم احسن کو غلط سمجھی ہو رملہ!"

"میں اُسے سمجھنا بھی نہیں چاہتی نہ غلط نہ صحیح، بس تم اُسے کہہ دینا کہ اپنی اوقات میں رہے۔" وہ سارے لحاظ بھلا بیٹھی تھی۔

"یہ بات تم خود اُس سے کہہ دو۔" زارا نے ناگواری کا اظہار کیا تو وہ پیر پٹختے ہوئے چلی گئی۔ پھر وہ جازی کو

اس تمام صورتحال سے آگاہ کرنا چاہتی تھی اور ابھی اُس کے پاس جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اُس کا فون آ گیا۔ اس کی آواز سنتے ہی کہنے لگا۔

''میں نے کہا تھا ناں رملہ کہ تمہارے ایس پی کا چانس زیادہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

''تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے معذرت کر لی ہے۔'' اُس نے بتایا تو وہ ایک دم سناٹے میں گھر کر بولی۔

''کیا؟ کب؟''

''آج صبح اُنہوں نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔'' اُس کے آزردہ لہجے پر وہ بکھر گئی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے بمشکل خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''کوئی وجہ بھی بتائی تھی اُنہوں نے؟''

''نہیں۔'' اس نہیں میں جانے کیا کچھ تھا کہ وہ شدت سے رو پڑی۔

''جازی اب کیا کروں، تمہارے بغیر تو میں۔'' اُس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اور وہ خود آزردہ تھا۔

''رملہ! پلیز روؤ نہیں۔ شاید ہمارے مقدر میں یہی لکھا تھا۔''

''نہیں، میں مقدر کو الزام نہیں دے سکتی۔ یہ سب احسن کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی کہ۔''

''میری بات سنو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر درمیان میں بول پڑا۔ تو وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سننے لگی۔

''دیکھو رملہ! ماں باپ ہمیشہ اولاد کے لیے بہتر سوچتے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی کو یقیناً اسی میں تمہاری بہتری نظر آئی ہوگی، جو اُنہوں نے مجھے رد کر دیا۔ میں اب تم سے یہی کہوں گا کہ اُن کی بات مان لو۔''

''نہیں جازی! تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، میں تمہیں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تم میری خاطر انہیں ناراض کر دیا چھوڑ دو۔''

''مجھے اُن سے بات تو کر لینے دو جازی! تم اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہو۔''

''نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ میں تمہارے بغیر بہت تنہا ہو جاؤں گا اس لیے کہ جو خواب میں نے تمہارے حوالے سے دیکھے ہیں۔ اُن کی تعبیر کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اور پھر ضروری تو نہیں رملہ کہ ہر خواب کو تعبیر ملے۔''

''جازی!'' وہ شدتِ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔

''پلیز روؤ نہیں، میری خاطر اپنے آنسوؤں کو روک لو۔'' وہ اتنی عاجزی سے بولا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں رگڑنے لگی، پھر دکھ سے پوچھا۔

''مجھے آنے کے لیے نہیں کہو گے!''

''اس وقت نہیں، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اپنے ہمسفر کی ہمراہی میں مجھے بھول نہیں جانا۔ کبھی کبھی اگر آ سکو تو آ جانا۔ میں اپنے کھلے دروازوں پر ہمیشہ تمہیں...... منتظر ملوں گا۔''

''میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔'' وہ ریسیور رکھ کر ہاتھوں میں چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

□

دن بڑے طویل اور اُداس ہو گئے تھے۔ زارا کی زبانی اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ ڈیڈی نے احسن کا پرپوزل منظور کر لیا ہے۔ اور وہ جلد ہی اُس کی اور زارا کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اُسے ڈیڈی کا یکطرفہ فیصلہ منظور نہیں تھا، بارہا دل چاہا، جا کر ان سے پوچھے کہ جب اُنہوں نے پہلے ہی احسن کے ساتھ اُس کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو جازی سے ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ اوّل روز ہی اپنا فیصلہ سنا دیتے، جازی سے ملنے کے بعد انکار کر کے اس کی توہین تو نہ کرتے۔ اُس کے نزدیک یہ جازی کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اُس نے خفا ہونے کے بجائے اُسے ڈیڈی کی بات مان لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ اس کے خیال میں وہ اُسے بہکا بھی سکتا تھا۔

بہرحال اُس نے جازی کی بات مان تو لی تھی۔ لیکن اب اُسے لگتا تھا جیسے اُس کے بنا جی نہیں پائے گی۔ اُس نے اپنی محبتوں کا جو حصار اُس کے گرد کھینچ دیا تھا اُس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ان طویل اور اُداس دنوں میں وہ پہروں بیٹھی اُسے سوچا کرتی، اس وقت بھی تپتی ہوئی دوپہر میں ہر بات سے بے خبر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بہت آزردہ بیٹھی تھی۔ جانے کس خیال سے پلکوں پر نمی اُتر آئی تھی جسے انگلیوں پر سمیٹ کر اس نے یونہی سامنے دیکھا۔ احسن کی جیپ گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس تپتی دوپہر میں اس کا آنا اُسے بہت عجیب سا لگا۔ دل چاہا ہمیشہ کی طرح اُسے نظرانداز کرتی ہوئی اُٹھ کر اندر چلی جائے اور ابھی اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا قریب آ گیا۔ بلاشبہ وہ بہت وجیہ شخصیت کا مالک تھا۔ اور اس وقت فل یونیفارم نے اس کی وجاہت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو یقیناً اُس کے سحر میں گرفتار ہو جاتی۔ اور وہ جب وہاں سے اُٹھنے میں ناکام ہو گئی تو اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لی۔

''ہیلو رملہ! کیسی ہو؟'' وہ سیڑھیوں کے قریب رُک کر پوچھنے لگا۔ اور کتنے زعم سے وہ کہا کرتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ٹھیک ٹھاک، اب بس ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

''خفا ہو۔'' اُس نے اپنے سر سے کیپ اُتار کر اس کے سر پر رکھ دی تو اُسے جیسے کرنٹ سا لگا ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''احسن! میں بے تکلفی اور بدتمیزی پسند نہیں کرتی۔''

''میرا خیال ہے، میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔'' اس کی دلکش مسکراہٹ سے وہ مزید سلگ گئی اور کیپ اتار کر اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ ہنس پڑا۔

''تمہاری نادانی مجھے کچھ کہنے سے روکتی ہے رملہ ورنہ۔!''

''احسن کمال۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر تڑخ کر بولی۔ ''اگر میں نادان بھی ہوں تو بھی تمہاری...... چالبازیوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

''ستم تو یہ ہے جانِ احسن کہ تم کچھ نہیں سمجھتیں۔'' اس کے اندازِ تخاطب پر وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگئی۔ چہرا سرخ ہوگیا اور بری طرح چیخ پڑی۔

''میں اس قسم کی گفتگو قطعی پسند نہیں کرتی۔'' جانے یہ اس کے چیخنے کا اثر تھا یا کیا تھا کہ اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

''ایک بات یاد رکھنا احسن کہ تم میرے دل میں کبھی جگہ نہیں بنا سکتے۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔''

''رملہ!'' اس نے ضبط کی انتہا کر دی۔ ''ابھی تم اس مقام تک نہیں پہنچیں کہ محبت اور نفرت میں پہچان کر سکو۔ تم ابھی تک ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والی معصوم سی لڑکی ہو۔ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ کاش میں تمہیں پہچان کی منزل تک لے جاتا لیکن میں چاہتا ہوں، یہ مسافتیں تم خود طے کرو۔''

''میں ساری مسافتیں طے کر کے پہچان کی منزل تک آ چکی ہوں احسن جہاں سے مجھے تمہارا گھناؤنا چہرا صاف نظر آ رہا ہے۔ تم سمجھتے ہو، ڈیڈی کی طرح مجھے بھی فریب دے جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

''فریب کے معنی جانتی ہو۔'' وہ ایکدم دو سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''اگر نہیں بھی جانتی تھی تو اب جان گئی ہوں۔'' وہ طنزیہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر بولی۔ تو وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا زارا کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

پھر دن اتنی تیزی سے گزرے کہ پتا بھی نہیں چلا۔ اس دوران اُس نے جازی سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ اور ابھی وہ ٹھیک طرح سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ رملہ احسن بن گئی۔ احسن کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید وہ سمجھوتا کر لیتی اور یقیناً جازی کی محبت کو دل کے کسی گوشے میں مقفل کر کے نئی زندگی کی ابتدا کرتی۔ اس کے برعکس اس کے دل میں احسن کے خلاف نفرت کے ساتھ ساتھ انتقامی جذبے زور پکڑ گئے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کی محبت کا قاتل ہے۔ اُس نے محض اپنی راہ ہموار کرنے کے لیے ڈیڈی کو جازی کے خلاف بہکایا ہے۔ اور اس کے لیے وہ اُسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ جب حجلہ عروسی میں تنہا رہ گئی تو اس کے اندر لاوا دہک رہا تھا۔ ساری شرم بالائے طاق رکھ کر پھولوں سے سجی سیج سے نیچے اُتر آئی۔ سامنے آئینے میں اپنا دلکش روپ دیکھ کر اُس کی عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ خواب یوں ٹوٹے کہ آنکھوں میں چبھن اُتر آئی۔ غالباً اس روپ کا تصور اس نے جازی کے حوالے سے کیا تھا۔ اور اب اُس نے سوچا۔ جازی نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ کچھ ہذیانی سے انداز میں ستاروں بھرا آنچل اُتار کر بیڈ پر پھینک دیا اور جیسے ہی ماتھے پر سجا ٹیکہ اُتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اُسی وقت دروازہ کھلا اور احسن اندر آ گیا۔ وہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بالوں میں اٹکی پن تلاش کرنے لگی جس کی مدد سے ٹیکہ سجایا گیا تھا۔

''ارے رے، یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ فوراً آگے بڑھ آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''پہلے مجھے اپنی آنکھوں

میں اپنا یہ سندر روپ امر کر لینے دو۔ اس کے بعد۔''

''مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی لیکن وہ کلائی تھام کر گرفت مضبوط کر گیا۔

''تمہیں چھونے کا شرعی اور قانونی حق لے کر آیا ہوں کیا اس سے انکار کرو گی۔''

''حق کی بات کرو گے احسن تو مجھے بھی اپنے حق کے لیے لڑنا آتا ہے، تم مجھے کمزور لڑکی نہیں سمجھنا۔''

''دیکھو رملہ! افسانوی ہیروئن بننے کی کوشش نہیں کرو حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تم میری بیوی ہو۔ کل تک میں تمہارا توہین آمیز رویہ محض اس لیے برداشت کرتا رہا کہ تم صرف میری کزن تھیں اور اب کان کھول کر سن لو میں قطعی برداشت نہیں کروں گا کہ میری بیوی مجھ سے اونچی آواز میں بات کرے سمجھیں تم۔'' اس کے مضبوط لہجے پر ایک پل کو اس کا دل دہل سا گیا۔

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''اپنا اندازِ تخاطب ابھی درست کر لو بیوی میں تمہارا شوہر ہوں اور ایک اچھی بیوی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو تم کہہ کر مخاطب کرے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' بات کے اختتام پر وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا۔

''احسن تم' میرا مطلب ہے آپ جانتے ہیں، میں آپ کو بالکل پسند نہیں کرتی اور اس کا اظہار میں بارہا کر چکی ہوں۔'' اپنی بے بسی پر وہ روہانسی ہوگئی پھر بھی بڑے ضبط سے بولی۔ اور اس سے کہیں ضبط کا مظاہرہ اس نے کیا۔

''جانِ احسن، اپنا جملہ درست کرو۔ ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو کہ تم مجھے پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے کہ گزرا ہوا ایک پل بھی ماضی کا حصہ بن جاتا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کل تک تم مجھے پسند کرتی تھیں یا نہیں لیکن آج سے بلکہ ابھی سے میں یہ چاہوں گا کہ خانۂ دل میں میری تصویر اس طرح سجا لو کہ باقی سب نقش دھندلا جائیں۔''

''احسن!'' وہ سناٹے میں آ کر اُسے دیکھے گئی اور وہ پروا نہ کرتے ہوئے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''آؤ، نئی زندگی کی ابتدا اچھی باتوں سے کریں۔ اپنے دلوں کو محبتوں کی روشنی بخش کر ایک دوسرے کے نام کر دیں۔'' وہ بظاہر بڑے سکون سے بول رہا تھا۔ لیکن اس کے کندھوں میں پیوست ہوتی اس کی انگلیاں اس کے اندرونی خلفشار کی غمازی کر رہی تھیں، جس سے اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اگر ذرا بھی اس کی بات سے اختلاف کیا تو وہ نجانے کیا کر بیٹھے گا۔ اور اس کی آنکھوں سے نجانے کیسی کرنیں پھوٹ رہی تھیں کہ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی۔ احتجاجاً ایک لفظ نہیں کہہ سکی۔ اتنی بے بس تو وہ کبھی نہیں ہوئی تھی اور غالباً کبھی اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا کہ جس شخص کو کبھی اس نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اُسی کے سامنے بے بسی کی تصویر بن جائے گی۔

صبح دستک کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تو اس نے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔ احسن کمرے میں موجود نہیں تھا۔ البتہ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ دوبارہ دستک سے وہ سمجھ گئی کہ چچی جان ہوں گی، پھر بھی دروازہ کھولنے کے بجائے سر تک چادر اوڑھ کر سوتی بن گئی۔ کچھ دیر بعد احسن باتھ روم سے نکلا تو پہلے اس کی چادر کو ہلایا اس کے بعد دروازہ کھول دیا۔ امی جان واپس پلٹ رہی تھیں رک کر پوچھنے لگیں۔

''بیٹا! تم دونوں کے لیے ناشتا یہیں لے آؤں؟''

''نہیں امی! ہم وہیں آ رہے ہیں۔'' احسن کی سعادت مندی پر وہ اندر ہی اندر جل کر رہ گئی۔

''لیکن بیٹا رملہ!'' امی جانے کیا کہنے جا رہی تھیں کہ وہ درمیان میں بول پڑا۔

''رملہ ابھی اُٹھ جاتی ہے! آپ چلیں ہم آ رہے ہیں۔'' اور امی کے جاتے ہی وہ پلٹ کر اس کی طرف آیا اور ایک جھٹکے سے اس کی چادر کھینچ لی۔ اس نے بھلا کب ایسی حرکتیں برداشت کی تھیں، بے اختیار چیخ پڑی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''رملہ!'' اس کے لہجے میں سرزنش کے ساتھ ساتھ جانے کیا تھا کہ وہ پھر سہمنے لگی۔ ''چلو اٹھو مجھے اتنی دیر تک سونا بالکل پسند نہیں۔ میں امی کے پاس جا رہا ہوں وہیں آ جانا۔ سمجھ رہی ہو ناں۔''

''ہوں۔'' اُس نے اپنے اندر اٹھتے جوار بھاٹے کو بمشکل دبایا۔ اور اس کے جانے کے بعد باتھ روم کا رخ کیا۔ پھر اُس نے قصداً پہلے شاور لینے میں بہت وقت لیا پھر کتنی دیر بالوں میں برش کرتی رہی، اس کے باوجود بھی جب ڈائننگ روم میں آئی تو دونوں ماں بیٹا انتظار میں بیٹھے تھے یعنی ابھی ناشتا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئی۔

''بیٹا! اتنے سادہ سے کپڑے پہن لیے۔ ابھی سب مہمان آ جائیں گے تو کیا سوچیں گے۔'' امی نے بہت نرمی سے ٹوکا۔

''اتنی گرمی میں مجھ سے نہیں پہنے جاتے بھاری بھرکم کپڑے۔'' وہ بے زاری سے کہتی ہوئی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''لیکن بیٹا! ابھی تو دن ہوتے ہیں پہننے اوڑھنے کے۔ ناشتے کے بعد تیار ہو جانا۔'' وہ جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ احسن کی نظروں کی خاموش تنبیہ نے اسے ہونٹ بھینچ لینے پر مجبور کر دیا۔

پھر ولیمے کے بعد احسن ہنی مون کے لیے سوات، کاغان وغیرہ لے گیا، یہ ساری جگہیں اس کی دیکھی ہوئی تھیں۔ اگر من پسند ساتھی ساتھ ہوتا تو ہزار بار کی دیکھی ہوئی جگہیں بھی نئی لگتیں۔ لیکن احسن کی سنگت میں وہ خود کو بہت بے زار پوز کرتی رہی۔ اگر وہ ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کر پا رہی تھی تو سمجھوتا بھی نہیں کر رہی تھی۔ یہ یقیناً اس کی ہٹ دھرمی تھی۔ گو کہ خاموش رہتی لیکن اپنے ہر عمل سے ناگواری کا اظہار کرتی پھر اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ...... احسن اس کی گزشتہ زندگی سے واقف ہے کہ وہ جاذب گیلانی کو پسند کرتی تھی، اس لیے بھی اس نے سمجھوتا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ دھڑلے سے اپنے آپ میں مگن رہتی۔ ایک تو اس پر جتانا مقصود تھا دوسرے حقیقت یہ تھی...... کہ وہ ابھی تک جاذی کے سحر سے نہیں نکلی تھی۔ اور نکلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے برعکس کسی کسی وقت وہ بہت باغی ہو کر سوچتی کہ اس زندگی کو ٹھوکر مار کر چلی جائے۔ اور کسی وقت اس قدر مایوسیوں میں گھر جاتی کہ احسن کے ساتھ کہیں بھی اونچائی پر چلتے ہوئے وہ قصداً اپنے قدموں کو غیر متوازن کر دیتی۔ اُسے یہ خوف نہیں تھا کہ گہری کھائی میں گر کر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بس یہ اطمینان کہ احسن کی دسترس سے دور ہو جائے گی، لیکن

جانے کیسے جب بھی اس کا قدم کھائیوں کی طرف اٹھتا وہ اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا۔ تب وہ یوں بن جاتی جیسے بے خیالی میں اس کا قدم راہ سے ہٹ گیا ہو۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ احسن میں اوّل شب کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ نہ لہجے میں سرزنش نہ آنکھوں میں خاموش تنبیہ۔ اس کے بے زار لہجے پر خاموش ہو جاتا اور اگر وہ ہاتھ جھٹکتی تو چپ چاپ دور ہو جاتا۔ بارہا اس نے اُسے اشتعال دلانے والی حرکتیں کیں لیکن وہ یوں نظرانداز کر جاتا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اس کے برعکس وہ یوں اس کا خیال رکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی کانچ کی گڑیا ہو اس کے انداز میں وارفتگیاں تھیں اور آنکھوں میں محبتوں کا جہاں آباد کیے وہ اُسے تسخیر کر لینے کی ساری صلاحتیں آزما رہا تھا۔ غالباً وہ اُسے قصوروار نہیں سمجھتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کی ممی کی ڈیتھ ہو گئی تھی اور ڈیڈی کے بے جا لاڈ پیار نے اُسے اتنا خودسر اور ہٹ دھرم بنا دیا تھا۔ بہرحال ابھی وہ اس پر جتنا چھانے کی کوشش کرتا' وہ اتنا ہی اس سے دور ہٹتی جا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد واپس جانا چاہتی تھی جبکہ وہ تھا کہ وقت ٹھہر جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

وہ سوات میں اُن کا آخری دن تھا۔ اور موسم کو شاید اُن کے جانے کی خبر ہو گئی تھی جو روزانہ سے زیادہ دلکش ہو کر انہیں روکنے کے سامان کر رہا تھا۔ اس نے شیشوں سے پردہ ہٹا کر دیکھا گھنیرے بادل سرسبز وادیوں پر جھکے آ رہے تھے۔ اندھیرے، اجالے کا حسین سنگم ماحول کو انوکھا حسن بخش رہا تھا۔ اس کا دل چاہا خوشبو کی مانند ہواؤں میں بکھر جائے یا پرندوں کے جھرمٹ میں شامل ہو کر بادلوں کا سینہ چیرتی ہوئی کہیں دور نکل جائے۔ آج جبکہ رختِ سفر باندھ لیا تھا تو جانے کیوں موسم کی دلکشی و دلفریبی اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ دل مچل مچل کر سرسبز وادیوں میں بھٹکنے کو اصرار کرنے لگا۔ اور باہر کے مناظر میں وہ اس قدر محو تھی کہ پتا ہی نہیں چلا۔ جانے کب احسن اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اور بہت آہستگی سے اس کا شانہ چھو کر بولا۔

''آؤ باہر چلیں۔'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''آؤ۔ بڑا اصرار تھا اس کے لہجے میں اور چہرے پر اُمید جیسے وہ اس کی بات مان کر اُسے انوکھی خوشی بخش دے گی اور اس کا اپنا دل بھی کتنا مچل رہا تھا باہر جانے کو، لیکن محض اس کی بات رد کرنے کی خاطر بے زاری سے بولی۔

''نہیں میرا موڈ نہیں ہے۔''

''رملہ! کبھی تو میری بات مان لیا کرو۔'' چھپاتے چھپاتے بھی اُس کے لہجے میں حسرت سمٹ آئی تھی اور اس نے جواب دینے کے بجائے چاہا کہ وہاں سے ہٹ جائے لیکن اس نے راستہ روک لیا۔

''سنو، میرے لیے نہیں تو ان شاداب موسموں کے لئے دل کے دروازے کھول دو۔ یہ تمہارے اندر سما کر تمہارے سوئے ہوئے جذبوں کو جگانے میں بڑی مدد دیں گے۔ آؤ'' اس کی مقناطیسی آنکھوں نے جانے کیسے اُسے اپنے شکنجے میں لے لیا کہ وہ کسی معمول کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر چل پڑی۔

''رملہ۔'' اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں، تم مجھے پسند نہیں کرتیں بلکہ یہ کہنا

زیادہ صحیح ہوگا کہ تم نے مجھے کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ اس کے برعکس مجھے کہنے دو کہ میں نے بہت پہلے سے اپنے دل کی دنیا کو تمہارے نام سے آباد کرلیا تھا۔ میرا خیال تھا یہ زیادہ دن تک میری محبتوں سے منہ نہیں موڑ سکو گی۔ لیکن اس وقت مجھے شدید جھٹکا لگا جب تمہاری آنکھوں میں میں نے کسی اور کی پرچھائیں دیکھی وقتی طور پر مجھے بہت دکھ ہوا کہ جن آنکھوں میں میں اپنی شبیہ سجانا چاہتا تھا وہ کسی اور کے سپنے دیکھتی ہیں۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ اپنے دل سے تمہارے نقوش تو نہیں مٹا سکا پھر بھی اسے یہ ضرور سمجھا لیا کہ تم میرا نصیب نہیں ہو۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''یقین کرو رملہ میں تمہارے ساتھ مخلص تھا۔ میں نے کبھی تمہاری راہ میں آنے کا سوچا بھی نہیں۔ لیکن وہ شخص جس کی محبت پر تم آنکھیں بند کرکے ایمان لے آئی تھیں اس کے بارے میں کچھ کہنا تو نہیں چاہتا پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ تمہارے قابل نہیں تھا۔''

''احسن پلیز، وہ کس قابل تھا میں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں، آپ اس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کریں۔'' اس کے ٹوکنے پر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوگیا پھر قدرے توقف سے کہنے لگا۔

''تم کچھ نہیں جانتیں رملہ اور میں اس کے بارے میں جانتے ہوئے تمہیں اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر محض تماشائی نہیں بن سکتا تھا۔''

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی بات کا یقین کرلوں گی تو آئی ایم سوری۔ میری زندگی میرے وجود پر آپ کو اختیار ہے لیکن آپ میری سوچوں پر پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ اگر آپ میں سچ سننے کا حوصلہ ہے تو سن لیجئے کہ میں اب بھی اُسے ہی سوچتی ہوں۔'' وہ حد درجہ سفاکی کا مظاہرہ کرگئی اور ذرا سی گردن موڑ کر اُسے دیکھا، اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا پھر بھی وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بڑے تحمل سے بولا۔

''جہاں تک میرا یقین نہ کرنے کی بات ہے تو میں خود تمہیں کسی بات کا یقین دلانا نہیں چاہتا۔ وقت خود تمہیں یقین دلا دے گا۔ رہی میری بات تو میں اس وقت کا انتظار کروں گا جب تمہارے قدم پہچان کی منزل سے آشنا ہوکر تمہیں میرا یقین کرنے پر مجبور کردیں گے۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بس آپ ہی آپ طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئی۔ وہ کچھ دیر رک کر اُسے دیکھتا رہا پھر واپس مڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ صحیح ہے رملہ کہ میں تمہاری سوچوں پر پہرے نہیں بٹھا سکتا لیکن تم ایک بات یاد رکھنا کہ میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ معاشرے میں میرا ایک مقام ہے اور تم جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا جس سے میری عزت پر ذرہ برابر بھی آنچ آئے۔ میں تمہیں اُسے سوچنے کی اجازت دیتا ہوں لیکن اس سے ملنے کی کوشش کبھی نہیں کرنا۔'' کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

''اور سنو، آج ہم آخری بار اس کے بارے میں بات کررہے ہیں۔ اس کے بعد وہ کبھی ہمارا موضوع نہیں بننا چاہئے۔'' اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی اور وہ بالکل خاموش ہوگیا عجیب لڑکی تھی کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لینے لگی، سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتا ہوا وہ کچھ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ اور اُس کی غیر متوازن چال

اس کے اندرونی خلفشار کی نشاندہی کررہی تھی۔ اور اُسے یوں ٹوٹا دیکھ کر وہ اپنے اندر اطمینان اترتا محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگی۔

''احسن کمال! نارسائی میرا ہی مقدر کیوں ٹھہرے تم بھی اس کا مزا چکھو۔''



سوات سے واپس آکر شب و روز بالکل عام سے ہوکر رہ گئے۔ اور وہاں جو احسن بالکل نئے روپ میں اس کے سامنے آیا تھا واپس آتے ہی پھر اوّل شب والا احسن بن گیا۔ کسی بات میں اس کا انکار تو سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور اُسے یہ بات بہت کھلتی تھی کہ اس نے اُسے معاشرے میں اپنا مقام تو بتا دیا تھا لیکن اپنی حیثیت نہیں بدلی تھی، ایس پی ہونے کے باوجود اپنے آبائی گھر میں رہائش رکھے ہوئے تھا۔ جو فقط تین کمروں اور چھوٹے سے آنگن پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ امی کے تصرف میں دوسرا ڈرائنگ ڈائننگ اور تیسرے میں وہ دونوں' کچن اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں جانے کا سوچ کر ہی اُسے وحشت ہونے لگتی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ کوئی ملازم یا خانساماں بھی نہیں تھا۔ شروع کے چند دن کچن پر امی جان کی حکمرانی رہی لیکن پھر احسن نے انہیں آرام کا مشورہ دے کر کچن اُس کے حوالے کردیا۔ اُسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا حتیٰ کہ چائے بھی ڈھنگ سے نہیں بنا سکتی تھی۔ اور احسن یہ سب جانتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے یہ سارے کام اس کے سر ڈال دیئے جس سے وہ بہت جھنجھلائی۔ لڑ جھگڑ کر بھی احتجاج کیا یہاں تک کہ آخر میں رو پڑی۔ لیکن اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ اس کی ساری باتوں کے جواب میں فقط اتنا کہا۔

''میں تمہیں مکمل طور پر گھر گرہستی کی عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اُسے بے حد غصہ آیا اور اُس پر بس نہیں چلا تو اس کی شکایت لے کر ڈیڈی کے پاس آگئی۔ اس کی ساری شکایات سن کر ڈیڈی بڑے آرام سے بولے۔

''بیٹا! وہ تمہارا شوہر ہے اگر اس نے تم سے اتنی توقعات وابستہ کرلی ہیں تو ان پر پورا اُترنا تمہارا فرض ہے۔''

''ڈیڈی گھر میں کوئی ملازم بھی نہیں ہے یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے گھر کی صفائی بھی میں خود کروں۔'' وہ یوں بولی جیسے ڈیڈی اس کی بات سن کر حیران ہوجائیں گے لیکن اس کے برعکس انہوں نے مسکرا کر اُسے حیران کردیا۔

''اس میں برائی کیا ہے بیٹا! اور پھر کون سا تمہارا گھر اتنا بڑا ہے۔ تین کمروں کی صفائی منٹوں کا کام ہے اور میرا خیال ہے روزانہ صفائی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہوگی۔ کیونکہ گندگی پھیلانے والا تو کوئی ہے نہیں ایسا کرو ہفتے میں کوئی ایک دن صفائی کا مقرر کرلو۔ تمہیں آسانی ہوجائے گی۔'' وہ خاصی جز بز ہوئی اور مزید کچھ کہنا فضول خیال کیا۔ کیونکہ اس کی ہر بات کا جواب مشورے کے ساتھ موجود تھا۔ حقیقتاً وہ دل پر بڑا بوجھ لے کر ڈیڈی کے گھر سے آئی اور یہ بھی سوچ لیا کہ آئندہ کچھ بھی ہوجائے، وہ اپنا دکھڑا لے کر ڈیڈی کے پاس ہرگز نہیں جائے گی۔ ایک تو پہلے ہی وہ جازی کو ریجیکٹ کردینے پر ان کی طرف سے بددل تھی اس پر اب مزید مایوس ہوگئی تھی۔ وہ جو بہت آزاد منش تھی اب بالکل گھر میں مقید ہوکر رہ گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا کہیں جانے آنے کو دل

نہیں چاہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ احسن نے اس پر اتنی ڈھیر ساری ذمہ داریاں ڈال دی تھیں کہ اسے کوئی ایک لمحہ فرصت کا میسر نہیں آتا تھا۔ جو کہیں آنے جانے کا سوچتی۔ اُس کا خیال تھا بلکہ اُسے یقین تھا کہ احسن نے جان بوجھ کر اُسے مصروف کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے تنہائی کے لمحات سے خوفزدہ ہے، جانتا ہے کہ اگر وہ لمحہ بھر بھی اطمینان سے تنہا بیٹھ گئی تو اس کی سوچیں بھٹک جائیں گی۔ اور وہ ان لمحات کو جازی کے تصور سے آباد کرے گی۔ اب یہ نہیں احسن کے دل میں کیا تھا، وہ بہرحال ایسا ہی سمجھتی تھی۔ اور پھر مصروف رہ کر بھی جازی کے خیال سے دامن نہیں چھڑا سکی اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے جازی کے خیال سے کبھی دامن چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر احسن کا رویہ اس کے ساتھ بہتر ہوتا تب تو شاید وہ بھی ایسی کوشش کرتی یا اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے آپ کو ملامت ضرور کرتی، لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ بلکہ جتنا احسن زیادتی کرتا، وہ اس قدر جازی کو زیادہ سوچتی۔ اور ہر بات میں اُن دونوں کا موازنہ کرتی۔ گھر کی صفائی کے دوران بس یہی خیال ہوتا کہ اگر جازی میرا نصیب ہوتا تو میں کبھی شوقیہ بھی یہ کام کرنے لگتی تو وہ کتنا ناراض ہوتا۔ اور مجھے کچن میں کھڑا دیکھ کر تو وہ اپنا سر پیٹ لیتا۔ کہاں احسن اپنے جوتے تک اس سے پالش کرواتا تھا۔

اُس روز تو احسن نے حد ہی کر دی۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ پچھلے دو دن سے اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تیسرے دن تو اس سے بستر سے اُٹھا بھی نہیں گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے پورا وجود دہکتا انگارا بن گیا ہو۔ صبح احسن کے پکارنے پر وہ بس ایک لحظہ کو آنکھیں کھول سکی اس کے بعد پھر غنودگی میں چلی گئی۔ اور اس کے یوں دوبارہ پلکیں موند لینے پر وہ جانے کیا سمجھا کہ اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔

"جلدی ناشتا بناؤ۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔" اس سے اُلجھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ مجبوراً خود کو گھسیٹتے ہوئے کچن میں آ گئی۔ بڑی مشکل سے اس کے لیے ناشتا بنایا اور پھر اس کے آفس جانے تک وہیں کچن میں ریک کے سہارے کھڑی رہی۔ جانے سے پہلے وہ ذرا دیر کو اس کے پاس آیا اس کے سراپے پر اچٹتی نظر ڈالی اور پھر بنا ایک لفظ کہے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ اور وہ جو یہ سمجھی تھی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کا احوال ہی پوچھے گا، اس کے یوں چپ چاپ چلے جانے پر کھول کر رہ گئی۔

"ہونہہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو، غلطی میری ہے جو میں نے شروع دن سے اُسے سر چڑھا لیا ہے اگر میں اوّل دن اس سے دبنے کے بجائے منہ توڑ جواب دیتی تو اُسے ہمت نہیں ہوتی مجھ سے یہ سلوک کرنے کی۔ نوکرانی سمجھ لیا ہے مجھے ہونہہ مائی فٹ۔" وہ جو دو دن سے نقاہت اور کمزوری محسوس کر رہی تھی اس وقت جذبات کی شدت میں ساری کمزوری جانے کہاں چلی گئی۔ اور دندناتی ہوئی امی کے پاس آ کر کہنے لگی۔

"چچی جان! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔" امی کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ احسن کہہ گیا تھا کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔"

"احسن کہہ گیا تھا" وہ پہلے حیران ہوئی پھر چڑ کر بولی۔

"آپ کہاں تکلیف کریں گی، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"لیکن بیٹا! یوں اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

"کیوں، کیا میں اکیلی نہیں جا سکتی؟" وہ الٹا ان سے پوچھنے لگی۔

"یہ بات نہیں ہے بیٹا۔"

"بات کچھ بھی ہو، میں جا رہی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ بس یہی خیال تھا کہ آخر ان ماں بیٹے نے اُسے اپنا محتاج کیوں بنا رکھا ہے۔ پہلے بھی تو وہ اکیلی آتی جاتی تھی۔ اب شادی کے بعد وہ راستے تو نہیں بھول گئی۔

ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے بعد اس نے دوا لی اور باہر آ گئی۔ صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا، اس لیے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور چکر بھی آ رہے تھے۔ وہ سواری کی تلاش میں نظریں دوڑاتی ہوئی اس جگہ آ کھڑی ہوئی جہاں لوگوں کی آمد و رفت قدرے کم تھی۔ اور ابھی اُسے کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک گاڑی اس کے بالکل قریب آ رکی۔ اس نے یونہی سرسری طور پر ادھر دیکھا اور پھر نظریں ٹھہر سی گئیں۔ وہ جازی تھا۔ اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر اس کا دل عجب انداز سے دھڑکنے لگا۔ ایک پل میں اندر کا سارا غبار سمٹ کر آنکھوں میں آن ٹھہرا۔ اور وہ ایک ٹک اُسے دیکھتی ہوئی یوں کھو گئی کہ اس کے سنگ گزرا ایک ایک لمحہ نگاہوں میں سما کر سامنے کے سارے منظر دھندلانے لگا۔

"رملہ! یہ تم ہو ناں۔ کیا حالت بنا لی ہے تم نے اپنی!" وہ گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آ کر پوچھنے لگا اور وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھے گئی۔

"یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو اور وہ تمہارے ایس پی کہاں ہیں؟"

"میں یہاں ڈاکٹر کے پاس آئی تھی۔" وہ بمشکل بول پائی۔

"ہاں تم کچھ بیمار لگ رہی ہو۔ اگر اکیلی ہو تو آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ تمہاری گاڑی کہاں ہے؟" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"گاڑی تو نہیں ہے میرے پاس۔" وہ کچھ حیرت سے اُسے دیکھتا رہا پھر بظاہر بڑے عام سے لہجے میں بولا۔

"اچھا میرے ساتھ آؤ۔" اس نے چاہا کہ خود کو اُس کے ساتھ چلنے سے روک لے لیکن جانے کیسے ذہن سے ہر خیال مٹ گیا۔ یہ بھی کہ وہ ایس پی احسن کمال کی بیوی ہے جو معاشرے میں باعزت مقام رکھتا ہے۔ بس یاد رہا تو صرف اتنا کہ وہ اس وقت بے سروسامانی کے عالم میں تنہا کھڑی ہے۔ اور اُسے کسی مہربان سہارے کی سخت ضرورت ہے۔ کمزوری سے یوں بھی...... چکر آ رہے تھے۔ پھر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تو اس نے انتہائی بے بسی کے عالم میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ اُسے سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ ایک نامعلوم سی خاموشی پورے گھر میں چھائی ہوئی تھی یا شاید اُسے محسوس

ہو رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑی وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے بیٹھنا چاہیے یا ان ہی قدموں واپس لوٹ جائے۔

''بیٹھ جاؤ رملہ۔ تھوڑا ریلیکس ہو جاؤ پھر بات کریں گے۔'' اپنے پیچھے اس کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اور چپ چاپ صوفے کے کنارے ٹک گئی۔ وہ فوراً ہی اس کے لیے جوس لے آیا جسے اس کے ہاتھ سے لے کر ایک ہی سانس میں یوں پی گئی جیسے پتا نہیں کب سے پیاسی تھی۔ جوس پیتے ہی اس کے وجود میں ٹھنڈک اُتر آئی اور دھندلائے منظر آنکھوں کے سامنے واضح ہو کر نئی زندگی کا پتا دینے لگے۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ تو وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''پہلے سے کافی بہتر۔''

''ہاں اب بتاؤ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم ایسی تو نہیں تھیں لباس دیکھا ہے اپنا۔ میرا خیال ہے اس حلیے میں تو تم کبھی اپنے گھر میں بھی نہیں رہی ہو گی کہاں اتنی مصروف شاہراہ پر کھڑی تھیں۔'' وہ اس کا تفصیلی جائزہ لے کر بولا تو اس کی پلکوں پر نمی اُتر آئی۔ اس نے چاہا کہ نمی اپنی انگلیوں پر سمیٹ لے اور جیسے ہی انگلیوں نے پلکوں کو چھوا جانے کیسے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''رملہ، رملہ پلیز یوں نہیں روؤ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔'' وہ ایک دم پریشان ہو کر اُس کے پاس آ بیٹھا۔ تو وہ جیسے پھٹ پڑی۔

''میں مر جاؤں گی جازی! مجھے اس حال کو احسن نے پہنچایا ہے۔ وہ میرے ساتھ بالکل اچھا سلوک نہیں کرتا۔ اور اس کا رویہ بھی بہت توہین آمیز ہوتا ہے۔''

''بی ایزی رملہ۔ تم اپنے ڈیڈی سے کہو۔''

''میں نے کہا تھا اُن سے، وہ الٹا مجھے الزام دینے لگے۔ اور زارا وہ جب بھی آتی ہے، مجھے نصیحتیں کرنے لگتی ہے۔ احسن سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔'' اس تمام عرصے میں **پہلی بار** کوئی اسے اپنی بات سننے والا ملا تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے اپنے گھر کا احوال کہہ گئی۔ تو وہ کچھ دیر تک سر جھکائے جانے کیا سوچتا رہا پھر پوچھنے لگا۔

''آخر احسن تمہارے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''اس لیے کہ وہ جانتا ہے میں اُسے بالکل پسند نہیں کرتی اور میں متعدد بار اُسے یہ بات کہہ بھی چکی ہوں۔''

''کیا!'' وہ حیران ہوا۔ ''تم تو بہت بے وقوف ہو رملہ۔ پاگل لڑکی کہیں شوہر سے ایسی باتیں کہی جاتی ہیں۔''

''پھر کیا کرتی، اُسے اپنی جھوٹی محبتوں کا یقین دلاتی، اُس سے یہ کہتی کہ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے شخص ہو۔''

''کم آن یار، ایسا کرنا پڑتا ہے۔''

''لیکن میں یہ دوغلا پن پسند نہیں کرتی اور پھر وہ جانتا ہے کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

''ہوں نہیں رملہ تھی کہو۔'' اس نے ٹوکا۔

''نہیں جازی! میں تمہیں ماضی کا قصہ بنا کر اُسے اطمینان نہیں دے سکتی۔ وہی تو میری محبتوں کا قاتل ہے اگر وہ درمیان میں نہ آتا تو۔'' وہ رُک گئی۔

''جذبات سے نہیں عقل سے کام لو۔ کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''سکون سے تو وہ بھی نہیں ہے۔''

''اس کی بات چھوڑو، اپنی بات کرو۔ تم جانتی ہو تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہوا ہے۔ اور پھر میں تو محض تمہارے بہتر اور درخشاں مستقبل کی خاطر تمہاری راہ سے ہٹ گیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اپنا یہ حال کر لو گی تو میں تمہیں کبھی اس کے ساتھ شادی کرنے کا مشورہ نہ دیتا۔'' وہ اس کی کم عقلی پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''بہتر مستقبل تو تم بھی مجھے دے سکتے تھے۔''

''ہاں لیکن وہ مقام نہیں دے سکتا تھا جو۔''

''بس کرو جازی اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔'' وہ اسے کہتے ہوئے چیخ کر بولی۔ ''تین کمروں کے کوارٹر میں رہتا ہے اپنی ذاتی سواری تک تو ہے نہیں اس کے پاس سرکاری جیپ میں آتا جاتا ہے ابھی تم نے دیکھا نہیں میں کنوینس کے لیے کتنی پریشان کھڑی تھی۔''

''رملہ۔ وہ ایس پی احسن کمال؟'' جازی کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

''ہاں ایس پی احسن کمال، ایک ملازم تک افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''تم نے تو واقعی مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔'' وہ کتنی دیر تک اسے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی باتوں پر یقین نہ کر رہا ہو۔ پھر ذرا سنبھل کر کہنے لگا۔

''دیکھو رملہ! میری بات سنو، سب سے پہلے تو تم اپنے آپ کو بدل ڈالو۔ اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ خوش اور مطمئن رہنا سیکھو۔ یقین کرو تمہاری اجاڑ اور ویران صورت تو اسے اندر سے مطمئن رکھتی ہو گی۔ اگر تم اس کا اطمینان چھیننا ہی چاہتی ہو تو زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔''

''وہ اب بھی مجھے غیر مطمئن نظر نہیں آتا۔''

''پوز کرتا ہو گا، خیر اس کی بات چھوڑو۔ یہ تو دیکھو تمہاری وجہ سے میں کتنا پریشان ہو گیا ہوں۔ یقین کرو میں اب تک باوجود خواہش کے تم سے رابطہ نہیں رکھ سکا محض اس لیے کہ کہیں تمہاری پُرسکون زندگی متاثر نہ ہو۔ میں اس خوش فہمی میں تھا کہ تم خوش اور مطمئن ہو گی اور کبھی بھولے سے بھی مجھے یاد نہیں کیا ہو گا۔'' قدرے توقف سے کہنے لگا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو تو میں بہت پہلے تم سے ملتا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا میں تم سے التجا کرتا ہوں رملہ، اپنے لیے نہیں تو میرے لیے سنبھل جاؤ۔ بھول جاؤ گزشتہ ساری باتیں۔ یوں سمجھو ہم کبھی ملے ہی نہیں تھے۔'' اُس کی آواز کا بوجھل پن اُسے بے چین کر گیا۔

"نہیں جازی میں تمہیں نہیں بھول سکتی۔ میں احسن کے ساتھ سمجھوتا نہیں کروں گی۔"

"میری خاطر رملہ، میری خاطر۔" جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ اس نے سر جھکا لیا اور جب اس کے گھر سے رخصت ہو رہی تھی تو اُس سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ اس کی خاطر احسن سے سمجھوتا کرے گی۔

جازی سے مل کر وہ نہ صرف اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی پرانی خود اعتمادی لوٹ آئی ہو۔ اور وہ اپنے گھر میں بڑے اعتماد سے داخل ہوئی، لیکن بالکل غیر متوقع طور پر برآمدے میں احسن کو کھڑے دیکھ کر لمحہ بھر کو اس کے قدم ڈگمگا گئے پھر فوراً ہی سنبھل گئی اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے چاہا کہ اُس کے قریب سے نکل جائے لیکن وہ سامنے آ گیا۔

"کہاں گئی تھیں؟" چبھتا ہوا سرد لہجہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر سہمنے کے باوجود بظاہر اطمینان سے بولی۔

"میرا خیال ہے میں چچی جان کو بتا کر گئی تھی۔"

"تم انہیں ساتھ بھی لے جا سکتی تھیں۔"

"کیوں انہیں لے جانا ضروری تھا کیا؟" وہ اس کے مقابل ڈٹ گئی۔

"ہاں۔ اس لیے کہ میں تمہارا تنہا باہر جانا پسند نہیں کرتا۔"

"میں گھومنے نہیں گئی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اور سن لو احسن کمال میں بوڑھی عورت کے سہارے نہیں چل سکتی۔ اگر اتنے ہی میرے تنہا باہر جانے سے خوفزدہ تھے تو خود میرے ساتھ چلتے۔" اُس تمام عرصے میں پہلی بار اُس نے اُسے احساس دلایا کہ اس کی بیوی ہونے کے ناتے وہ اس پر کچھ حق بھی رکھتی ہے۔

"تم نے کہا تھا مجھے ساتھ چلنے کے لئے۔"

"کیا مجھے کہنا چاہیے تھا؟ تم خود نہیں دیکھ رہے تھے کہ میں کس حال میں ہوں۔ کیا تمہارا فرض نہیں تھا کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ یا تم نے سارے فرائض میرے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں۔"

"رملہ۔" وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

"اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا۔ اور اس کی مسکراہٹ سے وہ جان گئی کہ اُسے اُس کا بیویوں کی طرح حق جتانا اور اس کے فرائض سے آگاہ کرنا اچھا لگا ہے۔ اور شاید وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے جا رہا تھا کہ حقوق و فرائض کے بعد اس کا اگلا قدم اس کی طرف بڑھے گا، جبکہ اس کے قدموں نے بغاوت کی راہ دیکھ لی تھی۔

واقعی جازی کے مشورے پر عمل کر کے اس نے اپنی زندگی کو آسان بنا لیا۔ بڑے دنوں بعد اس نے اپنے آپ کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ تو حیران رہ گئی۔ اُس کی شہابی رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں نے گھیرا ڈال کر ایک ویرانی بخش دی تھی اور اس کے وہ سونے جیسے بال کس قدر بدرنگ ہو گئے تھے۔ اُسے افسوس ہوا کہ وہ کیوں خود سے غافل رہی۔ بہرحال اب جب غفلت سے نکلی تو وہ جو ایک بے زاری اور جھنجلاہٹ اس پر سوار رہتی تھی، وہ کسی حد تک کم ہو گئی۔ اور وہ سکون سے گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے آپ پر توجہ دینے لگی،

وہ تمام خوبصورت سوٹ جو اس نے الماری میں بند کر دیے تھے انہیں استری کر کے ہینگر پر لٹکا دیا اور بیوٹی بکس کا سامان بھی ڈریسنگ ٹیبل کی زینت بن گیا۔ جس وقت احسن آفس سے آتا، وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر اپنا حلیہ ٹھیک کر چکی ہوتی تھی...... پہلے پہل اس تبدیلی کو اُس نے حیرت سے دیکھا پھر رفتہ رفتہ اُسے سراہنے لگا۔

اس روز وہ حسبِ معمول شام کے وقت آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ وہ گملوں میں سجے پھولوں کو دیکھتے ہوئے جانے کہاں کھو گئی تھی کہ احسن کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بے خیالی میں اُسے دیکھے گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"کہو تو آنکھیں بند کر لوں؟" وہ ہنس پڑا۔

"نہیں۔"

"چائے لاؤں۔" وہ اٹھنے کے بہانے بولی۔

"چائے۔" وہ یوں بولا جیسے سوچ رہا ہو کہ اس وقت چائے پینی چاہیے یا نہیں۔ معاً کچھ اور یاد آنے لگا۔

"سنو آج زارا کا فون آیا تھا، تمہیں بلا رہی تھی۔"

"کیوں، میرا مطلب ہے، اُس نے گھر پر فون نہیں کیا۔؟"

"پہلے یہیں کیا تھا لیکن شاید فون ڈیڈ پڑا ہے۔ بہرحال ابھی چل رہی ہو۔؟"

"چلو۔" اُس نے آمادگی ظاہر کی تو وہ اُٹھ کر لباس تبدیل کرنے چلا گیا پھر امی سے کہتا ہوا آیا تو وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

واقعی بہت دن ہو گئے تھے، زارا سے ملے ہوئے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ابھی تک اُس سے اتنی شاکی تھی کہ کبھی اس کے پاس جانے کا سوچتی بھی نہیں تھی۔ ابھی بھی زارا اُسے دیکھتے ہی شکوہ کرنے لگی۔

"تم تو بالکل بھی نہیں آتیں رملہ؟"

"آ تو گئی ہوں۔"

"میرے بلانے سے آئی ہو ناں، ایسے تو تمہیں خیال نہیں آتا۔" وہ سچ کہہ رہی تھی تب وہ اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے ہنس پڑی۔

"آئندہ بن بلائے بھی آ جاؤں گی۔"

"پھر جیسے ہی احسن اور عاصم بھائی اپنی باتوں میں مصروف ہوئے، وہ زارا کے ساتھ اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔ زارا ماں بننے والی تھی۔ اس کے چہرے پر معصوم سا نکھار تھا۔ وہ بغور اُسے دیکھنے لگی۔ ہمیشہ سے کچھ مختلف اور اچھی لگ رہی تھی۔

"سنو۔" زارا چولہا جلاتے ہوئے اچانک اُسے مخاطب کر کے بولی۔ "تم ڈیڈی کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔"

''میں کہیں بھی نہیں جاتی زارا، مجھے فرصت ہی نہیں ملتی۔''

''میں کہیں کی نہیں، ڈیڈی کی بات کر رہی ہوں۔ تم جانتی ہو، تمہارا رویہ ڈیڈی کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے'' زارا نے اُسے احساس دلانے کی کوشش کی۔ تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی تھوڑی تلخ ہوگئی۔

''انہوں نے کون سا میرے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔''

''کیوں کیا کیا ہے انہوں نے؟''

''تم اچھی طرح جانتی ہو زارا اُن کے غلط فیصلے کی بدولت میں اب تک ایڈجسٹ نہیں کر سکی۔'' وہ ابھی تک شاکی تھی، زارا کو حیرت ہوئی۔

''ڈیڈی کو الزام نہیں دو رملہ۔ تم نے ایڈجسٹ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں کل ان کے پاس گئی تھی، و تمہیں یاد کر کے بہت آزردہ ہوگئے تھے۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ ٹرے اٹھا کر اس میں پیالیاں رکھ لگی۔

''میں یہ سب کر لوں گی۔'' زارا اُس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے بولی۔ تم ایسا کرو ڈیڈی سے فون پر با کرلو۔''

''میں کسی دن اُن کے پاس ہو آؤں گی۔'' اس نے ٹالنا چاہا۔

''ضرور جانا لیکن اس وقت بات کر لینے میں کیا حرج ہے۔'' وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی، پھر فون کر کی غرض سے لابی میں آ گئی۔ دو تین بار ڈیڈی کا نمبر ملایا لیکن مسلسل انگیج تھا۔ تب ریسیور رکھتے ہوئے جا کیسے جازی کا خیال آ گیا اور وہ اس کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف اس کی آواز سنتے ہی وہ کہنے لگا۔

''رملہ! آج میں بڑی شدت سے تمہیں یاد کر رہا تھا۔''

''کیوں؟'' اُس نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہاں سے بات کر رہی ہو؟''

''زارا کے گھر سے۔''

''ایسا کرو کل صبح دس بجے مجھے فون کرنا۔ مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ یاد رکھو گی ناں؟''

''ہاں۔''

''اور سنو۔''

''نہیں جازی میں فون بند کر رہی ہوں۔ شاید اس طرف کوئی آ رہا ہے۔'' اس نے جلدی سے ریسیور رکا دیا۔ اُس کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئی تھیں۔ کچھ دیر وہیں رُک کر خود کو نارمل کیا پھ زارا کے پاس آئی تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

''ڈیڈی سے بات ہوگئی؟''

''نہیں، میں نے بار بار ٹرائی کیا اُن کا نمبر انگیج ہے۔''

''اچھا تو پھر کل اُن کے پاس چلی جانا۔'' اُس نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ پھر اس کے ساتھ چائے وغیرہ لے کر اندر آ گئی۔ ماحول خاصا خوشگوار تھا۔ ہلکی پھلکی باتیں۔ عاصم بھائی کی چھیڑ چھاڑ۔ وہ بظاہر مسکراتی رہی لیکن اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

پھر اگلے روز وقت مقررہ پر اس نے جازی کو فون کیا تو وہ جیسے بہت عجلت میں تھا۔ فوراً کہنے لگا۔

''ایسا ہے رملہ کہ مجھے بہت ضروری کام سے ابھی حیدرآباد جانا ہے۔ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ دو گھنٹے بعد مجھے ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے اور آج کل ہائی وے پر چیکنگ اتنی زیادہ ہو رہی ہے کہ گھنٹہ بھر خواہ مخواہ وہاں رکنا پڑتا ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔

''سنو۔'' وہ اسے متوجہ کر کے بولا۔ ''اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو اپنے ایس پی کی گاڑی میں مجھے ہائی وے کراس کرا دو۔ میں تمہارا بہت مشکور ہوں گا۔ دیکھو انکار نہیں کرنا۔'' وہ اس کی پوری بات سن کر شش و پنج میں پڑ گئی۔ فوری طور پر سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اور وہ پھر اصرار سے بولا۔

''پلیز رملہ۔ مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے۔ اور اس وقت مجھے کوئی دوسرا راستہ نہیں آ رہا۔ تم میری مدد کر سکتی ہو۔''

''ہاں لیکن میں کیا کروں۔ گاڑی تو احسن ہی کے پاس ہوتی ہے۔'' اس نے خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی۔ تو وہ فوراً بول پڑا۔

''تم کسی بھی بہانے گاڑی منگوا سکتی ہو۔''

''تم مجھے عجیب مشکل میں ڈال رہے ہو جازی میرا مطلب ہے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں گاڑی کی بات کروں اور احسن خود لے کر آ جائے پھر میں اس سے کیا کہوں گی۔'' وہ سوچ کر بولی اور وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر قدرے توقف سے کہنے لگا۔

''کوشش کر دیکھو۔ اگر وہ خود آ جائے تو پھر اس کے ساتھ اپنے ڈیڈی کے پاس چلی جانا۔''

''اور تم۔ میرا مطلب ہے۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ خیر تم پہلے احسن سے بات کرو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو وہ کچھ الجھتی ہوئی احسن کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس تمام عرصے میں یہ پہلا موقع تھا جو وہ اس کے آفس فون کر رہی تھی۔ جب ہی اس کی آواز سنتے ہی اس نے قدرے پریشان ہو کر فوراً سب کی خیریت پوچھ ڈالی اور اس نے سب کی طرف سے اطمینان دلا کر جب اپنا مدعا بیان کیا تو جانے کیوں وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر قدرے تاخیر سے پوچھنے لگا۔

''کہاں جاؤ گی؟''

''اپنی ایک دوست کے پاس۔ تمہیں اعتراض ہے کیا؟''

''نہیں میں تو خود چاہتا ہوں کہ تم اپنی دوستوں کے ساتھ میل جول رکھو۔ لیکن سنو، کیا اس وقت جانا ضروری ہے میرا مطلب ہے شام میں۔''

''شام میں میرا ڈیڈی کے پاس جانے کا پروگرام ہے۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''اچھی بات ہے میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔''

''تھینک یو۔'' وہ ریسیور رکھ کر پُرسوچ انداز میں مسکرائی اور جلدی سے اپنے کمرے میں آ کر تیار ہونے لگی۔ پھر جس وقت آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھی تب پہلی بار دل نے سرزنش کرتے ہوئے ٹوکا کہ وہ کن راہوں پر چلنے لگی ہے۔ اسی وقت باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ سر جھٹک کر اُدھر متوجہ ہوگئی۔ پھر بیڈ سے دوپٹہ اُٹھا کر گلے میں ڈالتے ہوئے باہر نکلنے لگی کہ احسن کی بات یاد آئی۔

''یہ صحیح ہے رملہ کہ میں تمہاری سوچوں پر پہرے نہیں بٹھا سکتا۔ لیکن تم ایک بات یاد رکھنا کہ میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ معاشرے میں میرا ایک مقام ہے۔ اور تم جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا کہ جس سے میری عزت پر ذرہ برابر بھی آنچ آئے۔ میں تمہیں اُسے سوچنے کی اجازت دیتا ہوں لیکن اس سے ملنے کی کوشش کبھی نہیں کرنا۔'' ایک پل کو اس کے قدم دروازے ہی میں رک گئے لیکن اگلے پل وہ ہر خیال جھٹک کر دہلیز پار کر آئی۔ غالباً کوئی بات آسانی سے سمجھنا اور مان لینا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ باہر آ کر اُس نے ڈرائیور کو چھٹی دے دی اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو تمام راستہ خود کو بہلاتی یا دھوکا دیتی رہی تھی۔ بہر حال کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے شوہر ایس پی احسن کمال کی جیپ میں جازی کے سامنے تھی۔ اور وہ اُسے دیکھ کر کھل اٹھا...... بے اختیار اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تشکر سے بولا۔

''تھینک یو رملہ! تم نے مجھے بڑی دردِسری سے بچانے کا سامان کر دیا۔ اب یقیناً میں...... وقتِ مقررہ پر پہنچ جاؤں گا۔'' وہ اس کی بے اختیاری پر ذرا سا ہنسی اور اس کے لیے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر خود برابر میں کھسک گئی۔

''ایک منٹ۔'' وہ عجلت میں کہتے ہوئے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے پیچھے دو ملازم سامان اٹھائے آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ پیٹیوں کے متعلق کوئی بات کرتی، وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔ اور اُس کے فریش چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

''لگتا ہے تم نے ایس پی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے؟''

''ہاں۔ تم سے کیا وعدہ تو بہر حال مجھے نبھانا تھا۔'' اس کے لہجے میں افسردگی سمٹ آئی۔ جسے محسوس کر کے وہ کچھ دیر کو خاموش ہوگیا۔ پھر جیسے ہی ملازم سامان جیپ میں رکھ کر ایک طرف ہوئے اس نے فوراً اسٹارٹ کر دی اور ایک نظر اس پر ڈال کر بولا۔

''تم نے میری بات مان کر بہت اچھا کیا رملہ ورنہ زندگی بہت دشوار ہو جاتی۔'' وہ کچھ نہیں بولی چپ چاپ سیٹ کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ تب قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔

''تمہیں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے احسن نے گاڑی بھجوانے میں پس و پیش تو نہیں کی۔''

''نہیں۔''

''کیا کہا تھا تم نے اس سے؟'' بظاہر اس کا انداز سرسری تھا یوں جیسے خاموشی کی نسبت بات کرتے رہنا مناسب ہو۔

''جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ ہنسی۔ ''میرا مطلب ہے یہی کہا کہ دوست کے پاس جانا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوا اور جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ اچانک جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

''لو ناں۔'' وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا۔

''جازی تم۔ تمہیں ابھی تک یاد ہے کہ میں یہ چیونگم۔''

''مجھے سب کچھ یاد ہے۔ کچھ بھی نہیں بھولا۔'' اُس کے لہجے میں افسردگی کے ساتھ کھو دینے کا دکھ سمٹ آیا تھا۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھے گئی۔ معاً دور سے گاڑی کے سائرن نے دونوں کو چونکا دیا۔ اور وہ ایک دم پریشان ہو کر بولا۔

''تمہارا ایس پی میرے انداز سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ لگتا ہے ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ نا صرف خوفزدہ ہوئی بلکہ بے حد ہراساں ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ واقعی ایک پولیس جیپ اور دو بائیک سوار چلے آ رہے تھے۔

''اب کیا ہوگا جازی؟'' وہ خوفزدہ انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔

''اپنے حواس قابو میں رکھو، اور دیکھو میں رفتار دھیمی کر رہا ہوں تم نیچے کود جاؤ۔''

''نہیں۔'' اس نے ڈر کر اس کا بازو تھام لیا۔ ''اس وقت ضد نہیں کرو رملہ! تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ ورنہ میرے ساتھ تم بھی۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔ پھر خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔ ''میرا خیال ہے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں احسن کو فیس کر سکتی ہوں۔''

''بات صرف احسن کو فیس کرنے کی نہیں ہے۔'' وہ بے حد الجھ کر بولا۔

''میں اس وقت تمہیں سمجھا بھی نہیں سکتا۔ بس تم میری بات مان لو۔''

''نہیں۔''

''پلیز رملہ! تمہیں میری قسم۔'' اُس نے بہت عاجزی سے کہہ کر رفتار دھیمی کی اور اُسے نیچے کود جانے کا کہا۔ لیکن وہ اس کے بازو پر گرفت مضبوط کر کے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''رملہ پلیز۔'' تب ہی بائیک پر انہیں رُکنے کی وارننگ دی جانے لگی تو وہ اس سے بولی۔

''رُک جاؤ میں دیکھتی ہوں کون ہے۔''

''نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے رفتار بڑھا دی بلکہ فل اسپیڈ سے دوڑانے لگا۔

''رکو جازی! مجھے بات کرنے دو۔ آخر تم اس طرح کیوں بھاگ رہے ہو؟'' وہ اس کا بازو جھنجھوڑ کر کہتی رہی لیکن وہ رکنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ جبکہ پیچھے سے مسلسل وارننگ جاری تھی۔ اور جب وارننگ کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تب فائرنگ شروع ہوگئی۔

''جازی خدا کے لئے رُک جاؤ۔ میں سب سنبھال لوں گی۔'' وہ فائرنگ سے خوفزدہ ہوکر زور سے چیخی۔ تو وہ بس ایک پل کو اطراف سے غافل ہوا تھا۔ اُس پر نظر ڈال رہا تھا کہ پیچھے سے سنسناتی ہوئی گولی اُس کی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ اگلے پل وہ اس کے سامنے تڑپ رہا تھا۔

''جازی۔'' آنکھوں کے سامنے خون کا دریا تھا جس نے اُس کے حواس گم کردیے۔ قطعی ہوش نہیں رہا تھا کہ جیپ بے قابو ہوکر کن راستوں پر جارہی ہے۔ بے حد وحشت زدہ ہوکر ان پتھرائی آنکھوں کو دیکھے جارہی تھی جن میں اب بھی اس کے بھاگ جانے کی التجا ٹھہر گئی تھی اور اس سے پہلے کہ تعاقب میں آتی۔ جیپ اور بائیک قریب آتے اُس کا ذہن مکمل تاریکیوں میں ڈوب چکا تھا۔



جس وقت اُسے ہوش آیا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اور کیونکہ ابھی ذہن پوری طرح بے دار نہیں ہوا تھا اس لیے آنکھیں کھلتے ہی اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن سر کے ساتھ جسم کے مختلف حصوں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ جس سے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ بہت احتیاط سے دوبارہ سر تکیے پر رکھا اور ابھی سوچ ہی رہی تھی مجھے کیا ہوا ہے کہ آہستگی سے دروازہ کھول کر احسن اندر آ گیا۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے دیکھا، وہ خاصے کڑے تیوروں سے اُسے گھور رہا تھا۔ پھر اسی انداز میں اس کے قریب آ کر آہستہ آواز مگر سخت لہجے میں کہنے لگا۔

''کاش میرا کوئی تم سے ناتا نہ ہوتا تو میں تمہیں ایسی سزا دلواتا کہ تمہاری سات نسلیں یاد رکھتیں۔'' وہ اس وقت ذہنی طور پر بالکل مفلوج تھی اس لیے سمجھ نہیں سکی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں بگڑ رہا ہے۔ تب پلکیں جھپک جھپک کر پہلے آنکھوں میں اتری نمی اپنے اندر اتاری پھر بغور اُسے دیکھنے لگی۔ تو وہ زہر خند سے بولا۔

''ذاتی طور پر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ ایک مجرم کا ساتھ دے کر تم نے صرف میرے ساتھ ہی نہیں بلکہ پوری قوم اور ملک کے ساتھ غداری کی ہے۔''

''مجرم۔'' اس نے دل میں دہرایا جبکہ آنکھوں میں سوالیہ نشان اُبھر آئے جنہیں دیکھ کر وہ مزید تلخ ہوگیا۔

''جاذب گیلانی! سنا تم نے میں جاذب گیلانی کی بات کر رہا ہوں جسے تم میری زوجیت میں آنے کے بعد بھی سوچتے رہنے کا اعتراف کر چکی ہو۔ اور بالآخر تم نے اس کی خاطر میری عزت بھی داؤ پر لگا دی۔'' وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ سمجھنے کے قابل نہیں تھی لیکن جازی کے نام کے ساتھ اُسے اپنے اطراف یہاں وہاں حتیٰ کہ سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں بھی خون ہی خون نظر آنے لگا۔ تو بے حد خوفزدہ ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن یہاں بھی وہی کچھ تھا تب گھبرا کر اُسے دیکھا تو وہ تاسف سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''تمہارے لیے کہیں امان نہیں ہے۔ یہ میرا ظرف تھا کہ میں نے تمہیں اُسے سوچنے کی اجازت دی تھی لیکن

تم نے اُس حد کو کراس کر کے خود اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔ اور اب مجھے تم پر رحم نہیں آ رہا۔'' وہ واقعی بہت سفاک نظر آ رہا تھا۔ قدرے توقف سے کہنے لگا۔

''میں تمہاری طرف سے اُسی روز چوکنا ہوگیا تھا جس روز اچانک تمہارے انداز بدلے تھے۔ کہاں تو میری ہر بات کی نفی اور نفرت کا اظہار اور کہاں۔'' دروازے پر آہٹ سن کر اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور اُٹھ کر کھڑا ہوگیا تب ہی چچی جان اور ڈیڈی اندر آ گئے۔

''رملہ کیسی ہو بیٹا۔'' ڈیڈی نے بے اختیار بڑھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا چچی جان بھی آگے آ کر اس کا حال پوچھنے لگیں۔ لیکن وہ اب بھی کچھ نہیں بولی نہ ہی کوئی اشارا کیا۔ تب ڈیڈی اُسے مخاطب کر کے پوچھنے لگے۔

''احسن! کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟''

''نہیں ڈاکٹر نے تو کوئی تشویش ظاہر نہیں کی۔''

''میں ڈاکٹر کی بات نہیں کر رہا۔''

''پھر؟'' ڈیڈی کے ساتھ بھی وہ خاصے اکھڑے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ جسے محسوس کر کے ہی وہ نظریں چرا کر بولے۔

''میرا مطلب ہے، اس واقعے میں رملہ کا نام تو نہیں آئے گا۔''

''نام۔'' اس نے پہلے طنزیہ نظروں سے اُسے گھورا پھر ڈیڈی سے کہنے لگا۔ ''میں اکیلا نہیں تھا انکل میرے ساتھ پورا عملہ تھا اور سب نے ہی اسے جاذب گیلانی کے ساتھ دیکھا ہے۔''

''پھر اب کیا ہوگا؟'' ڈیڈی پریشان ہوگئے۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ گو کہ ابھی معاملہ میرے اختیار میں ہے لیکن۔'' وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگا۔ جبکہ ڈیڈی اور چچی جان پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد انسپکٹر اندر آ گیا اور اپنے مخصوص انداز میں سلام کرنے کے بعد اُس سے پوچھنے لگا۔

''سر! کیا بیگم صاحبہ بیان دینے کے قابل ہیں۔''

''نہیں ابھی تم جاؤ اور سنو جب ضرورت ہوگی میں خود تمہیں بلا لوں گا او کے۔''

''یس سر۔'' انسپکٹر سلیوٹ مارتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ تب چچی جان اُس پر بگڑنے لگیں۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو، تمہارے ہوتے دوسرے لوگ یہاں کیوں آ رہے ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے۔ اگر نہیں معلوم تو بتا دو یہ کوئی بیان وغیرہ نہیں دے گی سمجھے تم۔''

''آپ یہ ساری باتیں نہیں سمجھتیں امی۔''

''میں سمجھتی ہوں یا نہیں سمجھتی لیکن تم اچھی طرح سن لو کہ میری بہو پر کوئی الزام، کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے۔'' وہ امی کی بات سن کر بھڑک اٹھا لیکن پھر جانے کس خیال کے تحت فوراً ہونٹ بھینچ کر کمرے سے نکل گیا۔ تب چچی جان اُس کے پاس آ بیٹھیں اور اس کا چہرا ہاتھوں میں لے کر اپنے تئیں اُسے اور ڈیڈی کو تسلی دینے

لگیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اس نے احسن کی باتیں بھی خاموشی سے سنی تھیں۔ اسی طرح چچی جان کو بھی خاموشی سے سنتی رہی پھر تھک کر پلکیں موند لیں اصل میں وہ ابھی تک پوری صورتِ حال سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کیونکہ جازی کو خون میں لت پت دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ پھر جس طرح جیپ بے قابو ہو کر کچے راستوں پر جا کر اُلٹ گئی تھی اُس سے اُسے شاید چوٹیں آئی تھیں خصوصاً سر میں۔ جس سے ہو سکتا ہے اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہو۔ گو کہ ڈاکٹر نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ بہر حال اسے سوائے خون کے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کیونکہ اس وقت تکلیف کا احساس زیادہ تھا۔

پھر کتنے دن بعد جب وہ کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہوئی تو سب سے پہلا خیال یہ ہی آیا کہ وہ زخمی اور ہاسپٹل میں کیوں ہے۔ اور کیوں کا جواب سوچتے ہوئے اُسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ جب اس مقام پر پہنچی کہ جازی اس کے ساتھ تھا اور پیچھے پولیس وین میں انہیں رکنے کی وارننگ دی جا رہی تھی تو اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ سانس بھی تیز تیز چلنے لگی جیسے وہ سب اس کے ساتھ ابھی ابھی پیش آ رہا ہو اور وہ آنے والے لمحے کو روکنا چاہتی ہو۔ لیکن وہ لمحہ تو سب کا گزر چکا تھا۔ اُس وقت وہ جازی کا تڑپتا وجود دیکھ کر حواس کھو بیٹھی تھی اور اب وہ منظر نگاہوں میں سماتے ہی وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ ڈیوٹی پر موجود نرس چیخیں سُن کر ایک اس کی طرف دوسری ڈاکٹر کو بلانے بھاگی۔ احسن دور کوریڈور میں کھڑا تھا نرس کو بھاگتے دیکھ کر وہ بھی بھاگ کر کمرے میں آیا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی پھر نرس کا ہاتھ جھٹک کر چیخنے لگی۔ تب ہی ڈاکٹر آ گیا اور فوراً نرس کو اُسے انجکشن لگانے کا کہا پھر انجکشن لگتے ہی وہ قدرے نڈھال سی ہو کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک ہچکیوں کے ساتھ لمبے لمبے سانس لیتی رہی پھر آہستہ آہستہ پُرسکون ہو گئی احسن بہت خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر کے اشارے پر اُس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ آہٹ پر فوراً آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی، اور جیسے ہی وہ اخبار اٹھا کر بیٹھنے کی غرض سے کرسی کی طرف بڑھا اس نے پکار لیا۔

''احسن'' وہ چونک کر اُس کی طرف پلٹا تو بے حد دکھ سے بولی۔

''تم نے جازی کو مار ڈالا'' اور وہ جو اس دوران خود کو کافی حد تک سمجھا چکا تھا اس کی بات سے پوری جان سے سلگ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی طنز آمیز لہجے میں بولا۔

''بہت دکھ ہو رہا ہے تمہیں اس کے مرنے کا۔''

''ہاں۔'' اس کی آنکھوں کے پیمانے پھر چھلک گئے۔ اور پتا نہیں اپنے دل میں کیا ٹھان چکی تھی جو صاف گوئی سے باز نہیں آئی۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ دکھ اپنے زندہ بچ جانے کا ہے۔ تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اُس کے ساتھ مجھے بھی مار ڈالتے۔''

''کاش میں ایسا کر سکتا۔'' وہ مٹھیاں بھینچ کر بُری طرح تلملا کر بولا۔

''کس نے روکا تھا تمہیں؟''

''میری غیرت نے۔''

''غیرت نے؟'' اُس کی ہلکی سی ہنسی میں تلخی کے ساتھ استہزا تھا۔ جیسے جتانا چاہتی ہو کہ غیرت میں لوگ جان لیتے ہیں بخشتے نہیں۔ اور وہ سمجھ کر دانت پیس کر بولا۔

''ہاں غیرت نے، کہ تم تو آرام سے ابدی نیند سو جاتیں اور میں لوگوں کے طعنے سننے کو تنہا رہ جاتا کہ ایس پی احسن کمال کی بیوی اپنے یار کے ساتھ دفن ہو گئی۔ کس کس کی زبان پکڑتا میں اور کس کس کو جواب دیتا۔''

''گویا جواب دہی کے لیے تم نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''تم صرف میرے سامنے جواب دہ ہو۔ لوگوں کی زبانوں تک کوئی سوال آنے سے پہلے ہی میں بند باندھ چکا ہوں، یہ کہہ کر کہ تمہیں اکیلا دیکھ کر جاذب زبردستی تمہاری جیپ میں داخل ہو گیا۔ اور ریوالور کے زور پر تمہیں بے بس کر کے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔'' وہ اس کی بات سن کر بجائے مطمئن ہونے کے تاسف سے اُسے دیکھنے لگی۔ تو وہ زور دے کر بولا۔

''تمہیں بھی یہی بات کہنی ہے سمجھیں تم۔''

''نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔ اگر ایسا کر سکتی تو اوّل شب سب سے پہلا جھوٹ تمہارے ساتھ بولتی۔'' وہ اس کے ضبط کا امتحان نہیں لے رہی تھی لیکن کڑی آزمائش ضرور بن گئی تھی۔ نہ اپنے کیے پر نادم نہ اُس سے خائف۔

''ضرور بولتیں اگر میں بے خبر ہوتا۔ لیکن میں سب جانتا تھا۔''

''ابھی بھی تم سب جانتے ہو۔''

''ہاں لیکن لوگ نہیں جانتے۔ اور تم سن لو کہ اب اگر تم نے مزید میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' جواباً اس نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اس نے سختی سے ٹوک دیا۔

''خبردار، اب ایک لفظ نہیں کہنا۔ انتہائی گھٹیا عورت ہو تم۔ بجائے اپنے کیے پر شرمندہ ہونے کے اُلٹا مجھے زیر کرنا چاہتی ہو۔ تُف ہے تم پر۔ میرے اعتبار اعتماد کو جس طرح تم نے پیروں تلے روندا ہے۔ اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ تو کچھ دیر تک وہ بالکل ساکت لیٹی رہی، پھر ایک دم فیصلہ کر کے بیل کا بٹن دبایا اور سسٹر کے آنے پر اُسے ڈیڈی کا نمبر دے کر بولی کہ انہیں فوراً آنے کے لیے کہے۔ پھر اُن کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈیڈی آئے تو ان کے پیچھے احسن بھی تھا۔ غالباً اُس وقت سے یہیں کہیں موجود تھا جب ہی اُن کے ساتھ اندر آیا، وہ اُسے نظر انداز کر کے بولی۔

''ڈیڈی میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''اچھا۔'' ڈیڈی نے یونہی احسن کی طرف دیکھا پھر پوچھنے لگے۔ ''کیا ڈاکٹر نے اجازت دے دی ہے؟''

''ڈاکٹر سے آپ خود بات کر لیں۔ میں بس ابھی جاؤں گی۔'' اُس کے ضدی لہجے پر ڈیڈی اثبات میں سر

ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ تو وہ اس سے کہنے لگی۔

’’میں ڈیڈی کے ساتھ اُن کے گھر جا رہی ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تم سے بھاگ کر جا رہی ہوں میں۔‘‘

’’تم مجھ سے بھاگ کر جا بھی نہیں سکتیں رملہ۔‘‘ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ ’’میں جب تک تم سے ایک ایک بات کا حساب نہ لے لوں تمہیں مرنے بھی نہیں دوں گا۔‘‘

’’حساب سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا احسن کمال۔‘‘ وہ طنز آمیز تلخ لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ اور ڈیڈی کا انتظار کیے بغیر باہر آ کر اُن کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈیڈی کو آنے میں کافی دیر ہوئی۔ غالباً ڈاکٹر کے بعد وہ احسن سے بات کرنے لگے تھے، پتا نہیں انہوں نے اس سے کیا کہا پھر اس کے پاس آئے تو بہت خاموش سے تھے۔ تمام راستہ اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ گھر آ کر بھی بس اتنا کہا۔

’’تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے بیٹا۔ بے کار کی سوچوں سے ذہن پر زور نہیں ڈالنا۔ او کے۔‘‘ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اُسی کمرے میں چلی آئی جو کبھی اس کا تھا۔ کچھ دیر تک تو بالکل خالی الذہن سی رہی پھر کتنی بہت ساری باتیں تھیں، وہ کوشش بھی کرتی تو دامن نہیں بچا سکتی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ بہت آزردہ رہنے لگی تھی۔ ہر وقت ذہن متضاد سوچوں میں گھرا رہتا۔ اس لیے کہ ایک دم سے تنہا بھی ہو گئی تھی۔ اتنے بہت سارے دنوں میں احسن صرف ایک بار آیا تھا۔ کچھ دیر ڈیڈی کے پاس بیٹھا اور پھر جاتے ہوئے بس کھڑے کھڑے اس کا احوال پوچھ کر چلا گیا تھا۔ ویسے اُسے اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں اب اُن دونوں کا ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ پھر زارا اُن دنوں اپنے بچے میں مصروف تھی جب ہی اس کے پاس نہیں آ سکتی تھی، بس گاہے بگاہے فون پر اس کی خیریت دریافت کر لیتی۔ جبکہ ڈیڈی کی وہی روٹین تھی۔ رات کے کھانے پر ہی سامنا ہوتا اور اس دوران وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر لیتے۔ جبکہ حقیقتاً اُسے کسی ہمدرد و غمگسار کی ضرورت تھی۔ اور ایسا کوئی نہیں تھا کہ جس سے وہ اپنے اندر کا احوال کہہ سکتی۔ چپ چاپ ایک اَن دیکھی آگ میں سلگ رہی تھی جس سے اس کی صحت بجائے ٹھیک ہونے کے مزید متاثر ہو رہی تھی۔ زرد رنگت، آنکھوں کے گرد حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ اس روز زارا آئی تو اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

’’یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ کیوں ظلم کر رہی ہو خود پر؟‘‘

’’میں ظلم کر رہی ہوں؟‘‘ اس کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔

’’تو اور کیا۔ ایک ایسے شخص کا روگ پال لینا جو تمہارے ساتھ تو کیا کسی کے ساتھ بھی فیئر نہیں تھا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔‘‘

’’کس کی بات کر رہی ہو؟‘‘ اُس نے چونک کر پوچھا تو زارا نفرت سے بولی۔

’’جازی کی۔‘‘ وہ ایک دم گم صم ہو گئی۔ تب زارا اُس پر بگڑنے لگی۔

’’تم احسن کے ساتھ بہت زیادتی کر رہی ہو۔ اور یہ اس کی شرافت ہے کہ وہ اب تک خاموش ہے ورنہ اس

کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو تمہاری زندگی عذاب بنا دیتا۔‘‘

’’اور زندگی عذاب کیسے بنتی ہے زارا۔‘‘ وہ بے حد دکھ سے بولی۔ ’’مجھ سے پوچھو ہر پل جیتی ہر پل مرتی ہوں۔ کوئی میرا پُرسانِ حال نہیں اور احسن جسے تم شریف آدمی کہہ رہی ہو۔ قاتل ہے وہ۔ میرے سامنے اُس نے جازی کو مارا ہے۔ مارنا ہی تھا تو مجھے مارتا کیونکہ میں چل کر اُس کے پاس گئی تھی۔ وہ نہیں آیا تھا۔ لیکن واہ احسن داد دینی پڑے گی کہ ایک تیر سے دو شکار کھیل گیا۔ اس کی جان لی اور مجھے لمحے لمحے کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ کوئی اُس سے پوچھنے والا بھی نہیں۔‘‘

’’کون پوچھ سکتا ہے اس سے۔ وہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا اور اُس نے اپنا فرض نبھایا ہے۔‘‘

’’جازی کو مارنے کا فرض۔‘‘ وہ استہزائیہ ہنسی اور زارا بڑے اطمینان سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

’’ہاں۔ کیونکہ اُسے دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم تھا۔‘‘

’’کیوں۔؟‘‘ وہ حیران ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت زارا کو ہوئی۔

’’رملہ۔ کیا واقعی تم اتنی بے خبر ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جاذب گیلانی ایک دہشت گرد تھا۔ کتنے بے گناہ لوگوں کے قتل میں ملوث۔‘‘

’’کیا۔‘‘ وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ جبکہ زارا اپنی کہے جا رہی تھی۔

’’ہمارا تو خیال تھا تم اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہو گی۔ اور احسن کو زیادہ دکھ اسی بات کا ہے کہ تم جانتے بوجھتے آگ سے کھیل رہی ہو۔‘‘ اور جس طرح وہ اچانک سناٹے میں آئی تھی، اسی طرح ایک دم ہوش میں آ کر چیخ پڑی۔

’’نہیں زارا مجھے جانتے بوجھتے آگ میں دھکیلا گیا۔ میں بے خبر تھی لیکن تم سب جانتے تھے۔ تم ڈیڈی، احسن لیکن تم سب نے مجھے تنہا کر دیا، میرا اعتبار نہیں کیا تم لوگوں نے ورنہ اس طرح مجھ سے اُس کی اصلیت نہ چھپاتے۔‘‘ وہ چیختے چیختے رو پڑی جس سے زارا جھنجلا کر بولی۔

’’پاگل مت بنو۔ بند کرو رونا۔ پتا ہے تمہارے لیے چیخنا چلانا اور رونا کتنا نقصان دہ ہے۔ ماں بننے والی ہو تم۔ اپنا نہیں تو اپنے۔ بچے کا خیال کرو۔‘‘ وہ اور شدت سے رونے لگی اور اسی طرح اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی دل میں انجانا سا درد کروٹیں لینے لگا تھا جو اُس کے دکھ کو مزید بڑھا گیا۔ اور المیہ تو یہ تھا کہ کوئی اس کا دکھ نہیں جانتا تھا سب اُسے جازی سے منسوب کرتے تھے۔

....

ناشتے کی ٹیبل پر ڈیڈی حسبِ عادت ناشتا کرنے کے ساتھ اخبار دیکھنے میں مصروف تھے۔ معاً کچھ یاد آنے پر اخبار ایک طرف رکھ کر اس سے کہنے لگے۔

’’بیٹا! تمہاری چچی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ اگر ہو سکے تو دن میں کسی وقت جا کر انہیں دیکھ آؤ۔‘‘ وہ کچھ نہیں بولی تب کچھ دیر بعد خود ہی کہنے لگے۔

''نہیں۔ میرا خیال ہے، تم نہیں جاؤ۔ بس فون پر خیریت دریافت کرلینا۔'' اب کے اس نے اثبا
میں سر ہلا دیا۔ پھر ان کے جاتے ہی اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ اُسے کبھی اخبار پڑھنے یا خبروں وغیرہ سے دلچسپی نہ
رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے وہ اتنی بے خبر تھی اب جانے کیا کچھ جاننا چاہتی تھی۔ جبھی وہیں۔ بیٹھے بیٹھے پورا اخ
کھنگال ڈالا۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر آئی تو پرانے اخبار تلاش کرنے لگی۔ کچھ ڈیڈی کے کمرے سے ملے،
ڈائننگ روم میں ریک پر رکھے تھے۔ وہ سب سمیٹ کر اپنے کمرے میں لے آئی تو پہلے تاریخوں کے حساب
سے سب کو ترتیب سے رکھا پھر ایک کے بعد ایک دیکھنے لگی۔ چار ماہ پہلے کی تاریخ میں اُسے جاذب گیلانی کا نا
نظر آیا۔ اُسے دہشت گردی میں ملوث لکھا گیا تھا۔ وہ جلدی جلدی دوسرے اخبار دیکھنے لگی۔ کسی میں قاتل تھا
کہیں اُس کے فرار کی خبر تھی۔ اور آخر میں وہ ایس پی کی گاڑی پر قابض ہو کر اُس میں بھاری اسلحہ لے کر جا
تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اُسے ان ساری خبروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ وہ اس کا موازنہ اس جازی سے کر رہی تھی
جسے وہ جانتی تھی۔

تقریباً تین سال پہلے وہ اس سے ملی تھی اور پہلی نظر میں ہی وہ اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وجیہ شخصیت
کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ بھی بہت دل نشین تھا۔ رفتہ رفتہ جب ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو وہ اس کے
گھر بھی جانے لگی تھی اور اس تمام عرصے میں اُسے نہیں یاد کہ کبھی اُس نے اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات
ہو۔ بہر حال وہ بظاہر اتنا شائستہ اور مہذب شخص اور حقیقت اتنے گھناؤنے کردار کا مالک تھا۔ وہ یقین کر بھی رہ
تھی اور نہیں بھی۔

صبح سے دوپہر ہوگئی۔ وہ اس سے متعلق ایک ایک خبر کو کئی کئی بار پڑھ چکی تھی۔ کبھی اخبار ایک طرف رکھ دی
پھر کچھ دیر بعد دوبارہ اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ آیا دوپہر کے کھانے کے لیے بلانے آئی تو اس نے منع کر دیا
پھر سارے اخبار سمیٹ رہی تھی کہ احسن آ گیا۔ وہ اتنی مگن تھی کہ اُس کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اور وہ اس کے
سامنے اتنے سارے اخبار دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے۔ قریب آیا تو اتفاق سے اس کے ہاتھ میں سب
سے اوپر اخبار پر جاذب گیلانی کی تصویر بھی تھی، جسے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر سلگ کر بولا۔

''تم ابھی تک اس کا سوگ منا رہی ہو۔'' وہ اس کی آواز پر واقعی چونکی لیکن پھر نظر انداز کر کے اپنے کام میں
مصروف ہوگئی۔ تو اُس کا ضبط جواب دے گیا۔ سارے اخبار اُٹھا کر ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

''تم اتنی بدذات عورت ہو کہ مجھے تم سے گھن آنے لگی ہے۔ اخلاق، قانون، مذہب، تمہاری نظر میں کسی کی
کوئی اہمیت نہیں، جانتی ہو تم جیسی عورتوں کے لیے ہی سنگساری لکھی گئی ہے۔''

''جانتی ہوں۔'' وہ تکیے سے کمر لگاتے ہوئے دھیرج سے بولی۔ ''لیکن یہ نہیں جانتی کہ تم مردوں کو کیا کہا گیا
ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دیکھو احسن! میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میرے پاس آنے یا مجھ سے کسی بھی بات کا جواب طلب کرنے

سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک لینا۔'' اُس کے اتنے آرام سے بات کرنے پر وہ ایک پل کو ٹھٹکا پھر ناگواری
سے بولا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے، اپنے گریبان میں جھانکنے کی۔ کیا کیا ہے میں نے؟''

''ارے۔'' وہ ذرا سا ہنسی۔ ''تم تو بہت بزدل نکلے۔ اس کا مطلب ہے، اپنی کہی ہر بات سے بھی انکار کرو
گے، جبکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میں ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والی معصوم سی لڑکی ہوں۔ تمہیں مجھ پر
رحم آتا ہے۔'' اُس کے الفاظ دہرا کر اس نے تصدیق کے لیے اُس کی طرف دیکھا تو وہ کچھ کہتے کہتے جانے
کیوں ہونٹ بھینچ گیا۔ جبکہ پیشانی پر لکیریں نمودار ہوگئی تھیں، تب وہ اچانک بے پناہ آزردگیوں میں گھر کر کہنے
لگی۔

''ہاں، میں بہت سادہ، معصوم اور نادان سی لڑکی تھی۔ پھر ڈیڈی کے بے جا لاڈ پیار نے مجھے قدرے ضدی
اور خودسر بھی بنا دیا تھا۔ اگر ممی زندہ ہوتیں تو شاید شروع ہی میں مجھے کنٹرول کرتیں۔ جبکہ ڈیڈی سمجھ نہیں پائے۔
غالباً انہوں نے سوچا ہوگا۔ بچیاں کسی بھی طرح سہی، خوش رہیں اور ممی کی کمی محسوس نہ کریں۔ زارا سمجھدار تھی اور
میں نادان، یہ بھی جانتے تھے۔ اس کے باوجود کسی نے مجھے اپنی انگلی نہیں تھمائی، پھر لڑکپن کی عمر سے نکل کر غالباً
زارا کو احساس ہوا تو وہ بات بے بات مجھے ٹوکنے لگی۔ اور وہ عمر تو ایسی ہی تھی۔ ٹوکنا نہ صرف برا لگتا بلکہ میرے
اندر مزید ضد پیدا کر دیتا۔ پھر مجھے ڈیڈی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ جبھی میں زارا کی مخالف سمت چلنے لگی۔ لیکن یہ
بھی ہے کہ اگر زارا ہمیشہ ٹوکنے کے بجائے کبھی آرام سے سمجھانے کی کوشش کرتی تو شاید میں اس کی باتیں سمجھ
لیتی۔ لیکن اس کا انداز ہمیشہ جارحانہ رہا۔ پھر وہ مجھ سے کوئی بہت بڑی بھی نہیں تھی اور اس کی دنیا بھی گھر تک
محدود تھی۔ جبکہ میری دلچسپیاں گھر سے باہر جبھی میرا خیال تھا میں اس سے زیادہ بہتر سوچ اور سمجھ سکتی ہوں اور میں
اُسے جتاتی بھی تھی۔ جس سے وہ اور زیادہ مجھ سے اُلجھنے لگتی۔ تم ہی کہو کیا یہ رویہ مناسب تھا؟'' وہ اچانک اُس
سے پوچھنے لگی۔ اور اُس کے انداز میں انتہائی ناگواری تھی۔ جیسے اس کی کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اور اُس
نے تو ابھی ابتدا کی تھی۔ کچھ دیر اُسے دیکھتے رہنے کے بعد کہنے لگی۔

''بہر حال پھر جازی میری زندگی میں آیا۔ اُس وقت میں کچی عمر، کچے ذہن کی نادان لڑکی تھی، بقول
تمہارے چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والی اور جازی تو بظاہر سونے سے بھی زیادہ کوئی اور ہی چیز نظر آتا تھا۔ پھر مجھ جیسی
نادان لڑکی اُس سے متاثر کیسے نہ ہوتی۔ اور بدلے میں اس کی محبت پا کر تو میں ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔ کسی بھی
محفل میں جب وہ سب کو نظر انداز کر کے میری طرف لپکتا تو فخر و انبساط سے میری گردن تن جاتی۔ اور میں سمجھتی
ہوں یہ کوئی انہونی تو نہیں تھی نہ ہی اُسے پسند کر کے میں نے کوئی خطا کی تھی۔ کیونکہ چاہنے اور چاہے جانے کی
خواہش تو سبھی رکھتے ہیں، یہ فطری جذبے ہیں، یہ الگ بات کہ کہیں ان جذبوں کو طاقت کے زور پر دبانے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ مجھ پر تو کوئی پابندی نہیں تھی۔ ڈیڈی کی طرف سے مجھے پوری آزادی حاصل تھی۔ اور
اگر میں نے اس آزادی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ تو اس کا کریڈٹ مجھے نہیں جازی کو جاتا ہے۔ میں پوری

ایمانداری سے کہوں گی کہ اس نے ہر قدم پر میری راہنمائی کی۔ تمہاری نظر میں وہ مجرم، قاتل، دہشت گرد ہو لیکن میرے ساتھ وہ بہر حال فیئر تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بڑے آرام سے مجھے میرے اپنوں کے خلاف اُکسا سکتا تھا۔ اُس وقت جب ڈیڈی نے اُسے ریجکیٹ کیا۔ اگر وہ چاہتا تو مجھے غلط ترغیب دے سکتا تھا۔ کیونکہ ایک تو میں نادان تھی دوسرے اس وقت اُس کی محبت میں اتنی پاگل کہ اُس کے اشارے پر دنیا چھوڑ سکتی تھی۔ یہ حقیقت ہے احسن! اگر وہ کہتا تو میں اس وقت اس کے ساتھ کورٹ میرج پر بھی تیار ہو جاتی۔ لیکن اُس نے تو مجھے احتجاج تک سے منع کر دیا۔ اور بہت عاجزی سے درخواست کی کہ میں ڈیڈی کی بات مان لوں۔ بہر حال میں نے اس کے کہنے پر ڈیڈی کی بات مان لی اور جب میں نے زارا سے اُسے ریجکیٹ کرنے کا سبب پوچھا تو اس نے صرف کہا کہ ڈیڈی اُس کے بزنس سے مطمئن نہیں ہیں۔ گویا ڈیڈی، زارا اور تم اُسی وقت جان چکے تھے کہ وہ کسی گھناؤنے پیشے سے منسلک ہے۔ لیکن تم میں سے کسی نے مجھے نہیں بتایا۔ اس کا مطلب ہے، کسی کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ نہ اعتماد نہ بھروسا۔ آخر کیوں؟ مجھ سے اس کی حقیقت کیوں چھپائی گئی؟'' وہ پھر اس کی طرف سوالیہ انداز میں متوجہ ہوئی تو وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر بولا۔

''کیا فائدہ تھا تمہیں حقیقت بتانے کا، کون سا تم یقین کر لیتیں!''

''کب تک؟ کب تک یقین نہ کرتی، وہی ایک وقت تو نہیں تھا، بعد میں دھیرے دھیرے میری غفلت کے پردے ہٹائے جا سکتے تھے۔ لیکن تم لوگوں نے مجھے غافل رکھ کر میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔''

''کیا میں نے بھی؟''

''ہاں تم نے بھی بلکہ سب سے زیادہ قصوروار تم ہی ہو احسن!'' وہ تیکھی نظریں براہِ راست اس کی آنکھوں میں ڈال کر بولی۔

''اس لیے کہ تم ہی اس کی انکوائری کر رہے تھے۔ نہ صرف مجھے اس کی حقیقت بتا سکتے بلکہ دکھا بھی سکتے تھے لیکن شاید تمہارا مقصد کچھ اور تھا یعنی تم طاقت سے مجھے زیر کرنا چاہتے تھے۔ اور اس مقام پر میں کہوں گی کہ میں نادان تھی ہی تم نے نادانی کیوں کی۔ بھلا جذبے بھی طاقت سے بھی زیر ہوئے ہیں۔ ان کی سرکشی کے سامنے محبتوں کے بند باندھنے پڑتے ہیں۔ اور تم مجھ سے محبت تو کرتے تھے لیکن مجھے اپنانے کے لیے تم نے محبت نہیں طاقت کا استعمال کیا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''تم جانتے تھے کہ میں تم سے متنفر تھی۔ اس کے باوجود تم نے مجھ سے شادی کرنے میں بہت جلدی کی، کم از کم پہلے میرے دل کے آئینے پر جمی گرد تو چھٹنے دیتے۔ لیکن تم نے انتظار نہیں کیا۔ مزید ستم یہ کہ مجھے توڑنے کے درپے بھی ہو گئے۔ یاد کرو اپنا رویہ، اوّل شب سے آج تک، میری اندھیری راہوں میں کوئی ایک جگنو تمہارے نام کا نہیں ہے۔ تم نے مجھے بیوی کم باندی زیادہ سمجھا۔''

''نہیں۔'' وہ جھٹلانا چاہتا تھا لیکن وہ فوراً بول پڑی۔

یا نہیں۔ ذ ی ن ے گھر میں میری حیثیت سے قطع نظر یہ بتاؤ تم نے اپنی حیثیت کے مطابق مجھے کیا دیا

ایسے گئے گزرے تو نہیں تھے تم۔ پھر بھی تم نے مجھے اپنے گھر کے لیے وقف کر دیا۔ وہ سارے کام جو تم جانتے تھے کہ میں نہیں کر سکتی وہ بھی مجھ سے کروائے، یوں لگتا تھا جیسے تم مجھے اسی مقصد سے لے گئے ہو۔ انتقاماً اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے اور اس مقام پر کسی نے میری بات نہیں سنی۔ ڈیڈی سے کہا تو وہ اُلٹا مجھے سمجھانے لگے۔ زارا کا بھی وہی انداز تھا۔ اور مجھے لگا جیسے میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں۔ اور کیا یہ فطری بات نہیں ہے کہ تنہا ہو کر انسان اچھے دنوں کو یاد کرتا ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو کیا خطا کی۔ یہ تمہاری بھول تھی جو تم نے یہ سمجھ لیا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھ کر ماضی سے دور لے آؤ گے۔ جبکہ تمہاری بخشی ہوئی مصروفیات نے ہی میرے اندر ماضی کو دوبارہ سے زندہ کر دیا تھا۔ میں ہر پل یہ سوچنے لگی۔ کہ اگر تم درمیان میں نہ آتے تو میں کتنی مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہی ہوتی۔ اور تمہارے تلخ رویے پر مجھے کسی کا شہد آگیں لہجہ یاد آتا۔ اس کے برعکس اگر تم مجھے اس کی اصلیت بتا چکے ہوتے تو میں نہ صرف یہ کہ کبھی اپنے ماضی میں جھانکنا گوارا نہ کرتی۔ بلکہ اس پر شرمندہ بھی ہوتی۔'' اس کی آواز آپ ہی آپ مدہم ہو گئی۔ تو کچھ دیر خاموش ہو کر غالباً اُس نے اپنے آپ کو سہارا دیا۔ پھر بھی جب بولی تو اس کے لہجے میں دکھ اور تاسف کی ملی جلی آمیزش تھی۔

''ابھی تم نے مجھے بدذات عورت کہا۔ اور یہ کہ میرے لیے سنگساری لکھی گئی ہے تو احسن کمال یہ جو میں نے اپنے بارے میں اتنا کچھ کہا تو مقصد تمہاری اسی بات کا جواب دینا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ عورتیں بدذات ہو کر اپنے لیے سنگساری کیوں لکھواتی ہیں۔ اُس وقت جب انہیں اپنے گھر میں اپنا مرد روٹی کپڑا تو دیتا ہے لیکن اُن کی جھولی میں محبت اور توجہ کی خیرات ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ جبکہ بحیثیت انسان صرف پیٹ ہی روٹی نہیں مانگتا باقی سارے اعضا بھی اپنا حق مانگتے ہیں۔ تم ہی کہو اگر آنکھوں کے سامنے مستقل ایک ہی منظر ٹھہر جائے تو کیا نظریں زاویہ نہیں بدلتیں۔ اسی طرح مرد کے چہرے پر مستقل کرختگی دیکھ کر عورت نظریں بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ پھر کان بری کے ساتھ بھلی بھی سننا چاہتے ہیں۔ اور دل ہمیشہ اندیشوں ہی میں کیوں دھڑکے کوئی خوشگوار احساس بھی تو ملنا چاہیے۔ وہ بھی انسان ہوتی ہے۔ کبھی بے سبب ہنسنے اور کبھی بے سبب رونے کی فطری خواہش اس کے اندر بھی چمکتی ہے اور اگر ایسے میں اس کا اپنا مرد ہی ساتھ نہ دے تو پھر کبھی قصداً اور کبھی انجانے میں اپنے لیے سنگساری وہ خود لکھواتی ہے۔ لیکن میں دعوے سے کہوں گی کہ اس کا ذمہ دار اس کا اپنا مرد ہوتا ہے، جو مجازی خدا کے بجائے اس پر خدا بن بیٹھتا ہے۔ اب بتاؤ خطاوار کون ہے میں یا تم۔'' وہ ایک دم سناٹے میں آ گیا تھا جواب کیا دیتا اور وہ قدرے توقف سے پھر کہنے لگی۔

''پھر اُس وقت جب میں ہر طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔ اور تمہارے رویے سے دل برداشتہ ہو کر بیمار بھی تھی۔ تم دیکھ رہے تھے، اس کے باوجود تم نے میرا خیال نہیں کیا۔ اور اُس روز ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے میری جاذب گیلانی سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اور اس وقت جب میں مایوسی کی انتہاؤں پہ کھڑی تھی۔ وہی تھا جو مجھے دوبارہ زندگی کی طرف لایا۔ میں صاف گوئی سے اعتراف کروں گی کہ اس روز میں اس کے سامنے بہت روئی تھی۔ اور اگر وہ چاہتا وہ اس وقت بھی مجھے تم سے مزید متنفر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس اس نے مجھے سمجھایا ایسے

انداز میں جو ڈیڈی اور زارا کو اپنانا چاہیے تھا۔ بہرحال یہاں بھی اس نے بھلائی کے ساتھ میری راہنمائی کی۔ پھر میں اُسے اپنا ہمدرد، غمگسار کیسے نہ جانتی۔ اور بقول تمہارے تم اسی روز میری طرف سے چوکنا ہوگئے تھے۔ حیرت ہے۔'' وہ تاسف سے ذرا سا ہنسی۔

''یعنی تم نے جان لیا تھا کہ میں جازی سے ملی ہوں، اس کے باوجود نہ تم نے مجھ سے پوچھا نہ روکا۔ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ دہشت گردی میں ملوث ہے پھر بھی۔'' وہ کتنی دیر حیرت میں گھری رہی اُسے دیکھتی رہی پھر جیسے اُس کے بعد اُسے بہت ساری باتیں اب اچانک سمجھ میں آئی ہوں۔

''اب میں سمجھی کہ اس وقت بھی تم نے مجھے اس کی حقیقت کیوں نہیں بتائی اور مجھے دوبارہ اس سے ملنے سے روکا کیوں نہیں۔ میرے خدا احسن کمال کیا تم نے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا؟''

''نہیں۔'' وہ اس کی بات پر ایک دم ہوش میں آ کر بولا۔ ''میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کس حد تک گر سکتی ہو۔!''

''بس کرو، مت اپنی کمزوریاں میرے کھاتے میں ڈالو، میں اب ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والی نادان لڑکی نہیں ہوں اور پھر تم ہی نے کہا تھا کہ کاش میں تمہیں پہچان کی منزل تک لے جاتا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ سار مسافتیں تم خود طے کرو تو احسن کمال میں ساری مسافتیں طے کر آئی ہوں اور اس مقام پر جہاں مجھے جازی ا حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ وہاں تمہارا کردار بھی صاف نظر آ رہا ہے۔ تم سطحی سوچ رکھنے والے عام سے مرد، ابھ بھی یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے سامنے روؤں، گڑگڑاؤں تم سے معافیاں مانگوں اور پھر تمہاری عظمت کا اعترف کروں کہ تم بہت عظیم انسان ہو جو میری کوتاہیاں نظر انداز کر کے مجھے اپنا رہے ہو۔ نہیں احسن اگر تمہیں واقعی عظیم بننا ہے تو اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرو۔ مان لو کہ مجھے سنگساری کے راستے پر ڈالنے والے تم ہو۔''

''میں!'' اپنی طرف اشارہ کر کے وہ یوں بولا، جیسے پتا نہیں اُس نے کیا کہہ دیا ہو۔ گویا یہ کڑوا سچ اُسے ہضم نہیں ہوا تھا۔ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''تمہاری دماغی حالت پر پہلے تو مجھے شبہ تھا لیکن اب یقین ہوگیا ہے کہ تم واقعی پاگل ہوگئی ہو۔''

''اچھا!'' وہ استہزائیہ ہنسی۔ ''کیا لینے آئے ہو اس پاگل عورت کے پاس۔؟''

''میں کچھ لینے نہیں بلکہ دینے آیا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری طرف سے پہلی طلاق ہے۔ دوسری اور تیسری سے پہلے تمہیں سوچنے کو وقت دے رہا ہوں۔ اگر اپنے ماضی کو دفن کر سکو تو اُسے ضائع کر دینا ورنہ تو میں فیصلہ کر چکا ہوں۔''

''سنو!'' وہ اپنی بات کہہ کر جانے لگا تو اُس نے پکار لیا۔ ''کیوں وقت ضائع کرتے ہو۔ فیصلہ تو ابھی بھی ہوسکتا ہے۔''

''گویا تم!'' وہ اسی قدر کہہ پایا تھا کہ وہ ٹوک کر بولی۔

''صرف میری نہیں تم اپنی بات بھی کرو، میرا مطلب ہے جس طرح میں نے اپنی نادانیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا ہے، اسی طرح تم بھی اعتراف کرتے ہوئے یہ تسلیم کرلو کہ قصوروار صرف میں نہیں تم بھی ہو، تو میں تمہاری خواہش کے مطابق خود کو ڈھالنے کا وعدہ کرلوں گی ورنہ تو تم فیصلہ کر ہی چکے ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں یہ اعتراف کرلوں کہ تمہیں جاذب گیلانی سے ملنے کی ترغیب میں نے دی تھی۔''

وہ جانے کیوں بھڑک اُٹھا۔

''میں نے کہا تھا کہ اس کے سامنے جا کر آنسو بہاؤ اور یہ بھی میں نے کہا تھا کہ اُسے اسلحے سمیت میری گاڑی میں ہائی وے کراس کرادو۔''

''تم نے کہا نہیں تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے پس منظر میں تو تم ہی تم تھے۔''

''شٹ اَپ'' اُس کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ تلملا کر بولا اور پھر پیر پٹختے ہوئے چلا گیا تو وہ کچھ دیر تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی پھر بیڈ کی پٹی سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔



کتنے بہت سارے دن احسن کمال اُس کی باتوں کو سوچتا اور جھنجھلاتا رہا۔ وہ ہرگز بھی اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ یہ اس کا حوصلہ ہے جو وہ اُسے اس کی تمام تر بدتمیزیوں سمیت برداشت کرتا رہا ہے۔ اور ابھی بھی وہ اُسے قبول کر کے گویا اس پر احسان کر رہا ہے۔ اور وہ بجائے اس کی ممنون ہونے کے اُلٹا اُسے اپنے جرم میں برابر کی شریک ٹھہرا رہی ہے۔ بہرحال ان ساری باتوں کے باوجود بھی وہ اُسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ واقعی ماضی کو یکسر فراموش کر کے نئے سرے سے اس کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرے۔ اور جانے کیوں اُسے یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی، جبھی وہ اُسے اپنے تئیں پہلی طلاق دے کر گویا جبراً سوچنے پر مجبور کر آیا تھا۔ کیونکہ اُس کے خیال میں جہاں مرد کی زبان پر طلاق کا لفظ آتا ہے عورت کی ساری سرکشی دم توڑ جاتی ہے بلکہ اپنے بہت سارے حقوق تک سے دستبرداری کا وعدہ کرلیتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر قیمت پر اپنا گھر بچانا چاہتی ہے۔ پھر رملہ اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ اس لیے بھی وہ مطمئن تھا کہ اگر اپنے لیے نہیں تو آنے والے بچے کی خاطر ہی وہ نہ صرف سوچنے پر مجبور ہوگی بلکہ اس کے سامنے جھک بھی جائے گی۔ گویا رملہ نے اس کے بارے میں صحیح کہا تھا کہ وہ سطحی سوچ رکھنے والا عام سا مرد ہے۔ مجازی خدا سے خدا بننے کی کوشش میں معروف ورنہ جس طرح اس نے اُسے آئینہ دکھایا تھا اُس سے کم از کم وہ ایک بار تو غیر جانب داری سے اپنا محاسبہ کرتا۔ لیکن اُسے مرد اور پھر مجازی خدا ہونے کا زعم تھا۔ اپنی ہر بات ہر عمل صحیح اور وہ سراپا غلطی۔ بہرحال اُسے پہلی طلاق دینے کے بعد وہ شدت سے منتظر بھی تھا کہ اس کی طرف سے کوئی پیش رفت ضرور ہوگی۔ امی کو بھی اس نے یقین دلایا تھا کہ دوسری طلاق کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ یہ بھی کہا کہ اُس کا دماغ درست کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ امی اس کے اس اقدام کے حق میں نہیں تھیں۔ آخر تک منع کرتی رہیں کہ وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے۔ اور اب کتنے بہت سے دن گزر گئے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق جب رملہ نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو امی پریشان ہوگئیں۔ اور اندر ہی اندر متوحش تو وہ بھی تھا

لیکن بظاہر بہت مطمئن نظر آتا تھا۔ اور اُسے اتنے اطمینان سے دیکھ کر ہی اُس روز امی اس پر بگڑنے لگیں۔

"آخر تم اتنے مطمئن...... کیسے ہو؟ پتا بھی ہے پورے بیس دن ہو گئے ہیں اور ابھی تک رملہ نے فون تک نہیں کیا۔ جبکہ تم نے کہا تھا وہ بہت جلد آجائے گی۔"

"آجائے گی، فکر کیوں کرتی ہیں۔ آخر سوچنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔" اس نے ابھی بھی اپنی تشویش ظاہر نہیں ہونے دی بلکہ امی کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ لیکن اب وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

"میرے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں آج خود ہی بھائی صاحب کے پاس جاتی ہوں۔ وہ ناراض تو ہوں گے لیکن۔"

"نہیں امی!" وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ "آپ کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر خود ہی جا کر لے آؤ رملہ کو!"

"وہ آنا چاہے تب ناں!"

"کیا کہتی ہے؟" اس نئی بات پر امی کو اچنبھا ہوا۔

"دماغ خراب ہے اُس کا۔ سارا الزام میرے سر رکھتی ہے۔ کہتی ہے میں نے اُسے اپنے گھر میں کوئی خوشی نہیں دی۔ اُس کا خیال نہیں رکھا۔ اُسے باندی سمجھا اور اُسے اس حال کو پہنچانے والا بھی میں ہوں۔"

"غلط تو نہیں کہتی۔" اُس کی پوری بات سن کر امی پُرسوچ انداز میں بولیں تو وہ اپنی جگہ اُچھل پڑا۔

"کیا۔ یعنی آپ بھی اس کی طرف داری کر رہی ہیں؟"

"ناجائز طرفداری نہیں کر رہی۔"

"بس رہنے دیں۔ اسی سے تو اس کا دماغ زیادہ خراب ہوا ہے۔" وہ کہتے ہوئے اُن کے پاس سے اٹھ گیا پھر جاتے جاتے رُک کر بولا۔ "بہر حال آپ اُس کے پاس جانے کا سوچیے گا بھی نہیں۔"

"تم نے مجھے وہاں جانے کے قابل چھوڑا بھی ہے؟" امی کو غصے میں آتے دیکھ کر اُس نے وہاں سے بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

پھر جس روز وہ دوسری طلاق کا لفافہ جیب میں ڈال کر اس کے پاس گیا تو اُسے یقین تھا کہ یہ اُسے دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سخت سردیوں کے دن تھے۔ اور وہ اس وقت دھوپ میں بیٹھی تھی۔ بھرے بھرے بدن پر گرم شال بے ترتیبی سے پڑی تھی جسے اُسے دیکھتے ہی اُس نے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی۔ پھر پوچھنے لگی۔

"کیسے آئے؟" اور اسے غالباً اس بے مروتی کی توقع نہیں تھی جبھی پہلے ٹپٹایا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

"پہلے، بیٹھنے کو تو کہو، پھر آمد کا مقصد پوچھنا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" اس کی بے نیازی میں فرق نہیں آیا، بلکہ اُسے بیٹھنے کا کہہ کر گھڑی دیکھنے لگی۔ تو اسے کہنا پڑا۔

"زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"میرے پاس زیادہ وقت ہے بھی نہیں، کیونکہ ابھی زارا آنے والی ہے۔ اور مجھے اس کے ساتھ ہاسپٹل جانا

ہے۔" وہ اس کی بات سن کر ٹھٹکا اور پھر اس کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ اُس کے چہرے پر قدرے بے چینی کے آثار تھے۔ جس سے سمجھ کر وہ کہنے لگا۔

"اگر زارا کو آنے میں دیر ہے تو چلو میں لے چلتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ اجنبیت کا لبادہ اوڑھ کر بولی۔ "تم اپنی کہو۔"

"کیا کہوں۔ میرا مطلب ہے، یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"میری فکر نہیں کرو، میں ٹھیک ہوں۔" وہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ اندر ہی اندر جھنجھلانے لگا۔ کیونکہ وہ اس کی سوچ کے بالکل برعکس نظر آرہی تھی۔ تب بمشکل خود پر قابو پا کر پوچھنے لگا۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"میرے ساتھ رہنے کے بارے میں، اور جیسا کہ میں کہہ گیا تھا کہ تمہیں اپنے ماضی کو یکسر فراموش کرنا ہوگا۔ تو اس سلسلے میں تم کس حد تک کامیاب ہوئی ہو۔" وہ توجہ سے اس کی پوری بات سن کر کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اُسے دیکھے گئی، پھر کہنے لگی۔

"میری کامیابی اور ناکامی کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو، کیونکہ یہ طے ہے کہ جب تک تم یہ اعتراف نہیں کرو گے کہ میرے ساتھ ساتھ تم بھی قصوروار ہو تب تک میں کچھ نہیں سوچوں گی۔"

"یہ محض تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی ہے رملہ جو تم مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کر رہی ہو، دوسرے لفظوں میں تم مجھے بے غیرتی کا طعنہ دینا چاہتی ہو۔ نہیں رملہ ایک یہی گالی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ورنہ جاذب گیلانی کے ساتھ ایک گولی تمہارے سینے میں اتارنا میرے لیے کیا مشکل تھا۔ گو کہ غیرت کا تقاضا یہی تھا۔ لیکن اس کے بعد جو افسانے بنتے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔" وہ بُری طرح تلملا کر بولا۔ جبکہ وہ اتنے ہی آرام سے بولی۔

"غیرت مند ہونا اور غیرت کا ڈھنڈورا پیٹنے میں فرق ہے احسن تم لوگوں کے سامنے سرخرو ہو گئے۔ جبکہ میرے سامنے تو تمہیں اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔!"

"اور اور میں ایسا نہ کروں تب!"

"تب پھر جیب سے لفافہ نکال کر تھما دو مجھے۔"

"تم۔!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے۔ وہ لڑکی جو کچھ وقت پہلے تک اس کی نظر میں واقعی نادان تھی۔ اب ساری مسافتیں طے کر کے اس مقام تک آگئی تھی کہ اُسے چیلنج کر رہی تھی۔ تب طنز آمیز لہجے میں بولا۔

"صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتیں اپنے لیے کوئی اور راستہ تلاش کر چکی ہو۔ تم جیسی عورت۔"

"بس کرو احسن!" وہ اچانک چیخ پڑی۔ "میں اب مزید تمہیں اپنے بارے میں گھٹیا الفاظ کہنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔ اب تم جا سکتے ہو اور آئندہ میرے پاس آنے سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا۔"

"میں آؤں گا تب ناں!" اس کے ساتھ ہی جیب سے لفافہ نکال کر انتہائی غصے کے عالم میں اُس کے منہ پر پھینک کر چلا گیا۔ اُس نے بے حد تاسف سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا پھر جھک کر لفافہ اٹھا رہی تھی کہ کمر میں درد کی شدید لہر نے اُسے دوہرا کر دیا۔ بمشکل خود کو سہارا دے کر کھڑی ہوئی اور آیا اماں کو پکار کر زارا کو فون کرنے کا کہہ رہی تھی کہ اسی وقت زارا آ گئی۔

"جلدی چلو زارا! مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ اُسے دیکھتے ہی بولی۔

"ہاں چلو، تم گاڑی میں بیٹھو، میں سامان لے کر آتی ہوں۔"

"یہ باسکٹ یہیں رکھی ہے۔ دیکھ لو سب ٹھیک ہے ناں۔" وہ کہتے ہوئے باہر آ گئی کچھ دیر بعد زارا باسکٹ لیے ہوئے آئی تو وہ پچھلی نشست پر نڈھال سی تھی۔ تب زارا نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اور منٹ کا فاصلہ دس منٹ میں طے کر لیا۔

پھر کوئی گھنٹے بھر بعد اُس نے ایک خوبصورت صحت مند بیٹے کو جنم دیا۔ لیکن اُس کی اپنی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔ غالباً گزشتہ کئی مہینوں سے مسلسل ٹینشن میں رہنے کے سبب، مایوسی اور تنہائی جس نے اُسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ زارا اکیلی اس صورتِ حال کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اُسے کسی وقت خون کی ضرورت بھی پڑ سکتی تھی۔ اور اس کے گروپ کا خون کلینک میں موجود نہیں تھا۔ جبھی زارا نے احسن کو فون کر ڈالا۔ اور اس وقت وہ کیونکہ بہن کی طرف سے زیادہ پریشان تھی اس لیے اُسے بچے کا بتانا بھول گئی۔ بس یہی کہہ سکی کہ "رملہ کی حالت بہت تشویشناک ہے تم فوراً ڈاکٹر مریم کے کلینک آ جاؤ۔"

"کیا ہوا ہے اُسے، ابھی کچھ دیر پہلے تو اچھی بھلی تھی۔" وہ اس کی گھبرائی ہوئی آواز سننے کے باوجود پوچھنے لگا۔

"تم نے کہاں دیکھا اُسے؟ گھنٹہ بھر سے تو وہ یہاں ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔"

"بیٹا! کمال ہے، یہ خبر تو تمہیں پہلے سنانی چاہیے تھی۔" وہ ایک دم خوش ہو کر بولا تو وہ زچ ہو کر چیخ پڑی۔

"احسن! تم آ رہے ہو یا میں ڈیڈی کو فون کروں؟"

"آ رہا ہوں، مٹھائی سمیت۔" اگر رملہ کی حالت ایسی نہ ہوتی تو وہ اس سے اور بھی بہت سی چیزوں کا مطالبہ کرتی لیکن اب جلدی سے ریسیور رکھ کر لیبر روم کی طرف بھاگی آئی جہاں ڈاکٹر اس کی منتظر تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"آپریشن ناگزیر ہے، ورنہ زہر پھیل جائے گا۔ تم فوراً خون کا انتظار کرو۔" اُس نے ڈاکٹر کی بات سنتے ہی وہیں سے بے سدھ رملہ پر ایک نظر ڈالی۔ اور تقریباً بھاگتے ہوئے آ کر ڈیڈی کو فون کرنے لگی۔ ایک تو یوں ہی پریشانی تھی دوسرے بھاگنے کی وجہ سے سانس پھول گیا تھا۔ پھر بھی جلدی جلدی ڈیڈی کو رملہ کی کیفیت بتا کر خون

لانے کے لیے کہا۔ اور جب واپس آئی تو رملہ کو آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ نرسیں بھی حرکت میں آ گئی تھیں۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے قدموں کو دیکھنے لگی۔ ساتھ ہی بے آواز قرآنی آیات کا ورد بھی کر رہی تھی۔ پھر پہلے احسن آیا بہت سارے مٹھائی کے ڈبے اٹھائے ہوئے۔ غالباً پورے کلینک میں بانٹنے کا ارادہ تھا۔ اُس کے قریب رُک کر شوخی سے پوچھنے لگا۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟" وہ کچھ بول نہیں سکی۔ بس ذرا سا مڑ کر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ اتنا مگن سا تھا کہ اُسی طرف چل پڑا۔ لیکن چند قدم کے بعد ہی ٹھٹک کر رُکا اور پلٹ کر پوچھنے لگا۔

"تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟" اس بار اُس نے آپریشن تھیٹر کی طرف اشارہ کر دیا تو اس سمت دیکھ کر وہ چونکا۔

"کون؟"

"رملہ!" اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک کر فرش پر بکھر گئے۔ اور اُسے جیسے یقین نہیں آیا، انہی پیروں پلٹ کر غالباً تصدیق کے لیے آپریشن تھیٹر کی طرف جانا چاہتا تھا۔ تبھی سامنے سے ڈیڈی آ گئے۔ پریشان وہ بھی تھے لیکن بہت ضبط سے کام لے رہے تھے۔ پہلے سسٹر کو بلا کر خون کی بوتلیں اُسے تھمائیں پھر زارا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔

"گھبراؤ نہیں بیٹا! اللہ سے دعا کرو۔" اور وہ جس حالت میں کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں مٹھائی کے ڈبے اٹھائے اپنی جگہ کٹ کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا ان سے کچھ چھٹکارا حاصل کرے۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کوئی نہیں تھا۔ تب غیر محسوس طریقے سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور سب وہیں رکھ دیئے۔ اس کے بعد ڈیڈی کے پاس آ کر کہنے لگا۔

"انکل! آپ زارا کو لے کر اِدھر بیٹھ جائیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" ڈیڈی نے منع کر دیا۔ تب وہ آپریشن تھیٹر کی طرف چلا آیا۔ اور ابھی چند قدم اِدھر تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ بس ایک نظر دیکھ سکا۔ زندگی اور موت کے درمیان میں لیٹی وہ لڑکی ایک پل میں اُسے اپنی اہمیت کا احساس دلا گئی تھی۔ اس کے بعد وہ حیران کھڑا تھا۔ اور لمحے چپ چاپ سرکتے جا رہے تھے۔

پھر کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے آ کر زارا کو رملہ کی نئی زندگی کی نوید دی تو وہ بے اختیار ہو کر ڈیڈی کے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی...... ڈیڈی آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگے، شدتِ جذبات سے اُن سے بھی کچھ بولا نہیں گیا، پھر انہوں نے احسن کو بلانا چاہا۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔

....

اُسے ہاسپٹل میں پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ چچی جان مستقل اُس کے پاس تھیں۔ زارا اور ڈیڈی روزانہ دن میں ایک چکر ضرور لگاتے۔ جبکہ احسن کو اُس نے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ آتا وہ صبح شام تھا لیکن باہر ہی چچی جان سے بات کر کے چلا جاتا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے سامنے آنے سے گریز کیوں کر رہا ہے، اس وقت بھی

سسٹر نے آکر اس کی آمد کا بتایا تو چچی جان اُٹھ کر چلی گئیں۔ وہ بس ایک پل کو اُلجھی پھر قصداً ادھر سے دھیا ہٹا کر گھر جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد وہ اندر چلا آیا۔ اور اس سامنے کھڑا ہو کر کچھ کہنے کے بجائے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پتا نہیں کیا تلاش کر رہا تھا۔ اس کا دل اچانک زورز سے دھڑکنے لگا اور کچھ خوفزدہ سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی وہ کن انکھیوں سے اس کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ایک لفافہ ہاتھ میں لے کر براہِ راست اُسے دیکھنے لگا تو وہ فوراً نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

''لو تمہاری خواہش کے عین مطابق، تم جیت گئیں رملہ بیگم!'' وہ اس کی کلائی تھام کر لفافہ اس کی ہتھیلی پر رک ہوئے بولا تو وہ کچھ دیر تک چپ چاپ لفافے کو دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

''میں نہ ہار سے خوفزدہ تھی اور نہ جیت سے خوش۔ اس لیے کہ میرا مقصد تمہیں ہرانا یا جھکانا ہرگز نہیں تھا۔ تو بس یہ چاہتی تھی کہ تم حقائق کو تسلیم کر لو۔ لیکن تم نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ اور اب جبکہ فیصلہ ہو ہی گیا۔ ایک بات سُن لو احسن بلکہ اس پر یقین کر لو کہ عورت جسے اپنا تن سونپتی ہے، من بھی اُسی کا ہو جاتا ہے۔ اس بعد اسے اجلا رکھنے یا میلا کر دینے کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو'' وہ بے اختیار اعتراف کر گیا۔ اور اس کے چونک کر دیکھنے پر کہنے لگا۔ ''میں تمہار ساتھ برابر کا نہیں بلکہ زیادہ قصوروار ہوں۔ اس لیے کہ میں نے تمہیں ساری مسافتیں طے کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ بہرحال یہ ساری باتیں بعد میں ابھی تو یہ سن لو کہ میں اپنے گریبان میں جھانکنے کے بعد تمہار پاس آیا ہوں اور جانتی ہو، اس لفافے میں کیا ہے۔ تمہارے وارنٹ۔''

''وارنٹ!'' وہ فوراً لفافہ کھولنے لگی تو اُس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولا

''کیا؟'' وہ واقعی سہم کر دیکھنے لگی۔

''عمر قید بامشقت۔'' اُس نے کوشش سے لہجے کو سنجیدہ بنایا۔ لیکن آنکھوں میں رقص کرتی شرارت وہ د چکی تھی۔ جبھی اطمینان بھری گہری سانس کھینچ کر بولی۔

''تمہارے اعتراف کے بعد سب منظور ہے۔''



ساعتیں قرب کی

روبی کا انتظار کرتے کرتے اب کوفت کے بعد اس پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ کبھی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتی اور کبھی ریلنگ پر گرفت مضبوط کر کے پنجوں پر اونچی ہو کر دور تک جاتی ہوئی سیاہ کولتار کی سڑک پر نظریں دوڑانے لگتی۔ قدرے اونچی آواز میں بڑبڑانا بھی جاری تھا۔ کبھی تشویش کا اظہار اور کبھی گالیاں۔

''انتہائی کمینی ہے۔ اب آئے گی تو میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' فیصلہ کن انداز میں سوچتی ہوئی وہ ریلنگ کے پاس سے ہٹنے لگی تھی کہ نومی کی بائیک گیٹ سے اندر آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ہٹنے کو تھی کہ وہ وہیں سے پکارنے لگا۔

''سارا! جلدی سے نیچے آؤ۔''

''کیوں؟''

''تم آؤ تو......'' وہ کچھ سوچتی ہوئی پلٹی اور تیزی سے سیڑھیاں اُترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ وہ بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر کے اسی کی طرف آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کا موڈ روبی کے نہ آنے کی وجہ سے خراب تھا۔ اس لیے اس سے بھی کاٹ کھانے

والے لہجے میں بات کرنے لگی۔

"کس نے مارا ہے؟" وہ اس کے پھولے پھولے چہرے کی طرف دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"کیا......؟" وہ چیخی۔ "کون مارے گا مجھے؟"

"اس گھر میں سب تم سے بڑے ہیں کوئی بھی مار سکتا ہے۔"

"بکومت، یہ بتاؤ، مجھے نیچے کیوں بلایا ہے؟"

"قریب سے تمہارا دیدار کرنے کے لیے۔"

"نومی!" وہ شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے وارننگ دینے کے انداز میں بولی۔

"دیکھو۔ میرا موڈ بہت خراب ہے۔ اگر کوئی غلط بات کرو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔"

وہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کبھی اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتی تھی۔ اگر وہ سنجیدہ ہوتا تو اس کا مذاق اُڑانے لگتی تھی اور اگر مذاق میں بات کرتا تو خود سنجیدہ ہو کر خفا ہونے لگتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیسے اس تک اپنے دل کی بات پہنچائے جس طرح وہ موڈ خراب کر کے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتی تھی اس سے وہ خود ہی بات کو مذاق میں اُڑانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ورنہ کئی بار دل چاہتا اسے کندھوں سے تھام کر جھنجوڑ کر کہے۔

"میں تمہیں چاہتا ہوں، تمام تر شدتوں کے ساتھ۔"

"یوں کیا دیکھ رہے ہو۔؟" وہ پوچھنے لگی۔

"تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟"

"وہ روبی کی بچی۔ اس نے آنے کو کہا تھا، اب تک نہیں آئی۔" وہ ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ سے زوردار مکا مارتی ہوئی بولی۔

"فون کر کے معلوم کر لو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"کر چکی ہوں فون۔ وہ کمینی گھر میں نہیں ہے۔"

"چلو جانے دو۔ یہ بتاؤ، میرے ساتھ طارق روڈ چل رہی ہو۔؟"

"طارق روڈ" اس نے دہرایا اور پرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے روبی کے ساتھ طارق روڈ ہی جانا تھا۔ کل ندا کی برتھ ڈے تھی اور اس کے لیے دونوں کو گفٹ لینا تھا۔ صبح ہی دونوں نے پروگرام بنایا تھا کہ شام میں گفٹ لے لیں گے اور اب تک روبی آئی نہیں تھی۔ وہ تیار ہو کر کتنی دیر سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگیں۔؟" وہ اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔

"جانا تو مجھے طارق روڈ تھا۔"

"روبی کے ساتھ؟"

"ہاں!"

"تو میرے ساتھ چلو۔"

"تمہارے ساتھ۔؟"

"کیوں میں تمہیں کھا جاؤں گا کیا۔؟"

"خیر اتنی جرأت تو نہیں تمہاری۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"دیکھو۔ تم کسی دن میرے ہاتھ سے ضائع ہو جاؤ گی"

"بس بس اپنی شکل سیدھی کر لو۔ مجھے ٹیڑھی شکلیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بولی۔

"جاؤ۔ پھوپھو سے کہہ آؤ۔ تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے اندر بھاگ گئی۔ ممی کے کمرے میں سحر آپی بھی موجود تھیں اور دونوں جانے کس موضوع پر بات کر رہی تھیں کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

"ممی! روبی تو آئی نہیں۔ میں نومی کے ساتھ طارق روڈ چلی جاؤں۔؟" وہ دروازے میں رک کر پوچھنے لگی۔

"جاؤ۔ لیکن جلدی آ جانا۔"

"بس ممی! مجھے صرف ندا کے لیے گفٹ لینا ہے۔" پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔

"سحر آپی! آپ کو کچھ منگوانا ہے۔؟" سحر نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ممی کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے جانے کا اشارا کیا تو وہ آہستہ قدموں سے باہر نکل آئی۔

پچھلے کئی دنوں سے اسے گھر کا ماحول کچھ پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہو۔ ہمیشہ ایکٹو رہنے والی ممی کچھ بجھی بجھی سی تھیں۔ ڈیڈی الگ اپنی سوچوں میں اُلجھے نظر آتے۔ اور سحر آپی، گو کہ وہ سدا کی کم گو......اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی تھیں ان دنوں لگتا جیسے وہ ممی کی الجھن شیئر کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔ اسے کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ جاننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے کوئی بتاتا ہی نہیں تھا۔

ممی، سحر آپی اور ڈیڈی تینوں اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتے یا پھر موضوع بدل جاتے۔ وہ نادان نہیں تھی۔ جان جاتی کہ اس کے آنے سے پہلے کوئی اور موضوع تھا۔ اور اسے دیکھ کر دانستہ بات بدلی گئی ہے۔

اس وقت بھی ممی اور سحر آپی اسے دیکھ کر جس طرح خاموش ہو گئی تھیں اس سے اسے الجھن ہونے لگی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ سب مجھ سے کون سی بات چھپانا چاہ رہے ہیں لیکن اس وقت وہ جلدی میں تھی اس لیے خاموشی سے ان کے پاس سے چلی آئی۔ لیکن اندر ہی اندر وہ خاصی الجھ گئی تھی اور اپنے طور پر قیاس کرتی ہوئی جب وہ اپنا پرس لے کر نومی کے پاس آئی تو وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ یہاں سے گئی تھی تو کھلکھلاتی ہوئی اور خاصے خوشگوار موڈ میں تھی اور اب غیر معمولی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے کچھ پریشان سی بھی لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ پھوپھو نے منع کر دیا؟" وہ اس کے قریب آتے ہی پوچھنے لگا۔

"نہیں تو۔"
"پھر......"
"پھر کیا......؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"منہ کیوں پھولا ہوا ہے۔؟"
"کچھ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "چلنا ہے تو چلو ورنہ......"
"دھمکیاں مت دیا کرو۔ آؤ۔"
وہ اس سے آگے نکل کر بائیک تک آ گیا۔ گیٹ سے باہر نکل کر جب اس نے بائیک اسٹارٹ کیا تب وہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق ایک جھٹکے سے بائیک آگے بڑھائی۔ اُس نے مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔ ہمیشہ اسے موقع پر وہ اسے بے نقط سنایا کرتی تھی لیکن اس وقت خاموش رہی اور وہ اس کی طرف سے گالیوں کا انتظار ہی کرتا رہا۔ ایک گفٹ سینٹر کے سامنے بائیک روک کر وہ ذرا سی گردن موڑ کر اس سے پوچھنے لگا۔
"یہاں دیکھو گی۔؟"
"دیکھ لیتی ہوں۔" وہ بائیک سے اُتر گئی۔ تم نہیں چلو گے۔"
"تم چلو۔ میں لاک لگا کر آ رہا ہوں۔" وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔
"ممی نے کہا تھا جلدی آنا۔" وہ گفٹ پیک کروا کر اس کے ساتھ باہر نکلی تو کہنے لگی۔
"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اب فوراً گھر چلو۔"
"ہاں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔
"چلو پہلے تمہیں وہاں سے آئس کریم کھلا دوں۔"
اس نے سامنے اشارا کیا۔ وہ منع کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے موقع نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے روڈ کراس کر لیا۔ اوپن ایریا کے لان میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا اور جو پہلی ٹیبل راستے میں آئی وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ جب کہ وہ قریب گزرتے لڑکے کو روک کر آئس کریم کے لیے کہنے لگا اور جب اس کے سامنے بیٹھا تو کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ انگلی سے میز کی سطح پر آڑی ترچھی لکیریں بناتی ہوئی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی نظریں ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں اور چہرا ہر قسم کے تاثر سے عاری۔ لڑکا آئس کریم لے آیا تو وہ کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے کہنے لگا۔
"سنو۔ تم۔ یوں چپ چپ سی اچھی نہیں لگتیں۔"
"تمہیں نہ میرا زیادہ بولنا اچھا لگتا ہے نہ خاموشی اور کوئی تیسرا راستہ میرے پاس ہے نہیں۔" وہ سیدھی بیٹھتے ہوئے بولی۔
"تیسرا راستہ ہے۔" پھر خود ہی کہنے لگا۔ "خیر اس بحث کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ پریشان کیوں ہو۔؟"

"پریشان نہیں تو۔"
"سارا!" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "ہم صرف کزن ہی نہیں اچھے دوست بھی ہیں۔"
"مجھے اس سے انکار نہیں۔"
"تو پھر بتاؤ کس بات نے تمہیں الجھا رکھا ہے؟" وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔
"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی نومی! لیکن مجھے لگتا ہے کوئی بات ہے ضرور جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے کئی دنوں سے میں ممی، ڈیڈی اور سحر آپی کو نوٹ کر رہی ہوں۔ ڈیڈی کچھ چپ چپ سے ہیں۔ ممی الجھی ہوئی اور سحر آپی جو کبھی کسی معاملے میں دخل نہیں دیتی تھیں آج کل زیادہ تر ممی کے ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔
"نومی! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بھی معلوم ہونا چاہیے۔ میں بھی اس گھر کی فرد ہوں۔ آخر یہ سب لوگ مجھے نظر انداز کیوں کر رہے ہیں۔"
"تمہارا وہم ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ اپنی طرف سے اسے ریلیکس کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ میز پر رکھے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر بولی۔
"اس کا مطلب ہے، تم جانتے ہو کیا بات ہے؟"
"میں، نہیں تو۔"
"دیکھو نومی! ابھی تم نے خود کہا تھا کہ ہم اچھے دوست ہیں۔" وہ ہنس پڑا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"تم جتنی لاپرواہ اتنی ہی ذہین بھی۔"
"میری تعریف بعد میں کرنا۔ پہلے وہ بتاؤ جو میں پوچھنا چاہتی ہوں اور پلیز یہ سوال مت کرنا کہ میں کیا پوچھنا چاہتی ہوں۔"
"ہر صورت جاننا چاہتی ہو۔؟"
"ہاں......!" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔
"اچھا!" وہ ہتھیار ڈالتا ہوا بولا۔ "پہلے یہ بتاؤ تم اپنے دادا میاں کے بارے میں کیا جانتی ہو۔؟"
"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے دادا رنگ پور کے زمیندار ہیں اور ڈیڈی نے کیونکہ ان کی مرضی اور پسند کے خلاف شادی کر لی تھی اس لیے انہوں نے ڈیڈی اور ممی پر اپنی حویلی کے دروازے بند کر دیے۔ اس کے بعد پھر کبھی ڈیڈی وہاں نہیں گئے۔"
"تم ٹھیک جانتی ہو۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔"
"پھر......؟"
"اصل کہانی یوں ہے سارا کہ......" اس نے پہلے سگریٹ سلگائی۔ پھر کہنے لگا۔

''تمہارے ڈیڈی بچپن سے اپنی چچازاد سے منسوب تھے۔ پھر جب شادی کا وقت آیا تو تمہارے ڈیڈی نے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ تو آکسفورڈ سے ایم۔بی۔اے کر کے آئے تھے۔ جب کہ ان کی منگیتر ابتدائی چند کلاسوں سے آگے نہیں پڑھی تھی۔ ویسے بھی تمہارے آغا جی کے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے۔ بہرحال یہاں پھوپھو کے ساتھ ان کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی اور دونوں نے شادی کر لی۔ انکل کا خیال تھا کچھ وقت گزرنے کے بعد جب تمہارے آغا جی کا غصہ کم ہو گا تو وہ نہ صرف انہیں معاف کر دیں گے بلکہ پھوپھو کو بھی قبول کر لیں گے۔ جب سحر آپی پیدا ہوئیں تب انکل حویلی گئے یہ سوچ کر کہ آغا جی بیٹی کا سُن کر نرم پڑ جائیں گے۔ لیکن آغا جی نے انکل کو گھیر لیا اور زبردستی ان کی شادی ان کی سابقہ منگیتر سے کر دی۔ شاید ان کا خیال تھا انکل بہت جلد اپنی شہری بیوی کو بھول جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انکل کو جیسے ہی موقع ملا وہاں سے نکل آئے۔ اس کے بعد پھر کبھی لوٹ کر نہیں گئے۔''

''اور ان کی دوسری بیوی کا کیا ہوا؟'' وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا تھا کہ وہ فوراً پوچھنے لگی۔

''وہ وہیں تمہارے آغا جی کے پاس ہیں۔ اور ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ سحر آپی سے چھوٹی اور تم سے بڑی۔''

''میرے خدا!! اگر ڈیڈی نے ہمیشہ کے لئے وہاں سے آنے کی ٹھان لی تھی تو کوئی فیصلہ کر کے آتے تاکہ وہ خاتون نئے سرے سے زندگی۔''

''انکل نے ایسا ہی کرنا چاہا تھا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔ ''لیکن وہ خاتون نہیں مانیں۔ وہی گئے زمانوں والی باتیں کہ تم جو چاہو کرو لیکن مجھے اپنے نام پر بیٹھا رہنے دو۔''

''پھر اب کیا مسئلہ ہے۔؟''

''اب فلمی سچویشن پیدا ہو گئی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''کیا مطلب۔؟''

''آغا جی بیمار ہیں اور انکل کو بلا رہے ہیں اور اس مقام پر پھوپھو کو سوکن کی طرف سے خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔''

وہ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''ویسے یہ ایک فطری بات ہے۔ گو کہ انکل یقین دلا رہے ہیں کہ وہ صرف آغا جی سے مل کر اور کچھ ان کی خدمت کر کے واپس لوٹ آئیں گے لیکن پھوپھو کے دل میں کچھ خوف سا پیدا ہو گیا ہے اس لیے وہ نہیں چاہتیں کہ انکل جائیں۔''

''اور ڈیڈی کیا چاہتے ہیں......؟''

''ظاہر ہے، وہ ایک لمبا عرصہ والدین سے دور رہے ہیں اور اب جب کہ وہ خود بلا رہے ہیں تو انکل ضرور ...نا چاہتے ہوں گے۔ بہرحال تم اپنے دل پر بوجھ مت ڈالنا اور یہ خیال دل سے نکال دو کہ کوئی تمہیں نظر انداز ...ر رہا ہے۔ اصل میں تم گھر میں سب سے چھوٹی ہو اور کچھ لاپروا بھی اس لیے تمہارے سامنے اس مسئلے پر بات

نہیں ہوتی ہو گی۔''

''ہاں شاید......'' وہ طویل سانس لیتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو چلتے ہیں۔''

اس نے لڑکے کو بلا کر بل پے کیا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''سنو!'' جب وہ گھر کے سامنے بائیک سے اُتر کر اندر جانے لگی تو وہ اسے پکار کر کہنے لگا۔

''اب جاتے ہی یہ مت کہہ دینا کہ جو باتیں تم سے چھپائی جا رہی تھیں، وہ میں نے بتا دیں۔''

''تم ہی نے تو بتائی ہیں۔'' وہ اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

''کیا......؟'' وہ چیخا اور وہ ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

جب سے امتحان ختم ہوئے تھے اور کالج سے ناتا ٹوٹا تھا اس کے معمولات میں کافی فرق آ گیا تھا۔ صبح اُٹھنے کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ اپنی مرضی سے جب دل چاہتا اُٹھتی تھی۔ اس وقت تک سب لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو چکے ہوتے تھے۔ لیکن اس روز وہ جلدی اُٹھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنے کمرے سے نکلی تو ڈیڈی کو ڈائننگ روم کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔ اسے دیکھ کر ممی نے تعجب کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگی۔

''بس ممی! اچانک آنکھ کھل گئی۔ گو کہ دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔''

پھر اس نے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ وہ بہت خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے تھے۔ ممی نے سلائس اور انڈے کی پلیٹ ان کے آگے کھسکا دی۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنی پلیٹ پر جھکی کن انکھیوں سے باری باری سب کو دیکھنے لگی۔ ڈیڈی، ممی سحر آپی سب کے ہاتھ آہستگی سے پلیٹ کی طرف بڑھتے اور پھر اسی آہستگی سے منہ کی طرف جاتے۔ اسے لگا جیسے یہ کوئی طلسم کدہ ہو اور ذرا سی آہٹ سے طلسم ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔ وہ الجھن محسوس کرنے لگی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔؟'' اس نے سوچا اور پھر ایک دم سر اٹھا کر کہنے لگی۔

''ڈیڈی! میں بھی آپ کے ساتھ رنگ پور جاؤں گی۔'' ممی کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ سحر آپی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں اور ڈیڈی جیسے پشیمان سے ہو گئے تھے۔

''ڈیڈی! آپ کو...... آغا جی کے پاس ضرور جانا چاہیے۔''

وہ سب کی کیفیت سمجھنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''وہ آپ کے والد ہیں ڈیڈی۔ ابھی انہوں نے آپ سے درخواست کی ہو گی کہ آپ ان سے ملیں۔ وہ آپ کو حکم بھی دے سکتے ہیں۔''

''سارا!۔'' ممی نے ٹوکا۔

''میں غلط نہیں کہہ رہی ممی۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور ڈیڈی کو مت روکیں۔ اتنا عرصہ ڈیڈی نے آپ کی خاطر سب کو چھوڑے رکھا۔ اب اگر ڈیڈی کچھ وقت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو آپ کو ان کی خواہش

کا احترام کرنا چاہیے۔

آپ کا خدشہ بے بنیاد ہے ممی! اور پھر میں ڈیڈی کے ساتھ جاؤں گی۔ صرف ایک ہفتے کی اجازت دے دیجیے۔ اس کے بعد میں خود ڈیڈی کو واپس لے آؤں گی کیوں ڈیڈی۔؟''

ڈیڈی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ ممی کی طرف دیکھنے لگی، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا...... کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جیسے ہی جانے لگیں وہ اُٹھ کر ان کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔

''پلیز ممی! مان جائیں ناں۔''

''جو تمہارا دل چاہے کرو۔'' ممی اسے دھکیل کر کمرے سے نکل گئیں...... تو اس نے پلٹ کر ڈیڈی کی گردن میں بازو ڈال دیے۔

''ڈیڈی! ہم دونوں چلیں گے۔''

''بیٹا! تمہاری ممی خفا ہو گئی ہیں۔''

''ممی کی فکر نہ کریں۔ انہیں میں رام کر لوں گی۔ بس آپ چلنے کی بات کریں۔''

''اگر تم اپنی ممی کو رام کر لو تو مجھے فون کر دینا میں آج شام کی سیٹ لے لوں گا۔''

ڈیڈی اس کا گال تھپک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر جاتے جاتے سحر سے پوچھنے لگے۔

''بیٹا! تم بھی چلو گی۔؟''

''نہیں ڈیڈی! ممی اکیلی ہو جائیں گی۔''

''یہ تو ہے۔ او۔کے۔ اگلی دفعہ تم چلنا۔'' ڈیڈی کمرے سے نکل گئے تو وہ دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔

''سارا! تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟'' سحر آپی پوچھنے لگیں۔

''نومی نے۔'' وہ کیونکہ اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی اس لیے نومی کے منع کرنے کے باوجود اس کا نام لے دیا۔

''نومی!'' سحر زیر لب بڑبڑائیں تو وہ کہنے لگی۔

''اب پلیز آپ نومی سے باز پرس مت کیجئے گا...... ویسے بھی اس نے خود سے نہیں بتایا میں نے بہت اصرار سے پوچھا تب۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''اتنے دنوں سے میں گھر میں کشیدگی محسوس کر رہی تھی۔ پہلے سوچا۔ کوئی بات ہو گی تو آپ خود مجھے بتادیں گی۔ لیکن آپ کی مسلسل خاموشی نے مجھے الجھا دیا۔''

''تمہیں اسی لیے نہیں بتا رہی تھی کہ تم ڈیڈی کی طرف داری کرو گی۔''

''سحر آپی! ایمانداری سے بتائیے۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کی ہے۔؟''

''نہیں۔''

''پھر آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟''

''ممی کی وجہ سے۔ تم نے دیکھا نہیں ممی کتنی ڈسٹرب ہو گئی ہیں۔''

''ممی کو ڈیڈی کا یقین کرنا چاہیے۔'' پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''آئیے ہم مل کر ممی کو سمجھاتے ہیں۔''

دو گھنٹے کی کوشش کے بعد جب وہ ممی کو رام کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ تب وہ ڈیڈی کے آفس کے نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

آغا جی کی حویلی پر اسے کسی محل کا گمان ہو رہا تھا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہ باہر کا حصہ تو ڈھنگ سے نہیں دیکھ سکی تھی پھر بھی اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بلند و بالا عمارت چاروں طرف سے وسیع لانز میں گھری ہوئی ہے۔ کوریڈور سے اندر داخل ہوئی تو وسیع و عریض ہال تھا۔ وال ٹو وال کارپٹ اور جدید فرنیچر سے سجا ہوا۔ مغربی دیوار کے پاس سیڑھیاں چکر کھاتی ہوئی اوپر چلی گئی تھیں۔ وہ ابھی مزید اِدھر اُدھر کا جائزہ لینا چاہتی تھی کہ حویلی کے مکین اسی ہال کمرے میں جمع ہونے لگے۔ وہ کسی کو نہیں جانتی تھی اس لیے ڈیڈی کے بازو کو مضبوطی سے تھامے ایک ایک کو دیکھنے لگی۔ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ سب ہی ڈیڈی سے مل رہے تھے۔ آخر میں ڈیڈی کو خود ہی خیال آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

''یہ سارا ہے میری چھوٹی بیٹی۔ اور بیٹا ان سے ملو۔''

ڈیڈی ایک ایک کی طرف اشارا کر کے بتانے لگے۔

''یہ تمہارے آغا جی، یہ بی بی جان، تایا جی، یہ تائی جی۔ یہ سب ان کے بچے یعنی تمہارے کزنز اور یہ......''

ڈیڈی خاموش ہو گئے اور وہ اسی طرف دیکھنے لگی جس طرف ان کا ہاتھ اُٹھا ہوا تھا۔ اور ڈیڈی کی خاموشی سے وہ جان گئی کہ وہ وہی خاتون ہیں جن کی وجہ سے ممی انہیں یہاں نہیں آنے دے رہی تھیں۔

''آؤ میرے پاس بیٹھو۔''

بی بی جان نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ان کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ نہ محبت و شفقت، نہ نفرت نہ بیزاری، وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس جا بیٹھی۔

ڈیڈی، آغا جی اور تایا جی سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ باقی سب بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ایک ایک کو دیکھتی رہی۔ اسے یوں چپ بیٹھنا بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ تو خاصی بولڈ لڑکی تھی۔ ہر محفل میں بڑی جلدی گھل مل جایا کرتی۔ لیکن یہاں جانے کیوں کوئی بات نہ کر سکی۔ انتہائی بوریت محسوس کرتے ہوئے قریب بیٹھی بی بی جان سے بمشکل اتنا کہہ پائی۔

''میں منہ ہاتھ دھوؤں گی۔'' انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

''جاؤ اسے اوپر لے جاؤ۔''

لڑکیاں شاید اسی انتظار میں تھیں۔ فوراً کھڑی ہو گئیں اس نے اجازت طلب نظروں سے بی بی جان کی طرف دیکھا انہوں نے سر ہلایا تو وہ اُٹھ کر ان لڑکیوں کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اسے انہی چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں

سے اوپر لے گئیں سامنے کئی کمرے لائن سے بنے ہوئے تھے۔

''میرے کمرے میں آجاؤ۔''

ایک لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں داخل ہوگئی تو باقی لڑکیاں بھی اس کے پیچھے آگئیں۔ کمرہ خاصا کشادہ اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا اور وہ جو نیچے خاصی ریزروی بیٹھی تھی یہاں آتے ہی بے تکلفی سے بیڈ پر گر گئی۔

''میرے خدا......'' طویل سانس لے کر بولی۔''سفر نے اتنا نہیں تھکایا جتنی تھکن نیچے بیٹھ کر ہوگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی میں زیادہ دیر تک ایک جگہ خاموش ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔'' پھر تکیہ بازوؤں میں لے کر اوندھی۔ لیٹتی ہوئی بولی۔

''اب تم سب تفصیل سے اپنا تعارف کرواؤ۔ ڈیڈی نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ تم سب میری کزنز ہو۔''

''اس سے زیادہ تو وہ خود بھی نہیں جانتے ہوں گے۔''

جو لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لائی تھی اس نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی اور بات کرنے کا انداز بھی۔

''سحر آپی!'' ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میرے خدا! آپ تو بالکل سحر آپی کی طرح ہیں۔ چلیے، سب سے پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں۔''

''میرا تعارف بہت مختصر ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔''بس میرا نام ہی یاد رکھ لو تو کافی ہے۔ میں اسماء ہوں۔''

''آپ تایا جی کی بیٹی ہیں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''نہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کو ہونٹ بھینچے پھر کہنے لگی۔''میں اس شخص کی بیٹی ہوں جسے آج میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔''

''ڈیڈی! اس کے ہونٹوں نے حرکت کی اور وہ اس سے نظریں چرا گئی۔ گو کہ اس سارے قصے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی قصوروار لگ رہی تھی۔

''اسماء پلیز......'' کسی نے ٹوکا۔'' سارا ہماری مہمان ہے اور ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ جس سے اس کی دل آزاری ہو۔''

''میری دل آزاری نہیں ہوئی ڈیر کزن!''

وہ ہلکے سے مسکرائی اور اسماء کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ یقین کریں۔ مجھے کل ہی آپ کے بارے میں معلوم ہوا۔ اگر اس سے پہلے میں کچھ جانتی تو بہت پہلے آپ سے ملنے آگئی ہوتی۔ آپ بالکل سحر آپی کی طرح ہیں۔ اگر آپ دونوں

ساتھ بیٹھ جائیں تو دیکھنے والے آپ دونوں کو تو بہنیں کہیں گے اور مجھے کبھی بھی آپ میں شمار نہیں کریں گے۔''

بات ختم کر کے وہ خود ہی ہنس پڑی۔ پھر باری باری سب کی طرف دیکھا اسماء تعارف کروانے لگی۔

''یہ صبا اور ہما۔ تایا جی کی بیٹیاں ہیں۔ سعدیہ اور نادیہ چچا جی کی اور یہ جو ثناء ہے یہ پھوپھو جی کی بیٹی ہے آج کل یہاں آئی ہوئی ہے۔''

''پھوپھو جی کہاں رہتی ہیں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''ہمارا گاؤں زیادہ دور نہیں ہے۔'' ثناء کہنے لگی۔''جہاں آغا جی کی زمینیں ختم ہو جاتی ہیں اس سے آگے ہماری شروع ہو جاتی ہیں۔ تم چلو گی ناں۔''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاں اگر ڈیڈی جائیں گے تب ضرور چلوں گی۔''

''میرا خیال ہے اب تم منہ ہاتھ دھو لو۔ کھانا لگتے ہی آغا جی کا بلاوا آجائے گا۔''

''ارے میں تو بھول ہی گئی کہ منہ دھونے کی غرض سے آئی تھی۔'' وہ ایک ہی جست میں بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ پھر کچھ یاد آیا تو کہنے لگی۔

''سنو۔ تایا جی، چچا جی اور پھوپھو جی کے بیٹے بھی ہیں یا ہمارے ڈیڈی کی طرح صرف بیٹیاں۔''

''ماشاء اللہ بیٹے بھی ہیں۔'' صبا آپی فوراً بول پڑیں

''تایا جی کے تین بیٹے ہیں۔ چچا جی کے دو اور پھوپھو جی کے چار۔'' اسماء نے بتایا تو وہ ثناء کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔''

ثناء نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اتراتے ہوئے کہا تو وہ ہنستی ہوئی باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ پھر جب منہ ہاتھ دھو کر نکلی تو کمرے میں صرف اسماء موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

''آغا جی کا بلاوا آچکا ہے۔ جلدی چلو''

''باقی سب چلی گئیں۔''

''ہاں۔'' اس نے ہاتھوں سے بال ٹھیک کیے اور دوپٹہ سلیقے سے اوڑھتی ہوئی اسماء کے ساتھ چل پڑی۔

ڈائننگ روم میں سب لوگ موجود تھے۔ وہ بھی جن کے بارے میں اس نے ابھی کچھ دیر پہلے پوچھا تھا۔ یعنی آغا جی اور چچا جی کے بیٹے۔ وہ خاص طور سے کسی کی طرف نہ دیکھ سکی بس غیر ارادی طور پر ہی جس کی طرف نظر اٹھی اور پھر کسی نے تعارف کروانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔

''ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی کچھ فاصلے، کچھ حد بندیاں شاید یہاں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔''

اس نے ڈیڈی کے برابر بیٹھتے ہوئے سوچا اور اسے نومی یاد آیا۔ کتنی دوستی تھی اس کی نومی سے۔ اور کبھی ممی ڈیڈی نے اعتراض بھی نہیں کیا تھا اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر اور یہاں...... وہ بے خیالی میں سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی لڑکیاں سر ڈھانپے اپنی اپنی پلیٹوں پر جھکی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا۔ وہ دانستہ ادھر ادھر دیکھنے سے گریز

کر رہی ہیں۔لڑکے البتہ نارمل نظر آ رہے تھے۔ان کے انداز میں نہ تکلف تھا اور نہ حد سے زیادہ بے تکلفی۔آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

اس نے نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور پھر جو سر اونچا کیا تو اس کے عین سامنے بیٹھا زوار شاہ بڑے دلکش انداز میں مسکرایا۔وہ بڑی دیر سے اس کا کھویا کھویا انداز دیکھ رہا تھا۔اور شاید انتظار میں تھا کہ وہ کب اس کی طرف دیکھتی ہے۔اور اب جو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ شرارت پر آمادہ ہوا۔

گھنی مونچھوں تلے بھرے بھرے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی اور بڑی بڑی آنکھوں میں شوخی۔کچھ کہا نہیں پھر بھی جیسے بہت کچھ کہہ گیا تھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

''اسی لیے لڑکیاں اِدھر اُدھر دیکھنے سے گریز کرتی ہیں۔''اس نے سوچا۔

''کیا بات ہے بیٹا!تم کھانا نہیں کھا رہیں؟''ڈیڈی نے اس کی پلیٹ اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

''کھا رہی ہوں۔''اس نے چاہا جلدی جلدی کھا کر یہاں سے اُٹھ جائے۔لیکن اب کھانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔اس کی نظروں کے حصار میں اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔اسی وقت صبا آپی اٹھیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟''ڈیڈی پوچھنے لگے۔

''بس ڈیڈی میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''پتر۔''آغا جی نے اسے مخاطب کیا۔''تم شہری لوگ اتنا سا کھانا کھاتے ہو جبھی تو اتنے سوکھے ہوئے ہوتے ہو۔اپنی شکل دیکھو۔لگتا ہے مہینوں سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا......!''

''آغا جی یہ لوگ ڈائیٹنگ کرتے ہیں۔''وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''ڈائیٹنگ نے ستیاناس کر دیا ہے ان کا۔''اس سے پہلے کہ آغا جی مزید کچھ کہتے وہ صبا آپی کے پیچھے چلتی ہوئی ڈائننگ روم سے باہر نکل آئی۔

''تم نے واقعی کھانا نہیں کھایا۔''صبا آپی اس کے ساتھ چلتی ہوئی کہنے لگیں۔

''مجھے واقعی بھوک نہیں تھی۔''وہ انہی کے لہجے میں بولی۔

''سچ کہہ رہی ہو۔؟''انہوں نے کریدنے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

''اصل میں صبا آپی!میرے سامنے جو بندہ بیٹھا تھا وہ اس بری طرح مجھے گھور رہا تھا کہ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔''وہ صاف گوئی سے بولی۔

''کون؟''صبا اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگیں۔پھر اچانک یاد آیا تو بولیں۔

''ارے وہ تو زوار شاہ ہے۔میرا چھوٹا بھائی۔''اس نے صرف کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

''تم اوپر چلو میں تمہارے لیے وہیں کھانا لے کر آتی ہوں۔''

''ابھی نہیں آپی!''اس نے روک دیا۔

''کیوں......؟''

''ابھی واقعی دل نہیں چاہ رہا۔پھر جب بھوک لگے گی تو آپ سے کہہ دوں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔''انہوں نے کہا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔

''یہ آپ کا کمرا ہے؟''

''میرا اور رہما کا اور ہاں تم کیسے رہنا چاہو گی؟میرا مطلب ہے،الگ کمرا یا کسی کے ساتھ؟''

''جیسے آپ کہیں۔''

''نہیں بھئی،جیسے تم پسند کرو۔یہاں میں اور رہما ہیں،ساتھ والے کمرے میں سعدیہ اور نادیہ ہوتی ہیں،البتہ اسماء اکیلی ہوتی ہے،لیکن اس کے ساتھ پتا نہیں تم رہنا پسند کرو یا......''

''صبا آپی!''وہ پہلے چونکی پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔''آپ کو یہ خیال کیونکر آیا کہ میں اسماء کے ساتھ رہنا پسند نہیں کروں گی۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''تو پہلے آپ اسماء سے پوچھ لیں،اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو پھر میں انہی کے ساتھ ٹھہروں گی۔''

صبا آپی کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

''تمہیں شاید میری بات بری لگی؟''

''نہیں،مجھے آپ کی حقیقت پسندی اچھی لگی،خیر چھوڑیں اس موضوع کو،بتائیں،اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''اُس نے بات طویل ہوتے دیکھ کر موضوع بدل دیا۔

''کیسا پروگرام؟''

''نیچے لان میں چلیں،کچھ دیر ٹہلیں گے۔''

''اس وقت؟''صبا آپی نے جس طرح حیرت کا اظہار کیا،اُسے لگا جیسے اُس نے کوئی بہت ہی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

''چلیں،اس بات کو بھی جانے دیں۔''وہ چپل اتار کر بیڈ کے اوپر چڑھ گئی۔اور ابھی تکیہ سیدھا کر کے نیم دراز ہوئی ہی تھی کہ باقی لڑکیاں بھی واپس آ گئیں۔وہ اٹھنا چاہتی تھی کہ رہما نے روک دیا۔

''لیٹی رہو ہم ایسے ہی بیٹھ جائیں گے۔''

پھر کچھ دیر تک سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں جب سونے کا ذکر آیا تو صبا کہنے لگیں۔

''بھئی سارا کے لیے کہاں انتظام کیا ہے؟''

''اگر سارا کو اعتراض نہ ہو تو میرے کمرے میں آ جائے۔''

اسماء نے کہا تو وہ ایک دم صبا آپی کی طرف دیکھنے لگی۔انہوں نے مسکراتے ہوئے دو انگلیوں کی مدد سے وکٹری کا نشان بنایا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔

"ابھی کہاں جارہی ہو؟"

"مجھے نیند آرہی ہے۔ میرا خیال ہے سفر کی تھکان اب غالب آرہی ہے۔"

"اچھا! تو اب صبح ملاقات ہوگی۔"

"شب بخیر!" وہ کمرے سے نکل آئی۔

عموماً اُسے نئی جگہ پر نیند ذرا مشکل ہی سے آتی تھی، لیکن اس وقت تھکن کا احساس اچانک غالب آ گیا تھا کہ وہ اسماء کا انتظار کیے بغیر ہی سوگئی۔ اِدھر جب سے کالج چھوٹا تھا۔ وہ صبح دیر تک سوئی رہتی تھی یہاں کا بھی اس کا جلدی اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن پرندوں کی آوازوں سے خود ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

فوری طور پر اُسے خیال نہیں آیا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے، اس لیے قدرے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

بائیں طرف اسماء نماز پڑھتی ہوئی نظر آئی۔ تب اُسے یاد آیا کہ وہ آغا جی کے گھر میں ہے۔ اُس نے سوچا وہ بھی اُٹھ کر نماز پڑھ لے لیکن پھر ابھی اُٹھتی ہوں، ابھی اُٹھتی ہوں کا ورد کرتے ہوئے اُسے دوبارہ نیند آ گئی۔

اس وقت انسان گہری نیند نہیں سوتا۔ کہتے ہیں کہ شیطان اس خیال سے کہ کہیں بندہ اپنے رب کے لیے نہ اُٹھ کھڑا ہو۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس طرح حرکت دیتا ہے کہ ایک سرور کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بندہ ہر شے سے غافل ہو جاتا ہے اور پھر شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ہنستا ہوا جاتا ہے۔ جاتے جاتے وہ بندے کو ایک جھٹکا ضرور دے جاتا ہے۔ جبھی تو سورج سوا نیزے پر آتے ہی نیند پوری طرح غائب ہو جاتی ہے، پھر سوائے ندامت کے کچھ پاس نہیں ہوتا۔

وہ بھی دوبارا ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

صبح کا اجالا کمرے کے اندر تک چلا آیا تھا۔ ذرا سی گردن موڑ کر اُس نے دیکھا۔ اسماء اپنے ہی کسی خیال میں مگن کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اُسے اُٹھتے دیکھ کر وہ یوں کھڑکی کے پاس سے ہٹی جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو، پھر فوراً اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"تم نماز نہیں پڑھتیں؟"

"سوری! مجھے اُٹھنے میں دیر ہوگئی۔" وہ واقعی شرمندہ ہوئی۔

"کل سے میں تمہیں اُٹھادوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو اسماء موجود نہیں تھی۔

اُس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا، کپڑے میلے ہو رہے تھے اور بال بھی کچھ اُلجھے اُلجھے سے تھے۔ وہ بیگ میں سے کپڑے نکال کر دوبارہ باتھ روم میں چلی گئی۔ نہانے سے طبیعت خاصی ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ وہ گیلے بالوں میں برش کرتی ہوئی پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔

سامنے دور دور تک منظر بہت خوبصورت تھا۔ اس حویلی کی چاردیواری سے باہر بھی صاف نظر آ رہا تھا...... وقفے وقفے سے لگے کینو کے پیڑ جن پر ہرے اور پیلے کینو جھولتے نظر آ رہے تھے اور اس طرف سے آتی ہوائیں جیسے انہی کی مہک چرائے آ رہی تھیں۔

اُس نے طویل سانس لے کر ساری مہک اپنے اندر اُتار لی اور ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر ذرا سا آگے جھکی تو نیچے لان میں کوئی کھڑا نظر آیا۔

اُس کی طرف پشت کیے وہ ایکسر سائز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر پیروں کو مضبوطی سے جماتے ہوئے پیچھے کی طرف جھک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بہت نیچے جھک گیا اور جہاں وہ اُسے دیکھ کر چونکی۔ وہاں وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر پورا اُس کی طرف گھوم گیا۔

"اے لڑکی اندر جاؤ۔" وہ وہیں سے چلا کر بولا اور وہ اس کے لہجے پر حیران ہوگئی۔

"اندر جاؤ۔" وہ پھر چیخا اور اُسے بھی غصہ آ گیا کہ وہ کون ہوتا ہے، یوں رعب جمانے والا۔

"کیوں؟" وہ بھی اونچی آواز میں تنک کر بولی۔

"میں کہتا ہوں ہٹو یہاں سے۔" وہ نفی میں سر ہلا کر اطمینان سے بالوں میں برش کرنے لگی۔ کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بھاگتا ہوا اندر جا رہا تھا اور ابھی وہ جھک کر نیچے دیکھنا ہی چاہتی تھی کہ وہ دندناتا ہوا پیچھے اُس کے سر پر پہنچ گیا۔

"یہ شہر نہیں ہے، سمجھیں تم؟" اس کے ساتھ ہی اُسے کلائی سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔

پھر بالکنی کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر کے اُس کی طرف پلٹا تو وہ کچھ حیران حیران سی کھڑی تھی۔

"یہ دروازہ کس نے کھولا تھا۔" وہ پوچھنے لگا۔

"میں نے۔" وہ برش سے اپنی طرف اشارا کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟"

"یہ دیکھنے کے لیے کہ یہاں کیا ہے؟"

"دیکھ لیا ناں، آئندہ مت کھولنا۔"

"کیوں؟" وہ اُسی کے لہجے میں بولی۔

"یہاں سے بے پردگی ہوتی ہے۔"

"ارے!" وہ خواہ مخواہ ہنسی۔ "زوار شاہ بے پردگی کا اتنا ہی خیال تھا تو یہ بالکنی بنائی کیوں؟"

"اگر ہمیں معلوم ہوتا سارا تجمل شاہ! کہ کبھی تم جیسی بد لحاظ لڑکی کا یہاں آنا ہوگا تو ہم کبھی یہ بالکنی نہ بنواتے۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔"

"اچھا!" وہ تمسخرانہ انداز سے ہنسا پھر براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"سُنو! یہ کسی معمولی آدمی کا گھر نہیں ہے اور نہ ہی یہاں کی لڑکیاں اتنی ارزاں ہیں کہ راہ چلتے ہوئے لوگ انہیں بالکنیوں میں کھڑا دیکھیں۔ تم نے اگر یہاں رہنا ہے تو اپنا نہیں تو اس حویلی کی عزت کا پاس ضرور رکھنا ہوگا۔"

"زوار شاہ!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑا۔

"آغا جی کو اگر معلوم ہوگیا کہ تم بالکنی میں کھڑی تھیں تو وہ تمہارے مہمان ہونے کا لحاظ بھی نہیں کریں گے۔"

وہ چپ چاپ اُس کی طرف دیکھتی رہی۔

"ویسے تم اچھی لڑکی ہو۔" وہ جاتے جاتے ایک دم پلٹ کر بولا۔

اُس نے اس کی طرف سے رُخ موڑ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ اُسے اپنے بالکل قریب کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

وہ اتنا اُونچا توانا مرد۔ یوں لگا جیسے اسے اپنی مٹھی میں قید کرلے گا۔ دل ٹھہرنے لگا اور سانسیں رکنے لگیں تو وہ قدم بڑھا کر اس سے دور چلی گئی۔ پھر اُسے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تب اُس نے پلٹ کر دیکھا وہ جا چکا تھا۔

"میرے خدا!" کتنی دیر سے سینے میں رُکی سانس ہونٹوں کی تہ سے آزاد کی اور بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بیڈ پر گر گئی۔

"عجیب آدمی ہے۔" وہ سوچنے لگی۔ "کبھی شعلہ، کبھی شبنم جیسا اور اس کی بولتی آنکھوں میں جانے کیا سحر ہے کہ اپنا آپ بھولنے لگتا ہے اور میں اس کے سامنے نروس کیوں ہونے لگتی ہوں۔" وہ اپنے آپ سے اُلجھنے لگی۔

"سارا!" شاہ اُسے پکارتی ہوئی اندر چلی آئی تو وہ اپنے خیال سے چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے، اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟"

"کیا اکیلے بیٹھنا بھی منع ہے؟" وہ بلاارادہ کہہ گئی۔

"نہیں، میرا مطلب ہے...... آؤ نیچے چلو، ناشتا نہیں کرو گی؟"

"ناشتا تو میں نے کرلیا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کب؟" شاہ متعجب ہوئی۔

"ابھی زوار شاہ نے مجھے بڑا زبردست قسم کا ناشتا کروایا ہے۔"

"کیا؟" شاہ کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں بھئی۔" وہ ہنسی اور پھر اُسے اپنے بالکنی میں جانے کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ اُس کی ساری بات سُن کر شاہ کہنے لگی۔

"تم برا مت ماننا سارا! اصل میں یہاں کا ماحول ایسا نہیں ہے۔"

"چلو، میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی لیکن زوار شاہ کو آرام سے مجھے یہ بات سمجھانی چاہئے تھی، وہ تو

یوں چلانے لگا جیسے میں نے جانتے بوجھتے یہاں کے قوانین کی خلاف ورزی کی ہو۔"

"اُس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں اور سُنو! اُس کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا۔ وہ ذرا الگ مزاج کا مالک ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اصل میں آغا جی اُسے بہت چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گئی۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "آغا جی کی بے جا طرف داری نے اسے بدتمیز بنا دیا ہے۔"

"نہیں، خیر وہ بدتمیز تو نہیں ہے۔"

"صرف بدتمیز نہیں بلکہ اکھڑ، بدمزاج اور مغرور بھی ہے۔ لیکن تم اُسے سمجھا دینا شاہ! کہ آئندہ مجھ سے اونچی آواز میں بات نہ کرے۔ میں اس لہجے کی عادی نہیں ہوں۔" اپنی بے عزتی یاد کر کے اُسے ایک بار پھر غصہ آنے لگا۔

"پلیز! اپنا موڈ مت خراب کرو۔" شاہ التجائیہ لہجے میں بولی۔ "نیچے چلو، سب ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ کچھ خفا سی اُس کے ساتھ چل پڑی۔

ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی اُس نے قدرے اُونچی آواز میں سب کو سلام کیا اور ڈیڈی کے برابر جا بیٹھی۔

رات اُس نے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا، اس لیے بڑی زبردست قسم کی بھوک لگی تھی، لیکن جب ٹیبل پر نظر پڑی تو اس پر جھنجلاہٹ سوار ہوگئی۔ اصل گھی میں تلے ہوئے پراٹھے، مکھن سے بھرا ڈونگا، لسی اور مختلف قسم کے حلوہ جات...... یہاں سے وہاں تک ٹیبل پر اسی قسم کی چیزیں تھیں...... وہ بے چارگی سے ڈیڈی کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا تو وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"میں یہ سب نہیں کھاؤں گی۔"

"پھر؟"

"مجھے سلائس چاہئیں۔"

"آئی ایم سوری بیٹا! میں کہنا بھول گیا کہ تم......!"

"کیا بات ہے؟" بی بی جان انہیں سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"کچھ نہیں بی بی جان!" ڈیڈی اُسے خاموش رہنے کا اشارا کرتے ہوئے بولے۔

"میرا خیال ہے بی بی جان! سارا کو یہ ناشتا ہضم نہیں ہوگا۔"

زوار اس کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اُس کے لیے تو آپ چائے کے ساتھ پاپے

منگوا دیجیے۔"

"پاپے نہیں ڈبل روٹی، اگر یہاں ملتی ہو تب۔"

اس کا بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن اس کی بات پر خاموش نہیں رہ سکی۔

لمحہ بھر کو سب نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تھا۔ شاید ان کے لیے عجیب سی بات تھی کہ بزرگوں کی موجودگی میں وہ زوار شاہ سے بات کر رہی تھی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہاں ہر چیز ملتی ہے۔ وہ چیزیں بھی جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔"

"جیسے کہ تم! بڑی نایاب شے ہو زوار شاہ! واقعی اس سے پہلے میں نے تمہارے جیسا بندہ نہیں دیکھا تھا۔"

"سارا!" آغا جی کا سرد لہجہ لمحہ بھر کو اس کی رگوں میں لہو منجمد کر گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"لڑکیاں اس طرح بات نہیں کرتیں۔"

وہ جواب دینا چاہتی تھی کہ ڈیڈی نے اُس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کے لیے کہا تو وہ اُسے گھورتی ہوئی کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

"ناشتا نہیں کرو گی؟" آغا جی پوچھنے لگے۔

"آئی ایم سوری آغا جی! مجھ سے یہ سب نہیں کھایا...... جائے گا۔"

"سب کھانے کے لیے کون کہہ رہا ہے؟" وہ پھر بولنے سے باز نہ آیا۔

"آغا جی! اگر یہ اس طرح بات کرے گا تو مجھے بھی جواب دینا پڑے گا۔ میں اس کی بکواس پر زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکوں گی۔"

"زوار شاہ! بہرحال یہ تمہاری مہمان ہے کچھ لحاظ کرو اور پھر شہر سے آئی ہے، تمہاری باتیں برداشت نہیں کرے گی۔" آغا جی اُسے سمجھانے لگے اور وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر باہر چلی آئی۔

"وہ اگر الگ مزاج کا بندہ ہے تو میں بھی ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔"

اپنے کمرے میں آتے ہوئے اُس نے سوچا۔

"اب تک اُس نے صرف حویلی کے اندر لڑکیاں دیکھی ہیں، جو اس کی بری بھلی سب برداشت کر لیتی ہوں گی، میں تو مزاج ٹھکانے لگا دوں گی، بھلے سے آغا جی کی ڈانٹ سننی پڑے۔"

"ویسے ہے زبردست شے۔" اُس نے اعتراف کیا۔

"میں نے واقعی پہلے کبھی اس جیسا بندہ نہیں دیکھا۔ اپنی تمام تر بدتمیزیوں کے باوجود اچھا لگتا ہے۔ آنکھوں میں تو جیسے شرارے بھرے ہیں کہ زیادہ دیر تک ان میں دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔"

"توبہ! میں کیا سوچنے لگی۔"

اُس نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

بھوک سے اب پیٹ میں سے آوازیں آنے لگی تھیں اور سر بھی چکرا رہا تھا۔ اُس نے سوچا۔ صبا آپی سے کہے، وہ اس کے لیے کچھ کھانے کا انتظام کریں اور ابھی وہ اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر آنکھیں کھول کر اُدھر دیکھنے لگی۔

جو خاتون ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئیں، انہیں دیکھ کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور بڑھ کر ٹرے اُن کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے بولی۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی، مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹی۔" پُرشفقت لہجے نے اُسے مزید شرمندہ کر دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کروں؟"

"تم میرے لیے اسماء ہی کی طرح ہو، اگر مناسب سمجھو تو امی ہی کہہ لو۔"

"میں آپ کو امی ہی کہنا چاہ رہی تھی، پھر خیال آیا کہیں آپ کو برا نہ لگے۔"

"برا لگنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ میں بہرحال تمہاری ماں ہوں، سوتیلی ہی سہی، اور ہاں مجھے برا نہیں لگے گا۔"

"آپ جیسی مہربان خاتون سوتیلی ماں نہیں ہو سکتیں۔" اُس نے ٹرے رکھ کر اُن کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"چلو، اب ناشتا کر لو، تم نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کندھوں پر دباؤ ڈال کر بٹھا دیا۔

"آپ بھی بیٹھیں ناں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ اس کے برابر بیٹھ گئیں تو اُس نے ڈرتے ڈرتے ٹرے کی طرف دیکھا کہ کہیں پھر وہی چیزیں تو نہیں سامنے آ گئیں، لیکن سلائس اور آملیٹ کے ساتھ چائے دیکھ کر وہ خوش ہو گئی اور جلدی جلدی اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"خالی پیٹ چائے مت پیو، پہلے کچھ کھا لو۔"

انہوں نے کہا تو اُس نے کپ دوبارہ ٹرے میں رکھ دیا اور دو سلائس کے درمیان آملیٹ رکھ کر ان سے کہنے لگی۔

"آپ لیں ناں۔"

"نہیں بیٹی! میں ناشتا کر چکی ہوں۔"

"چائے؟"

"چائے میں نہیں پیتی اور اب تم باتیں کرنے کے بجائے ناشتا کرو۔"

اُس نے سلائس دانتوں سے توڑا، ساتھ ہی چائے کا گھونٹ بھی پیا اور پھر ابھی وہ ناشتا کر رہی تھی کہ

ڈیڈی آ گئے۔

وہ بھی شاید اس سے ناشتے کا پوچھنے آئے تھے اور جب اُسے چائے پیتے ہوئے دیکھا تو اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے بولے۔

"خدا کا شکر ہے، تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔"

وہ ہنسی اور برابر بیٹھی زہرہ بیگم کی طرف اشارا کرتے ہوئے بولی۔

"امی کی مہربانی سے۔" ڈیڈی شاید اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اس کے اشارے پر جو دیکھا تو ٹھٹک سے گئے جبکہ زہرہ بیگم سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"بیٹھیں ڈیڈی! میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔"

"نہیں بیٹا! میں چلوں۔" وہ پلٹے تو زہرہ بیگم نے پکار لیا۔

"تجمل شاہ! بیٹیوں کی بات رد نہیں کرتے۔"

ڈیڈی اُس کی طرف دیکھنے لگے تو اُسے اپنی یہاں موجودگی عجیب سی لگنے لگی۔

"آپ بیٹھیں ڈیڈی، میں اور چائے لے کر آتی ہوں۔ یہ کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

وہ اسی بہانے ٹرے اُٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔

سیڑھیوں سے اُتر کر ہال کمرے میں آئی تو کچھ کنفیوز ہو گئی کیونکہ کچن کا راستہ معلوم نہیں تھا اور اس وقت ہال میں کوئی موجود بھی نہیں تھا، جس سے پوچھ لیتی۔

اپنے آپ کو انتہائی بے وقوف تصور کرتی ہوئی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ سامنے کے دروازے سے زوّار شاہ آتا نظر آیا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے رُخ موڑ لیا اور یوں پوز کرنے لگی جیسے اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔

"تمہارے ہاں ناشتا پورے گھر میں گھوم پھر کر کیا جاتا ہے۔" وہ قریب آ کر ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"میں ناشتا کر چکی ہوں۔"

"تو ٹرے رکھ دو۔"

"کہاں۔ رکھوں؟"

"میرے سر پر۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"ہنس کیوں رہی ہو؟"

"میں تصور کی آنکھ سے تمہیں، سر پر ٹرے اُٹھائے دیکھ رہی ہوں۔" لمحہ بھر کو اُس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیلی پھر فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

"جاؤ، کچن میں رکھ کر آؤ۔"

"کچن کا راستہ نہیں معلوم۔"

"چچ چچ...... کیسی لڑکی ہو کہ کچن کا راستہ ہی نہیں معلوم۔" اُس نے مذاق اُڑایا۔

"یہ میرا گھر نہیں ہے۔"

"نہیں ہے، لیکن ہو تو سکتا ہے۔"

بس یہیں وہ نروس ہو جاتی تھی۔ ذو معنی بات اور پھر آنکھوں کی زبانی بہت سی اُن کہی داستانیں اور ستم گری آنکھیں بھی تو غضب کی تھیں، پل میں تسخیر کر لیتیں۔

"زوّار شاہ! مجھے بتاؤ۔ کچن کس طرف ہے؟" وہ اُلجھ کر بولی اور وہ محظوظ ہو کر ہنس پڑا۔

"دائیں ہاتھ پر چلی جاؤ گیلری کے اختتام پر کچن ہے۔" وہ فوراً اسی طرف چلی گئی۔

کچن میں داخل ہوتے ہی اُس نے ٹرے پٹخنے کے سے انداز میں سنک پر رکھی اور چائے بنانے کے لیے کیتلی تلاش کرنے لگی۔

"کیا چاہیے بی بی؟" ملازم اُس سے پوچھنے لگا۔

"کیتلی کہاں ہے، میں چائے بناؤں گی۔"

"میں بنا دیتا ہوں۔"

"میں!" اُس نے پُر سوچ انداز میں اُس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

"ہاں، جلدی سے بناؤ اور اسماء بی بی کے کمرے میں دے آؤ۔"

اس کے ساتھ ہی وہ کچن سے نکل آئی۔ دوبارہ ہال کمرے تک آئی تو وہ ٹیلی فون کے پاس کھڑا اُسے پکار رہا تھا۔

"منو! تمہارا فون ہے۔"

"میرا!" وہ اپنی طرف اشارا کر کے سوچنے لگی۔

"جلدی آؤ، کوئی سحر صاحبہ ہیں۔"

"ارے سحر آپی!" وہ چیخی اور بھاگ کر اُس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

"ہاں سحر آپی! کیسی ہیں آپ، ممی کیسی ہیں؟" اُسے نظر انداز کیے وہ روانی سے بولنے لگی۔

"دوسرے کی بات بھی سُن لو۔" وہ ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ ان سُنی کرتی ہوئی اپنی کہے گئی۔

"نومی آپ کے پاس کھڑا ہے، ذرا اس سے بات کرائیں تو......"

"یہ نومی کون ہے؟" جس انداز سے اُس نے پوچھا وہ شرارت پر آمادہ ہو گئی اور خاص طور سے اُسے سُنا کر کہنے لگی۔

"نومی! تم ہمارے ساتھ آتے تو ہم خوب انجوائے کرتے۔ میں تو ایک دن میں ہی بور ہو گئی ہوں۔ پتا ہے نومی یہاں بڑے نایاب جانور پائے جاتے ہیں۔"

اشارا اسی کی طرف تھا اور وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اُس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ کر کریڈل پر پٹخ دیا۔

''ارے!'' وہ انتہائی معصوم بن کر کہنے لگی۔ ''تم نے تو مجھے بات ہی نہیں کرنے دی۔''

''شٹ اَپ!'' وہ چیخا اور پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔ جبکہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

''بی بی جائیے۔''

ملازم نے کہا تو وہ چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔

پھر اُسے اسماء کے کمرے میں جانے کا کہہ کر خود آغا جی اور بی بی جان کے پاس آ گئی۔

''آؤ پتّر!'' آغا جی نے کہا تو وہ قدرے جھجکتی ہوئی اُن کے پاس جا بیٹھی۔

''تمہیں یہاں کیسا لگ رہا ہے؟'' وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگے۔

''بہت اچھا، پتا ہے آغا جی! مجھے آپ سے ملنے کی بہت آرزو تھی اور میں بہت پہلے یہاں آنا چاہتی تھی۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''آغا جی! آپ کو ڈیڈی سے اتنی سنجیدگی سے ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خوامخواہ ایک لمبا عرصہ آپ دونوں ایک دوسرے سے جدا رہے۔''

آغا جی حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ بات تو کبھی ان کی اپنی اولاد نے کہنے کی جرأت نہیں کی تھی اور وہ کہہ رہی تھی۔

''ڈیڈی نے شادی ہی تو کی تھی، کوئی جرم تو نہیں کیا تھا، پھر آپ نے یہاں بھی اُن کی شادی کر دی اور آغا جی جب آپ نے اپنی خواہش پوری کر ہی لی تھی تو آپ کو سمجھوتا بھی کر لینا چاہیے تھا۔ ممی کو اگر اس گھر میں آنے دیتے تو ڈیڈی دونوں بیویوں کو برابر کے حقوق دے سکتے تھے۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر آغا جی کے بولنے کا انتظار کرتی رہی، لیکن جب انہوں نے کچھ نہیں کہا تو پھر کہنے لگی۔

''مجھے امی (زہرہ بیگم) کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے ڈیڈی کے نام پر اپنی زندگی کے قیمتی سال گنوا دیے۔ اسماء الگ باپ کی شفقت سے محروم رہی۔ اب تو زندگی اس اسٹیج پر ہے کہ ڈیڈی گزرے ماہ و سال کی تلافی بھی نہیں کر سکتے۔ ممی کبھی بھی نہیں چاہیں گی کہ ڈیڈی مستقل طور پر یہاں آ جائیں۔ ہاں پہلے ایسا ممکن تھا، لیکن اس وقت آپ نے نہیں چاہا۔''

''ساری غلطی تمہارے باپ کی ہے۔'' آغا جی نے سارا الزام ڈیڈی کے سر رکھ دیا۔

''جب وہ جانتا تھا کہ یہاں اس کی منگ موجود ہے تو پھر اُس نے وہاں شادی کیوں کی؟''

''منگنی ہی تو ہوئی تھی، نکاح تو نہیں ہوا تھا اور پھر اب تو نکاح میں بھی پائیداری نہیں رہی۔ بات ہی ختم۔''

''پتّر! یہ کوئی گڈے گڈی کا کھیل نہیں ہے اور پھر ایسا شہروں میں ہوتا ہوگا۔ ہمارے ہاں تو ایک بار زبان پر جو نام آ جائے پھر اس کے بعد کسی اور نام کی گنجائش نہیں رہتی اور جہاں تک زہرہ کا سوال ہے تو اسے میں نے یہاں لا کر غلطی نہیں کی۔ تم نہیں جانتیں پتّر! اگر میں اسے اس گھر میں نہ لاتا، تب بھی وہ ساری زندگی اسی طرح بیٹھی

رہتی۔ کوئی اس سے شادی پر تیار نہ ہوتا، لوگ باتیں...... الگ بناتے۔ یہاں آ کر اُس نے کم از کم عزت سے تو زندگی گزار دی۔''

''آغا جی!'' وہ حیران ہو کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم یہاں کے رواجوں کو نہیں جانتیں۔'' پھر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہنے لگے۔

''بہر حال، گزرے وقت کو ہم واپس نہیں لا سکتے۔ غلطی مجھ سے بھی ہوئی۔ تم اپنی ماں سے کہنا۔ وہ اپنا دل بڑا کرے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ اپنی بنی بنائی زندگی چھوڑ کر یہاں آ جائے۔ یہ یقیناً اُس کے لیے بہت مشکل ہوگا، لیکن اتنا تو وہ کر سکتی ہے کہ مہینے میں ایک آدھ بار تجمل شاہ یہاں آنا چاہے تو وہ اُسے روکے ناں۔''

''ممی، ڈیڈی کو یہاں آنے سے نہیں روکیں گی، آپ اس طرف سے اطمینان رکھیں۔'' اُس نے کہا تو آغا جی نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''تم تو بڑی سمجھ دار ہو پتّر۔''

''آپ کی دعائیں ہیں۔''

وہ ممی اور بی بی جان کی طرف دیکھنے لگی، جو خاصی حیران سی بیٹھی تھیں۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی سی لڑکی آغا جان سے اس طرح بات کر سکتی ہے۔

زوار شاہ جسے آغا جان اتنا چاہتے تھے، اُس نے بھی کبھی یہ موضوع نہیں چھیڑا تھا اور وہ نہ صرف اس موضوع پر بات کر گئی تھی بلکہ بڑی خوبصورتی سے آغا جان کو الزام دے گئی تھی۔

''تمہارا باپ کہاں ہے؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''وہ اوپر ہیں اسماء کے کمرے میں۔'' پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔

''اچھا اب آپ آرام کریں، میں صبا آپی کے پاس جا رہی ہوں۔'' دروازے تک جا کر پھر پلٹ آئی۔

''آغا جی! آپ کی جاگیر میں آموں کے باغ بھی ہیں؟''

''ہاں تمہیں آم پسند ہیں؟''

''آم تو پسند ہیں ہی، لیکن اس سے کہیں زیادہ شوق مجھے باغ دیکھنے کا ہے۔''

''اچھا!'' آغا جی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ''میں جہانگیر سے کہوں گا تمہیں لے جائے گا۔''

''صرف مجھے نہیں آغا جی! ہم سب چلیں گے...... کل ہی......!''

آغا جی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ شکریہ کہتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی، پھر اسماء کے کمرے کی طرف جاتے جاتے رُک گئی۔ محض اس خیال سے کہ اسے دیکھ کر ڈیڈی نادم نہ ہونے لگیں۔ کچھ سوچتی ہوئی صبا آپا کے کمرے میں آ گئی۔ باقی کزنز بھی وہیں موجود تھیں۔

''تم کہاں تھیں؟'' ہما اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

''آغا جی کے پاس۔''

"لیکن میں نے تو تمہیں زڈارشاہ کے ساتھ دیکھا تھا۔" جانے کیا تھا، ہما کے لہجے میں اور پتا نہیں وہ کیا جتانا چاہ رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی۔

"میری زڈارشاہ سے مڈبھیڑ ضرور ہوئی تھی، لیکن میں اس کے ساتھ نہیں تھی۔" وہ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"آغاجی آج رقبے پر نہیں گئے۔" ثناء، صبا آپی سے پوچھ رہی تھی، لیکن جواب اُس نے دیا اور اُٹھ کر پیچھے ہوتے ہوئے بولی۔

"پتا ہے صبا آپی! میں نے آغاجی سے کہا ہے، وہ ہمیں اپنے باغوں کی سیر کرائیں۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟" نادیہ نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"کل چلیں گے۔"

"واقعی؟" سب ایک ساتھ چیخیں۔

"ہاں، لیکن کیا تم لوگ کبھی وہاں نہیں گئے؟"

"گئے ہیں، اُس وقت جب چھوٹے تھے۔" سعدیہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

"اب اتنا دل چاہتا ہے جانے کو، لیکن آغاجی سے کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔"

"چلو تو کل چلیں گے۔"

"ہاں، واقعی بڑا مزا آئے گا۔" پھر کتنی دیر تک وہ سب آنے والی کل کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں۔

صبح اسماء نے اسے نماز کے لیے اُٹھایا تو وہ فوراً اُٹھ گئی۔ کل جس طرح اسماء نے اُسے ٹوکا تھا اس سے واقعی اسے بڑی شرمندگی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ جلدی سے وضو کر کے اسماء کے ساتھ ہی جائے نماز پر کھڑی ہوگئی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی نماز نہیں پڑھتی تھی، بس صبح کی نماز نیند کی وجہ سے ہمیشہ قضا ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی نماز سے فارغ ہوئی تو آنکھوں میں نیند کے آثار موجود تھے۔

"اب اگر سونا چاہو تو سو جاؤ۔" اسماء اُس کی آنکھوں میں اُترے گلابی ڈورے دیکھ کر بولی۔

"نہیں، اب اگر سوئی تو سر میں درد ہو جائے گا۔ ہاں البتہ چائے مل جائے تو میرا خیال ہے، میں خود ہی بنا لاتی ہوں۔"

اسماء نے روکنا چاہا، لیکن وہ اپنی بات ختم کرتے ہی تیزی سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ چائے کی ٹرے اُٹھائے واپس آئی تو اسماء کل کی طرح کھڑکی کے پاس کھڑی اپنے ہی کسی خیال میں گم تھی۔ آہٹ پر چونکی اور فوراً کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔

"اتنی ساری چائے پیو گی؟" اسماء ٹی پاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"کیوں آپ نہیں پئیں گی؟"

"نہیں، میں چائے نہیں پیتی۔"

"پی کر دیکھیں، اچھی لگے گی۔"

"نہیں بھئی، مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ چائے بالکل نہیں پیتیں تو میں اپنے لیے صرف ایک کپ بنا کر لاتی۔"

اُس نے صرف ایک کپ میں چائے ڈالی پھر کپ لے کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا دروازہ کھول کر بالکنی میں چلی جائے، لیکن کل کا واقعہ بھولی نہیں تھی اور کل ہی کی بات یاد کر کے اس نے کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہ اس وقت جوگنگ کر رہا تھا۔ لمحہ بھر کو وہ بھول گئی کہ کہاں کھڑی ہے، بے اختیار اُسے پکار لیا۔

"زڈارشاہ! اُس نے فوراً سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ چائے کا کپ اسے دکھاتے ہوئے بولی۔

"چائے پیو گے؟" شاید اچھے موڈ میں تھا، جو اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"اُوپر آ جاؤ۔"

اُس نے کہا تو جواب میں اُس نے نیچے آنے کا اشارا کیا۔

وہ فوراً کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی اور دوسرے کپ میں چائے ڈالنے لگی۔ اپنے کپ میں بھی اُس نے مزید چائے ڈالی۔

اسماء خاموش کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔

"اوکے اسماء! میں نیچے جا رہی ہوں۔" وہ بڑی عجلت میں دونوں کپ لے کر چل پڑی۔

اگر پل بھر کو بھی وہ اسماء کی طرف دیکھ لیتی تو زڈارشاہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیتی، لیکن اُس نے دیکھا ہی نہیں۔

پچھلی طرف لان میں آئی تو وہ مخملیں گھاس پر ٹانگیں سیدھی کیے بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھا تو نظریں اُسی پر جما دیں اور وہ جو بڑے اعتماد سے چلی آ رہی تھی اس کی نظروں کی گرفت میں آ کر نروس ہوگئی۔ دل عجب انداز سے دھڑکنے لگا تھا چال الگ غیر متوازن ہو رہی تھی۔

"زڈارشاہ! اس طرح مت دیکھا کرو۔" وہ قریب آ کر کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیوں؟" وہ اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا اور وہ کیسے کہہ دیتی کہ میرے اندر ہلچل مچ جاتی ہے اور میں کچی ڈور سے بندھی چلی آتی ہوں۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔

"پکے بے ایمان لگتے ہو۔" وہ ہنسا اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی کلائی تھام لی۔

"کیا کر رہے ہو، چائے گر جائے گی۔"

"صرف چائے؟" وہ شوخی سے بولا اور کلائی کو اپنی طرف کھینچ کر اُسے پاس بٹھا لیا۔ وہ اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے لگی کیونکہ ایسے ہی لمحوں میں اُس کی بے حد خوبصورت آنکھوں میں بہت سی اَن کہی داستانیں تحریر

ہو جایا کرتی تھیں۔

''یہاں کا موسم بہت اچھا ہے۔'' وہ اُس کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کی غرض سے بولی۔

''پھول ہمارے ہاں بھی کھلتے ہیں، لیکن یہاں مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی نئی بات ہو۔''

''جانتی ہو، جب نئے پن کا احساس ہو تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اس کا مطلب یہ ہوتا ہے سارا! کہ ہمارے اندر نئے جذبے جنم لے رہے ہیں۔ خوبصورت جذبے جن کا عکس ہمیں ہر شے میں نظر آنے لگتا ہے، جبھی تو دنیا اچانک بہت حسین ہو جاتی ہے۔''

وہ بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سیدھا سیدھا لیٹ گیا اور دور آسمانوں پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے مجھے یہاں کی ہر شے روزمرہ کی طرح بہت عام سی لگ رہی تھی۔ وہی پھول جو روز کھلتے ہیں، وہی شبنم جو لمحہ بھر کو پورے وجود میں سرد لہریں دوڑا دیتی ہے اور وہی ہوائیں جو مالٹے اور کینو کی مہک چرائے اس اونچی دیوار سے اندر چلی آتی ہیں لیکن اب اچانک ان گلابوں کی پتیاں شوخی پر آمادہ ہو کر مسکراتی لگ رہی ہیں۔ شبنم کے قطرے انمول موتیوں کو مات دیتے لگ رہے ہیں اور مہکتی ہوائیں جانتی ہو سرگوشیوں میں کیا کہہ رہی ہیں؟''

وہ بے حد خاموش نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کائنات میں اُترتی یہ ڈھیر ساری خوبصورتیاں اور نیا پن تمہارے وجود کا مرہونِ منت ہے۔''

''زرّار شاہ!'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اندر سے نکل کر صبا آپی اسے پکارنے لگیں۔ وہ اُن کی طرف متوجہ ہوئی تو انہوں نے وہیں سے کہا۔

''آغا جی کہہ رہے ہیں یہی وقت ہے جانے کا۔''

''ارے!'' وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔'' وہ اُس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''تمہیں نہیں پتا، آج ہم آموں کے باغ دیکھنے جا رہے ہیں۔''

''آغا جی بھی جائیں گے؟''

''پتا نہیں۔'' وہ دونوں کپ اُٹھا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ آغا جی ہال کمرے میں موجود تھے، اُسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

''پُتّر! یہ جہانگیر شاہ تم لوگوں کو لے جائے گا۔''

''آپ نہیں چلیں گے؟''

''نہیں، تم لڑکیاں بالیاں ہو آؤ۔''

''آغا جی! میں بھی چلا جاتا ہوں۔ جہانگیر لالہ کہاں اتنی ساری بھیڑ بکریوں کو سنبھال سکیں گے۔'' اُس کے شرارت سے کہنے پر وہ چیخ پڑی۔

''آغا جی، یہ ہمیں بھیڑ بکریاں کہہ رہا ہے۔''

''نہ پُتّر! ایسے نہیں کہتے۔'' آغا جی گو کہ اس کی بات پر محظوظ ہوئے تھے لیکن سارا کا دل رکھنے کی خاطر ٹوک

''جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ، اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہئے۔''

اس نے کہا تو وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر آ گئی۔

لڑکیوں میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اپنے طور پر وہ بہت جلدی تیار ہو کر نکلی تھی۔ پھر بھی لڑکیاں جلدی جلدی کا شور مچانے لگیں۔

''اتنی بھی جلدی کیا ہے؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''جلدی یوں ہے سارا ڈیر! کہ اگر دھوپ میں شدت آ گئی تو ہم راستے ہی میں تھک جائیں گے، پھر سارا دن وہاں بور گزرے گا۔''

''لو میں تیار ہو گئی۔'' وہ برش رکھ کر پلٹی اور بیڈ سے دوپٹا اُٹھا کر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

''بال تو باندھ لو۔'' ہما نے ٹوکا۔

''ابھی گیلے ہیں، سوکھ جائیں تو باندھ لوں گی۔''

''لیکن بی بی جان لڑکیوں کے کھلے بال پسند نہیں کرتیں انہوں نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گی۔'' سعدیہ نے کہا تو اُس نے دوپٹا پھیلا کر سر پر اوڑھ لیا اور صبا آپی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب ٹھیک ہے۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو سب ایک دوسرے کے پیچھے کمرے سے نکلیں اور سیڑھیاں اُترتے ہوئے نیچے آ گئیں۔

آغا جی اور بی بی جان کے ساتھ ڈیڈی اور امی بھی موجود تھے۔ اُس نے دونوں کو سلام کیا اور اپنے جانے کے بارے میں بتانے لگی۔

''گاڑی تیار ہے۔'' وہ اندر آتے ہوئے بولا تو وہ بے خیالی میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

بلیو جینز پر اسکائی بلیو دھاری دار شرٹ میں اس کا دراز قد اور نمایاں لگ رہا تھا۔

''جاؤ پُتّر! اور ہاں زرّار شاہ! شام ڈھلنے سے پہلے آ جانا۔'' آغا جی کے کہنے پر اُس نے بڑی سعادت مندی کا اظہار کیا۔

''آپ فکر نہ کریں آغا جی! ہم جلدی آ جائیں گے۔''

''او کے ڈیڈی!'' اُس نے ہمیشہ کی طرح کہیں جانے سے پہلے ڈیڈی کی گردن میں بازو ڈال دیے اور جب انہوں نے اس کی پیشانی چومی تو وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔

''یہ تو مجھے کوئی اسکول وین لگ رہی ہے۔'' وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''واقعی کسی اسکول سے مستعار لی

ہے۔"

"نہیں بھئی، یہ خاص ہمارے لیے ہے۔"

"اچھا!" وہ ہنسی۔ "کم از کم شیشوں پر سے پردے تو ہٹا دو تا کہ باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔"

"اگر تمہیں باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونا ہے تو آگے زوار شاہ کے ساتھ جا بیٹھو، ہمیں یہ پردے ہٹانے کی اجازت نہیں ہے۔"

ہما کا وہی انداز تھا سمجھ میں نہ آنے والا، اس لیے وہ خاموش ہو رہی اور پھر بقیہ تمام راستہ اسی طرح کٹا۔ کوئی اس سے بات کرتا تو جواب دیتی، ورنہ وہی خاموشی۔

جہانگیر لالہ نے سیدھا ریسٹ ہاؤس کے پاس جا کر گاڑی روکی۔ وہ سب نیچے اُترے تو بوڑھا چوکیدار استقبال کے لیے موجود تھا۔

"بابا! کچھ ناشتا وغیرہ بھی تیار کیا ہے یا نہیں۔" زوار شاہ اُترتے ہی پوچھنے لگا۔

"سب تیار ہے مالک! مجھے رات ہی بڑے چوہدری جی نے اطلاع کروادی تھی۔"

"چلو بھئی، پہلے پیٹ پوجا۔" وہ جہانگیر لالہ کے ساتھ آگے چل پڑا تو اُن سب نے بھی اس کی تقلید کی۔

ناشتے میں وہی سب چیزیں تھیں، جو اُس نے گزشتہ روز کھانے سے معذرت کر لی تھی۔ وہ طویل سانس۔ کر دسترخوان پر بیٹھنے سے پہلے ہی وہاں سے ہٹ گئی اور کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔

دور دور تک ہر شے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ طلوع ہوتے سورج کی سنہری کرنوں نے ماحول کو انوکھا حسن بخش دیا تھا۔ مخملیں گھاس پر شبنم کے قطرے چمکتے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے کسی کی سُتواں ناک میں لونگ لشکارے مارتا ہو۔

"سارا!" جہانگیر لالہ کی آواز پر وہ پلٹ کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"ناشتا نہیں کرو گی؟"

"نہیں جہانگیر لالہ! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اُس نے جھوٹ بولا ورنہ تو بڑی زوروں کی بھوک لگی تھی۔

"سارا! میں تمہارے لیے سلائس اور انڈے لے کر آئی ہوں۔"

"کیا؟" اسماء کے کہنے پر وہ چیخی اور فوراً دسترخوان پر آ بیٹھی۔

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں، تمہارا دل نہیں چاہ رہا۔" زوار شاہ نے چھیڑا۔

"اصل میں، میں یہ کہہ کر کہ میں یہ سب چیزیں نہیں کھاتی تم سب کے لیے مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی تھی۔" پھر اسماء کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"بالآخر میری بہن کو ہی خیال آیا۔"

"تمہاری بہن سے میں نے ہی کہا تھا کہ تمہارے لیے ناشتے کا سامان لے کر چلے، ورنہ تم بھوکی رہو گی۔"

اُس نے عام سے لہجے میں کہا پھر بھی وہ سب کے سامنے بڑا عجیب سا محسوس کرنے لگی اور تصدیق کے لیے اسماء کی طرف دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو اُسے اخلاقی تقاضا نبھانے کی خاطر کہنا پڑا۔

"شکریہ زوار شاہ کہ تمہیں میرا خیال رہا۔"

وہ ایک دم سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں شکوہ تھا۔ اُس نے نظریں چرا لیں۔ کہیں وہ سب کے سامنے یہ نہ کہہ دے کہ صرف مجھے تمہارا خیال ہے، اس سے کوئی بعید بھی تو نہیں تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ سب ریسٹ ہاؤس سے نکل آئے۔

کچھ دور جا کر آموں سے لدے گھنے گھنے پیڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا، جہاں گھنی چھاؤں تھی۔ وہاں وہ سب دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ پھر بس کچھ دیر ہی انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کی تھیں۔ اس کے بعد خوب ہلا گلا کیا۔ مختلف گیمز بھی کھیلے اور آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

جہانگیر لالہ کھانے کے لیے بلانے آئے تو وہ سب دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک کو پکارنا شروع کیا، کوئی کسی درخت کے پیچھے سے برآمد ہوئی اور کوئی کہیں سے۔ سب کے سانس پھولے ہوئے تھے اور چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ پسینا الگ بہہ رہا تھا۔ ایک جگہ جمع ہوئیں تو سب وہیں بیٹھ گئیں۔

"میں نے تم لوگوں کو یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں بلایا۔" جہانگیر لالہ نے ٹوکا۔

"بس لالہ! اب چلنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"وہاں کھانا تیار ہے۔"

"ہاں بھوک تو لگ رہی ہے۔" سب ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھنے لگیں، جیسے پوچھ رہی ہوں، کیا خیال ہے۔

"چلو چلتے ہیں۔" سعدیہ سب سے پہلے کھڑی ہوئی پھر باقی سب بھی اُٹھ کر چل پڑیں۔

"زوار شاہ! تم کہاں تھے۔" وہ دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے آغا جی نے ایک دو کام کہے تھے، میں انہیں نمٹانے چلا گیا تھا۔"

"پتا ہے، ہم نے بہت انجوائے کیا ہے۔"

"نومی کے بغیر تم نے کیسے انجوائے کر لیا؟" اُس نے کہا تو پہلے وہ حیران ہوئی پھر یاد آیا کہ کل وہ اس کے سامنے نومی سے فون پر کچھ اسی قسم کی بات کر رہی تھی۔ ایک بار پھر اُسے جلانے کی خاطر بولی۔

"ویسے میں اُسے بہت مس کر رہی ہوں۔"

"یہ نومی کون ہے؟" ہما پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

"میرا کزن اور کزن سے زیادہ دوست۔" اُس نے لاپروائی سے جواب دیا اور کھانے میں مصروف ہو گئی۔

کھانے کے بعد سب پر سستی سوار ہو گئی اور جیسے ہی بابا نے برتن سمیٹ کر دسترخوان ہٹایا، وہ سب وہیں

قالین پر لیٹ گئیں۔

جہانگیر لالہ زوار شاہ کو لے کر باہر نکل گئے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی زوار شاہ بڑی عجلت میں اندر آیا اور سب کو نظر انداز کر کے اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"سارا! میرے ساتھ آؤ۔"

"کہاں؟"

"تم آؤ تو۔" اس کے ساتھ ہی اُسے کلائی سے پکڑ کر اُٹھا دیا اور اس سے پہلے کہ کوئی احتجاج کرتی۔ تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

ریسٹ ہاؤس سے نکل کر ڈھلوانی راستے پر بھی اُس نے اپنی رفتار کم نہیں کی اور وہ اس کے ساتھ تقریباً بھاگ ہی رہی تھی۔

"میرا ہاتھ تو چھوڑو۔" ہموار راستے پر آتے ہی اُس نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑائی۔ "آخر جا کہاں رہے ہو؟"

"چلو، تمہیں نہر کی سیر کرا دوں۔"

"میرے خدا! یہ بات تم وہیں کہہ دیتے اور باقی سب کو بھی ساتھ۔"

"سارا!" اُس نے ٹوک دیا۔ "پاگل لڑکی! باقی سب کا کیا کام۔"

"کیا مطلب؟"

"میں وقت کی مٹھی سے کچھ لمحے چرا لایا ہوں اور انہیں تمہاری سنگت میں امر کرنا چاہتا ہوں۔"

"زوار شاہ پلیز! ایسی باتیں مت کرو۔"

"کیوں؟"

"میں نروس ہو جاتی ہوں۔"

وہ دلچسپی سے اس کے چہرے پر اُترتے رنگوں کو دیکھنے لگا، پھر اس کا ہاتھ تھام کر چل پڑا۔

دھوپ میں بہت شدت تھی، اس لیے وہ اُسے دوسرے راستے پر لے آیا۔ یہ راستہ گو کہ طویل تھا، لیکن کیونکہ گھنے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا، اس لیے وہ ان کے سائے میں چلنے لگے۔

"پتا ہے سارا!" وہ کہنے لگا۔ "تمہارے آنے سے پہلے میری اپنی کوئی سوچ نہیں تھی۔ ایک طرح سے میں بہت مطمئن تھا۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب ٹھیک ہے۔ مجھے کبھی کسی بات سے اختلاف نہیں ہوا۔ آغا جی کیونکہ اپنی تمام اولاد میں مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں، اس لیے میں بھی ان کے زیادہ قریب رہا۔ انہوں نے جو راستہ میرے لیے منتخب کر لیا۔ میں آنکھیں بند کر کے اسی پر چل پڑا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"ابتدائی تعلیم انہوں نے مجھے گھر پر دلائی۔ اس کے بعد ہاسٹل بھیج دیا۔ میں بڑا ہوا تو انہوں نے کہا کہ مجھے ایگریکلچر کے شعبے کو منتخب کرنا چاہیے۔ میں نے اسی میں ایڈمیشن لے لیا۔ سچ پوچھو سارا تو میں نے خود بھی کبھی نہیں

سوچا تھا کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے، انجینئر یا پائلٹ، بس جو آغا جی نے کہا وہی ٹھیک لگا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر میں نے کوئی نقصان اٹھایا۔ میں بلکہ میں تو ہر مقام پر کامیاب رہا۔ اس کے باوجود پتا نہیں کیوں سارا! اب مجھے احساس ہونے لگا ہے جیسے میں اُن کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔ میری زندگی کی ڈور اپنے ہاتھوں میں تھام کر انہوں نے جو چاہا مجھ سے کروایا۔"

"زوار شاہ!" وہ قدم روک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ "ہر مقام پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد تمہاری سوچ بے معنی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن زندگی یہیں تک تو نہیں ہے اور پھر میری اپنی زندگی پر میرا اپنا بھی کچھ حق ہے۔ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے، اس کے پیشِ نظر تو میری آئندہ زندگی بھی اسی طرح گزرے گی، جس طرح آغا جی چاہیں گے۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"اور آغا جی کیا چاہتے ہیں، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کیا چاہتے ہیں وہ؟" وہ اُس کی بات نظر انداز کر کے اپنی ہی کہے گیا۔

"اگر تم نہ آتیں سارا! تو میں آئندہ بھی آغا جی کے اشاروں پر چلتا رہتا اور مطمئن بھی ہوتا، لیکن اب مجھے ان سے اختلاف ہونے لگا ہے اور میں سوچنے لگا ہوں کہ اپنی آئندہ زندگی کے فیصلے میں خود کروں گا۔"

"تم بار بار میرا نام کیوں لے رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہیں دیکھ کر ہی میرے احساسات جاگے ہیں، تمہیں دیکھ کر ہی میں نے سوچا ہے کہ اب جو آغا جی میرے بارے میں فیصلہ کرنے والے ہیں، وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔ میں نے کہا ناں سارا! میری اپنی کوئی سوچ نہیں تھی۔" وہ...... چپ چاپ اُس کی طرف دیکھے گئی۔

"ہاں سارا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میری آئندہ زندگی میں تم ہی میری ہمسفر ہو گی اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"مجھ سے پوچھے بغیر......؟"

وہ شرارت سے کہتی ہوئی آگے آگے چل پڑی۔

وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر اس کا شریر لہجہ اور آنکھوں میں اقرار کی پرچھائیاں سوچ کر اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اُس کے پیچھے چل پڑا۔

نہر کا پانی سرخی مائل تھا اور بے حد ٹھنڈا اور میٹھا۔ وہ پہلے قریب جاتے ہوئے ڈرنے لگی۔ کہیں کچے کنارے پر پاؤں رکھتے ہی وہ اندر نہ چلی جائے۔ پھر اُس نے حوصلہ دیا۔ پہلے خود کنارے پر بیٹھ کر پاؤں پانی میں ڈال دیے پھر اُسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کا ڈر ختم ہوا تو ہاتھوں کے پیالے میں پانی لے کے منہ پر خوب چھینٹے مارے، ساتھ ساتھ پیتی بھی گئی۔

"کیسا لگ رہا ہے؟" وہ اسے دیکھ کر خاصا محظوظ ہوا۔

"بہت اچھا! تمہیں تیرنا آتا ہے۔" وہ پوچھنے لگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور پیچھے ہٹ کر اُسے دھکا دے دیا۔ پانی میں گرتے ہی وہ بہت آگے تک چلا گیا۔ پلٹ کر آیا تو پوچھنے لگا۔

"تم تیرنا جانتی ہو؟"

"نہیں۔"

"آؤ، میں سکھادوں۔" اُس کی پیشکش پر وہ گلابی پڑگئی اور اپنے طور پر تو اُس نے یونہی ایک بات کہی تھی، لیکن جب اُسے سُرخ ہوتے دیکھا تو شرارت پر آمادہ ہو کر اصرار سے بلانے لگا۔

"آؤ ناں سارا!"

"نہیں بھئی، اب باہر نکلو واپس چلتے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔"

"میں جارہی ہوں۔" وہ پلٹ کر چل پڑی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اُس کے پیچھے بھاگتا آئے گا اور واقعی کچھ دیر بعد اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ اُس کا حلیہ دیکھ کر ہنس پڑی۔

"پورے کارٹون لگ رہے ہو۔"

"خبردار! ورنہ ابھی تمہیں اُٹھا کر نہر میں پھینک آؤں گا۔"

"پھر میں کبھی تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"جب تک تم مجھے بچانے آؤ گے، تب تک میں زمین کی تہ تک کہیں غائب ہو چکی ہوں گی۔"

"سارا!" وہ قدم بڑھا کر اُس کے قریب سے نکل کر پھر چل پڑی۔

"تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"اتنی دیر ہوگئی ہے ہمیں آئے ہوئے، وہ سب پتا نہیں ہمارے بارے میں کیا سوچ رہی ہوں گی۔"

"جو چاہے سوچیں۔"

"نہیں زڈارشاہ! مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے اور پلیز راستے میں تم مجھ سے الگ ہو جانا۔ میں تمہارے ساتھ ان کا سامنا نہیں کرسکوں گی۔"

"ڈرتی ہو۔"

"نہیں، بس اچھا نہیں لگتا۔" پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "حالانکہ میرے نزدیک تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آخر میں نومی کے ساتھ بھی تو ہر جگہ آتی جاتی ہوں، لیکن کیونکہ یہاں کا ماحول ایسا نہیں ہے، اس لیے میں ایسا کہہ رہی ہوں۔"

"تمہیں یہاں کا ماحول کیسا لگا؟"

"ٹھیک ہے، لیکن میرا خیال ہے، ہم جیسے لوگ یعنی شہروں کے رہنے والے کچھ وقت تو یہاں انجوائے کرسکتے ہیں، لیکن ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔"

"کیوں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"ظاہر ہے جس ماحول اور جس طرزِ زندگی کے ہم عادی ہوتے ہیں اس کا یہاں تصور بھی نہیں ہے۔ جس طرح یہاں کے لوگ ہمارا طرزِ زندگی نہیں اپنا سکتے اسی طرح ہم بھی اس ماحول میں نہیں ڈھل سکتے اور زڈارشاہ! میں تو کبھی بھی بہت دنوں تک گھر میں بند ہو کر نہیں رہ سکتی۔ آج اگر ہم یہاں نہ آتے تو میں ڈیڈی سے واپسی کی بات کرنے لگتی۔"

"سنو۔ اگر میں کہوں میری خاطر ہمیشہ کے لیے یہیں رُک جاؤ۔"

فوری طور پر وہ کوئی جواب نہ دے سکی تو جھک کر زمین پر پڑا پتھر اُٹھانے لگی۔ پھر جب سیدھی ہوئی تو موضوع بدل دیا۔

"اب کتنی دور اور جانا ہے؟"

"بس تھوڑی دور، دیکھو سامنے اسماء وغیرہ نظر آرہی ہیں۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اسی طرف دیکھنے لگی پھر اپنے قدموں کا رُخ موڑتے ہوئے بولی۔

"اس طرف سے چلتے ہیں اور پلیز اب یا تو تم مجھ سے آگے نکل جاؤ یا پھر میرے بعد آنا۔"

"تم جاؤ۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔" اس نے کہا تو وہ تیز تیز قدموں سے آگے چل پڑی۔ اسماء وغیرہ اسی جگہ بیٹھی تھیں جہاں وہ سب آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ سامنے سے جانے کے بجائے پچھلی طرف سے آگے بڑھنے لگی۔ خیال تھا۔ ایک دم سے ان کو چونکا دے گی۔ قریب پہنچی تو اپنی سانسیں ہموار کرنے کی غرض سے ایک درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سب جانے کس موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ کچھ دبا دبا سا لہجہ اور انداز تھا۔ جیسے اپنی بات سُن لیے جانے کا ڈر ہو، لیکن ہما اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

"اسماء! سارا حد سے بڑھ رہی ہے۔ تم اسے روکتی کیوں نہیں۔ میں تو کہتی ہوں۔ صاف صاف اسے بتادو کہ تم زڈارشاہ کی بچپن کی منگ ہو۔"

"اسماء اور زڈارشاہ۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹتی چلی گئی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے تم اپنی ماں جیسا نصیب لے کر پیدا ہوئی ہو۔ جس طرح وہ ساری زندگی شوہر کا راستہ دیکھتی رہیں تم بھی زڈارشاہ کا راستہ دیکھتی رہو گی۔ اور سارا یقیناً اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے زڈارشاہ کو نہ صرف تم سے بلکہ ہم سب سے چھین کر لے جائے گی۔"

"ہما! ایسی باتیں مت کرو۔" اسماء کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی۔ شہر کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ تم بے وقوف لڑکی اس اُمید پر مت جیو کہ زڈارشاہ

یالآخر پلٹ کر تمہاری طرف آئے گا۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر زوّار شاہ نے سارا سے ناتا جوڑ لیا تو تم اس کے لیے شجرِ ممنوعہ کی مانند ہو جاؤ گی۔ اس وقت تک جب تک کہ سارا اس جہانِ فانی سے کوچ نہ کر جائے۔"

"صبا آپی! روکیں ہما کو۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔ سارا میری بہن ہے۔" اسماء رو رہی تھی۔

"تمہیں بہت خیال ہے بہن کا۔ اسے نہیں ہے۔"

"وہ کچھ نہیں جانتی۔"

"نہیں جانتی تو بتا دو۔ ورنہ اس کی ماں کی طرح اس پر بھی حویلی کے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ ہم کب تک ایک ہی کہانی کو بار بار جنم لیتے ہوئے دیکھیں۔ چچی جان کے ساتھ جو ہوا وہی کافی ہے۔"

ہما خاموش نہیں ہوئی۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہے جا رہی تھی۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ سب کو چونکانے کی غرض سے بنا آہٹ کیے آئی تھی اور اب بھی کہیں کوئی چونک نہ جائے۔ وہ بنا آہٹ کیے اپنے آپ کو سب کی نظروں سے چھپاتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑی۔ ڈھلوانی راستے سے اوپر چڑھتے ہوئے اسے بہت دقت ہوئی۔ بمشکل تمام اپنے وجود کو گھسیٹتی اوپر پہنچی اور اندر داخل ہوتے ہی سیدھی باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ آئینے میں اپنے آپ پر نظر پڑی تو احساس ہوا کہ آنکھوں کا سیلاب کب کا حفاظتی بند توڑ چکا ہے۔ دل میں درد کروٹیں لینے لگا۔ اور وہ آئینے پر بازو رکھ کر اس پر پیشانی ٹکاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنی بہت ساری باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اسماء کی خاموشیاں، ہما کا چبھتا ہوا لہجہ۔ انجانے میں وہ کیا کر بیٹھی تھی اور زوّار شاہ۔ اس نے بھی نہیں بتایا کہ وہ اسماء سے منسوب ہے۔

"میرے خدا! میں کیا کروں۔" وہ پاگل ہونے لگی۔ "ساری باتیں میرے خلاف جا رہی ہیں۔ ہما اگر می کے حوالے سے سارا الزام میرے سر رکھ رہی ہے تو غلط تو نہیں کر رہی۔ زوّار شاہ اس کا بھائی ہے اور وہ کب چاہے گی کہ اس کا بھائی ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو جائے۔ وہ جانتی ہے اگر زوّار شاہ نے آغا جی کے فیصلے سے اختلاف کیا تو وہ اس پر حویلی کے دروازے بند کر دیں گے۔"

"نہیں۔ میں زوّار شاہ کو اختلاف کا موقع ہی نہیں دوں گی۔" اس نے پورا نل کھول دیا اور آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ جلن تو کسی حد تک کم ہو گئی لیکن دل پر جو بوجھ آ پڑا تھا، وہ کسی طرح کم نہیں ہوا۔ رونے سے بھی نہیں۔ آئینے میں دیکھا آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ سوچنے لگی۔ کسی نے پوچھا تو کیا کہے گی۔ اور یونہی سوچتی ہوئی باہر آ گئی۔ بوڑھا چوکیدار اونگھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"بابا! چائے ملے گی؟" وہ دوپٹے کے پلو سے چہرا صاف کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں بیٹا! کیوں نہیں۔" وہ اُٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا تو وہ صوفے پر لیٹ گئی۔ ذہن الجھنے لگا تھا۔ وہ کسی ایک پہلو پر سوچنا چاہتی تھی لیکن اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کیا تو پلکیں نم ہو گئیں۔ اس نے بھلا کب سوچا تھا کہ زندگی میں کبھی کوئی مقام ایسا بھی آ سکتا ہے اور وہ یوں بھی بے بس ہو سکتی ہے۔

"بیٹا چائے!" بابا کی آواز پر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے کپ لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر ابھی وہ چائے پی ہی رہی تھی کہ سب لڑکیاں آ گئیں۔ اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"تم کہاں تھیں اور یہاں کب آئیں" ثناء اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لے کر حلق میں پھنسا آنسوؤں کا گولا اندر اُتار کر اپنے آپ کو بولنے کے قابل بنایا۔

"زوّار شاہ مجھے نہر پر لے گیا تھا اور واپس آتے ہوئے مجھے کافی دیر ہو گئی...... میں تم لوگوں کے پاس آ رہی تھی لیکن دھوپ نے سر میں درد کر دیا۔ اس لیے میں چائے پینے کی غرض سے یہاں چلی آئی۔"

"زوّار شاہ کہاں ہے؟" ہما بغور اس کی طرف دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"وہ تو راستے میں ہی کہیں رہ گیا تھا۔"

"تمہیں اکیلا چھوڑ دیا۔" ہما کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں۔" وہ خوامخواہ ہنسی۔ "ویسے بھی ہم زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔" پھر اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

"جہانگیر لالہ کہاں چلے گئے۔ ہمیں واپس بھی تو جانا ہے۔ آغا جی نے جلدی آنے کے لیے کہا تھا۔"

"ہاں واقعی دیر ہو گئی تو آغا جی خفا ہوں گے۔ میں چوکیدار کو بھیج کر پتا کرواتی ہوں۔" سعدیہ چوکیدار کو آوازیں دیتی ہوئی باہر نکل گئی تو وہ سب واپسی کی تیاری کرنے لگیں۔

آتے ہوئے بھی وہ ہما ہی کی کسی بات پر خاموش ہو گئی تھی۔ اور اب واپسی پر تو وہ بہت شکستہ سی تھی۔ کوشش بھی کرتی تو کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ اور گھر میں داخل ہوئی تو سر درد کا بہانا کر کے سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ اور لیٹتے ہی سر تک چادر اوڑھ لی۔ گو کہ سونے کا ارادہ نہیں تھا لیکن ایک تو رونے کی وجہ سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں دوسرے تھکن کا احساس بھی ہونے لگا۔ اس لیے بس کچھ دیر کو ہی ذہن بھٹکا تھا پھر نیند نے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔

جانے کتنی دیر تک وہ سوتی رہی تھی۔ جب اسماء نے اُٹھایا تو وہ یہی سمجھی کہ صبح ہو گئی ہے۔ لیکن کمرے میں جلتی ٹیوب لائٹ اور کھڑکی سے باہر گہری تاریکی دیکھ کر وہ قدرے متعجب ہوئی۔

"یوں بے وقت کیوں سو گئی تھیں؟" اسماء کا وہی لہجہ تھا، محبتوں سے بھرا۔

"سونے کا ارادہ تو نہیں تھا۔ بس نیند آ گئی۔"

"چلو، سب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

"لیکن مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لو۔" اسماء کے اصرار پر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور منہ ہاتھ دھو کر اس کے ساتھ ہی نیچے آ گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا! تھک گئی ہو۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھی تو ڈیڈی پوچھنے لگے۔

"نہیں ڈیڈی، بس ایسے ہی سو گئی تھی۔"

"کیسی رہی تمہاری تفریح؟"

"بس سو سو۔"

"کیا مطلب؟ تم نے انجوائے نہیں کیا۔"

"زیادہ نہیں۔" پھر ان سب کو سنانے کی غرض سے بولی۔ "ڈیڈی جتنا انجوائے ہم کراچی کی تفریح گاہوں میں کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ کراچی کے ایک معمولی سے پارک میں بھی چلے جائیں تو وہاں بھی جدید طرز کے جھولے نظر آتے ہیں اور بڑی جگہوں کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

"وہاں سکون تو نہیں ہوتا۔" پتا نہیں کس نے یہ بات کہی۔ وہ باری باری سب کو دیکھنے کے بعد ہنس پڑی۔

"سکون ہمارے اندر رہتا ہے۔ اگر ہم بذاتِ خود مطمئن اور پُرسکون ہیں تو باہر کا شور شرابا بھی اچھا لگتا ہے ورنہ دوسری صورت میں خاموشیاں بھی کھلنے لگتی ہیں۔ بہر حال یہ بحث فضول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جس ماحول کا عادی ہے، اسے وہی اٹریکٹ کرتا ہے۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

"کھانا تو کھالو۔"

"بس ڈیڈی! مجھے بھوک نہیں تھی۔ اسماء کے اصرار پر چلی آئی۔ ہاں البتہ چائے ضرور پیوں گی۔" پھر جاتے جاتے دروازے میں رُک کر بولی۔

"اسماء! آپ کھانا کھالیں تو خانساماں سے کہہ کر چائے بنوا لیجیے گا۔ میں اوپر جا رہی ہوں۔"

اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا اور انداز بھی جیسے اپنے اور ان کے فرق کو جتا رہی ہو۔ سب نے ہی محسوس کیا اور متعجب ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا جبکہ وہ ردِعمل دیکھنے کے لیے رُکی نہیں تھی۔

ہر طرف چھائی خاموشی بتا رہی تھی کہ سب لوگ سو چکے ہیں۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسماء کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بے خبر تھی۔ اور سونے کی کوشش تو اس نے بھی کی تھی لیکن نیند کسی طرح آ کے نہیں دی۔ ایک تو وہ بے وقت بھی سو چکی تھی دوسرے اب ذہن بھی پوری طرح بیدار ہو کر سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اسے ہما کی کہی باتیں یاد آئیں۔ اس کے بعد یہاں گزرے تین چار دنوں کا ہر پل نگاہوں میں آسمایا۔

اسماء کا صبح سویرے کھڑکی کے پاس کھڑے ہونا۔ یقیناً وہ چپکے چپکے زوّار شاہ کو دیکھا کرتی تھی۔ اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ یہ بات اس نے پہلے ہی روز کیوں نہ جان لی۔ جبکہ اسماء اسے اُٹھتے دیکھ کر بوکھلا کر کھڑکی کے پاس سے ہٹ جاتی تھی۔ جیسے چوری پکڑے جانے کا ڈر ہو۔

پھر وقتاً فوقتاً ہما کی طرف سے کہی گئی باتیں۔ اس کے چبھتے ہوئے لہجے میں اندرونی خدشات کا عکس اگر وہ محسوس کرتی تو صاف دیکھ سکتی تھی۔

"میں نے تمہیں زوّار شاہ کے ساتھ دیکھا تھا۔" ہما نے کہا تھا اور پھر......

"اگر تمہیں باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونا ہے تو آگے زوّار شاہ کے ساتھ جا بیٹھو۔"

"زوّار شاہ نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا۔" ہما کی طنز میں ڈوبی آواز......

"میرے خدا!" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "انجانے میں، میں نے اپنے آپ کو کتنا گرا لیا۔ یہ سب لڑکیاں شروع دن سے میرے متعلق اسی قسم کی باتیں کرتی رہی ہوں گی اور زوّار شاہ۔" ہونٹوں نے اس نام کو کیا چھوا کہ آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو کر کناروں سے بہنے لگا۔

"بلاشبہ وہ چاہے جانے کے قابل ہے لیکن اگر اوّل روز مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ کسی اور کی امانت ہے تو میں اپنے جذبوں کو کبھی بے لگام نہ چھوڑتی۔ اور اب اس مختصری مدت میں میں اتنی آگے نکل آئی ہوں کہ واپسی کے راستے بھی صاف نظر نہیں آتے لیکن واپس تو مجھے بہر حال جانا ہے۔"

"ہما عادل شاہ!" وہ دل ہی دل میں ہما کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "تم اطمینان رکھو۔ اس حویلی میں دوسری بار وہی کہانی جنم نہیں لے گی۔ میں اپنی محبتیں دل ہی میں کہیں دفن کر کے زوّار شاہ کو اسی راستے پر چلنے پر مجبور کر دوں گی جو آغا جی نے اس کے لیے منتخب کیا ہے اور جس کے اختتام پر اسماء نے اپنی خاموش چاہتوں کا تاج محل تعمیر کر رکھا ہے۔"

صبح اسماء نے اسے نماز کے لیے اٹھایا تھا لیکن وہ کروٹ بدل کر دوبارہ سو گئی تھی اور اب جب اُٹھی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ دس بج چکے تھے۔ پھر بھی اس نے اُٹھنے میں جلدی نہیں کی۔ اطمینان سے اُٹھی اور کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نہانے میں بھی اس نے بہت دیر لگائی۔ اور پھر گیلے بالوں میں برش کرتی ہوئی نیچے آئی۔ ہلکے ہلکے گنگنا بھی رہی تھی۔ بالکل وہی انداز تھا جو اس کا اپنے گھر میں ہوا کرتا تھا۔ سب لڑکیاں ہال کمرے میں موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر جس طرح خاموشی چھائی اس سے وہ سمجھ گئی کہ وہ سب کیا بات کر رہی ہوں گی۔

"کراچی سے فون تو نہیں آیا تھا؟" وہ ان سب کے درمیان بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ اور یہ آج تم اتنی دیر تک سوتی رہیں؟"

"میں اسی وقت اُٹھتی ہوں۔ بس تین دن مروت میں جلدی اُٹھ گئی۔" وہ ہنسی۔

"زوّار شاہ کئی بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔" ہما نے کہا تو اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ لیکن پھر فوراً اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

"کیوں؟"

"کہہ رہا تھا تم سے کوئی کام ہے۔"

"مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے اسے؟"

"سارا! ناشتا کرو گی؟" ہما کے مزید کچھ کہنے سے پہلے اسماء بول پڑی۔ اسے ڈر تھا۔ کہیں ہما اس کے سامنے کوئی غلط بات نہ کہہ دے۔

"نہیں، اب ناشتے کا وقت نہیں رہا۔ ہاں البتہ چائے۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے میں خود ہی بنا لیتی ہوں۔"

"خانساماں موجود ہے کچن میں۔ وہ بنا دے گا ٹھہرو میں اس سے کہہ آتی ہوں۔"

نادیہ اُٹھ کر اس سے پہلے ہی کچن کی طرف چلی گئی تو وہ کندھے اچکا کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسی وقت زوّار شاہ اندر آیا اور اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

"آج اتنی دیر تک کیوں سوتی رہی ہو؟"

"میرے خدا! کیا ایک ایک کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ صبح اُٹھنے کو دل نہیں چاہا۔ سو نہیں اُٹھی۔"

"یہاں سب جلدی اُٹھتے ہیں۔"

"مجھ پر یہاں کے قوانین لاگو نہیں ہوتے زوّار شاہ۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں یہاں نہیں رہتی۔ آج ہوں، کل چلی جاؤں گی۔"

"لیکن ہمارا ارادہ تمہیں ہمیشہ کے لیے یہیں رکھنے کا ہے۔" وہ سب کے سامنے وہی بات کہہ گیا جو کل تنہائی میں اس سے کہہ رہا تھا۔

"اگر میں کہوں میری خاطر ہمیشہ کے لیے یہیں رُک جاؤ۔" اس نے شکر کیا کہ کل اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اب وہ خاموش نہیں رہی۔

"ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ زوّار شاہ! اور یہاں اگر میں دس دن بھی رہ گئی تو۔"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہنس پڑی اور وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر وہیں سے واپس پلٹ گیا۔

"سارا! میں آج واپس جا رہی ہوں۔" ثناء نے کہا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اتنی جلدی!"

"جلدی کہاں۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے مجھے یہاں آئے ہوئے۔ امی کا تین چار بار بلاوا آ چکا ہے اور آج تو انہوں نے بھائی کو بھیج دیا ہے۔"

"سنو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ پھوپھو جی سے ملوں گی۔ بلکہ میرا خیال ہے، ڈیڈی کو بھی چلنا چاہیے۔"

"ماموں جی کہہ تو رہے تھے چلنے کے لیے۔"

"مگر انہوں نے کہا ہے تو ضرور چلیں گے اور اسماء آپ بھی چلیں گی ناں۔"

اسماء خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ پھوپھو کے گاؤں روانہ ہو گئے۔ اس نے امی کو بھی چلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ یوں ممی اور سحر آپی کی جگہ امّی اور اسماء تھیں۔ وہاں کا ماحول اور آس پاس کا علاقہ بھی آغا جی کی حویلی جیسا ہی تھا۔

پھوپھو جی البتہ تائی جی اور چچی جی سے ذرا مختلف نظر آئیں۔ قدرے روشن خیال بھی تھیں اس لیے باکنی یا اطراف میں پہلے کھیتوں کی طرف جانے کو منع نہیں کیا۔ اور یہاں کیونکہ ہما کا چبھتا ہوا لہجہ اور طنزیہ گفتگو نہیں تھی اس لیے اس نے بہت فرینک ہو کر اسماء اور ثناء سے باتیں کیں۔

ثناء کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ صبا آپی اس کے سب سے بڑے بھائی سے منسوب ہیں اور سعدیہ منجھلے بھائی سے اور خود ثناء تایا جی کے منجھلے بیٹے سے منسوب ہے۔ اور ان سب کی شادیاں اگلے چھ ماہ میں متوقع ہیں۔ پتا نہیں ثناء نے اسماء اور زوّار شاہ کی نسبت کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ گو کہ وہ جان تو چکی تھی لیکن چاہتی تھی جس طرح وہ اوروں کا ذکر کر رہی ہے، ان دونوں کا بھی کرے لیکن شاید وہ دانستہ گریز کر رہی تھی۔ اس کے اندر دکھ اور ندامت کے احساس نے ایک ساتھ گھر کیا تھا۔

پھوپھو کے گھر سے آنے کے بعد اس نے ڈیڈی کو واپسی کے لیے کہنا شروع کر دیا۔ اب وہ مزید یہاں نہیں رُکنا چاہتی تھی اور چاہتی تھی جانے سے پہلے اپنی طرف سے سب کا دل صاف کرتی جائے۔ رات میں جب وہ سب صبا آپی کے کمرے میں بیٹھی ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اسماء کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"اسماء! آپ کا ہر انداز سحر آپی جیسا ہے۔ وہ بھی اپنے آپ میں مگن رہنے والی ہیں۔ چار آدمیوں میں بیٹھ کر بھی خاموش رہتی ہیں۔ بالکل آپ کی طرح۔ اور پتا ہے صبا آپی! اُن کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان بڑی بھلی لگتی ہے۔ مجھے جب ان کی مخصوص مسکان دیکھنی ہوتی ہے، میں صرف یک بندے کا نام لیتی ہوں۔"

"کس کا؟" صبا آپی کے ساتھ ساتھ نادیہ نے بھی پوچھا۔

"آذر بھائی کا۔ آذر بھائی ان کے منگیتر ہیں۔ آج کل ٹریننگ کے سلسلے میں جرمنی گئے ہوئے ہیں۔"

پھر ایک دم اسماء کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں اسماء کے ہونٹوں پر بھی ویسی مسکان دیکھوں جیسی سحر آپی کے ہونٹوں پر سجتی ہے۔ اور اسماء دل تھام کر بیٹھیں کہ میں زوّار شاہ کا نام لے رہی ہوں۔"

اس خوبصورتی سے اس نے بات کی کہ سب حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں اور کتنی دیر تک تو کوئی کچھ بول ہی نہ سکا۔

"ارے کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟" وہ اپنے لہجے میں حیرت سمو کر باری باری سب کو دیکھنے لگی۔

"نہیں لیکن تمہیں کس نے بتایا کہ اسماء، زوّار شاہ سے منسوب ہے۔" ہما نے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔

"ایسی باتیں نہ بھی بتائی جائیں تو جان لی جاتی ہیں اور میں نے بھی ہما اوّل روز ہی جان لیا تھا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"گڈ لک اسماء! زوّار شاہ تھوڑا ضدی ضرور ہے لیکن اچھا ہے، آذر بھائی کی طرح۔"

اسماء نے اپنی پیشانی گھٹنوں پر ٹکا لی۔ وہ رو رہی تھی۔

"اسماء! میں تو آپ کے ہونٹوں پر مسکان سجانا چاہتی تھی۔ آپ رونے لگیں۔"

وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"اسماء مت روؤ۔" سعدیہ نے ٹوکا۔ "دیکھو، تمہارے رونے سے سارا کتنی افسردہ ہو رہی ہے۔"

اسماء نے گھٹنوں سے سر اونچا کیا۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنی پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں کی نمی اندر اتار رہی تھی۔ سب یہی سمجھے کہ وہ اسماء کے رونے سے پریشان ہو رہی ہے جبکہ اس کے دل میں طوفان اُٹھ رہے تھے۔ سب کے ساتھ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینا بڑا مشکل تھا اور وہ اس مشکل مرحلے سے گزر رہی تھی۔

"شہر کے لوگوں کے بارے میں ہمارا جو تصور تھا۔ تم نے اسے غلط ثابت کر دیا سارا!" ہما نے کہا تو وہ وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہمارا خیال تھا۔ شہر کے لوگ بڑے تنگ دل اور مطلب پرست ہوتے ہیں۔ اپنے آگے کسی کو گردانتے ہی نہیں۔ ان کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہوتے ہیں لیکن اسماء کے ساتھ تمہاری بھیگتی پلکیں تمہاری نرم دلی کا پتا دے رہی ہیں۔ اور اگر برا نہ مانو سارا! تو ایک بات کہوں؟" اس نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تو ہما کہنے لگی۔

"اصل میں تمہاری زوّار شاہ کے ساتھ بے تکلفی نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔"

"کم آن ہما! وہ نہ صرف میرا کزن ہے بلکہ اسماء کے ناتے سے۔"

"تم لوگوں کی غلطی نہیں ہے۔ اصل میں تمہیں ماحول ہی ایسا ملا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں کزن دوست بھی ہوتا ہے۔ بھائی بھی اور اگر انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے تو کوئی نیا رشتہ بھی استوار ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب مزید کسی غلط فہمی کو دل میں جگہ مت دینا۔ ویسے بھی ایک دو روز میں میں جانے والی ہوں۔"

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔" ہما واقعی نادم نظر آ رہی تھی۔

"نیور مائنڈ!" وہ اس کا ہاتھ تھپک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

صبح اس کا جلدی اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن خود بخود آنکھ کھل گئی۔ اسماء نماز کے بعد اسی طرح کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کروٹ بدل لے لیکن پھر بے اختیار اسے پکار لیا۔ اسماء روزانہ کی طرح بوکھلا کر پیچھے ہٹی تو وہ ہنس پڑی۔

"یوں چوری چھپے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ اگر کہیں تو اسے یہیں بلاؤں۔"

"کسے؟" اسماء نے انجان بننے کی کوشش کی اور وہ اس کے ہونٹوں پر پھیلی شرمگیں مسکراہٹ دیکھ کر کہنے لگی۔

"اسماء! زوّار شاہ اگر اس وقت آپ کو دیکھ لے تو دیوانہ ہو جائے۔"

"وہ دیوانہ نہیں ہوگا۔"

"ارے! اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہیں۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس لیے کہ وہ میری طرف دیکھتا ہی نہیں۔"

"آپ جو دیکھ لیتی ہیں۔"

"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ نماز کے لیے کیوں نہیں اُٹھیں۔ کتنی بری بات ہے۔ نماز کا وقت گزر گیا ہے تب اُٹھ رہی ہو۔"

"آئی ایم سوری۔ آئندہ جلدی اُٹھوں گی اور نماز بھی پڑھوں گی۔"

"ہاں نماز پڑھنے سے دل کو سکون ملتا ہے۔"

"سکون ہی تو چاہیے۔" اس نے سوچا اور بیڈ سے اُتر آئی۔ پہلے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر آ کر اسماء سے کہنے لگی۔

"میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔"

"سنو! زوّار شاہ کے لیے بھی چائے لے جانا۔" وہ پلٹ کر بے حد خاموش نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کل وہ صبا آپی سے تمہاری چائے کی بہت تعریف کر رہا تھا۔"

وہ تعریف اس لیے کر رہا ہوگا کہ میں بار بار اس کے لیے چائے بناؤں۔"

"تو کیا اسے چائے نہیں دو گی؟" اسماء کے معصومیت سے پوچھنے پر وہ ہنس پڑی۔

"آپ کہتی ہیں تو دے دوں گی۔" اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔

جس وقت وہ اس کے لیے چائے لے کر گئی، وہ گھاس پر بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کسی بات کو سوچ کر زاویہ بدل رہے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئی۔ پھر اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں پکارا۔

"زوّار شاہ!" وہ فوراً آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا تو اس نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"کہاں رہنے لگی ہو، نظر ہی نہیں آتیں؟" وہ اس روز کی طرح کپ کے ساتھ اس کی کلائی تھام کر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"یہیں تو ہوتی ہوں۔ البتہ پچھلے دو روز پھوپھو جی کے پاس رہی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"سنو۔ میں آغا جی سے تمہارے لیے بات کرنے والا ہوں۔"

"کیسی بات؟" وہ انجان بنی۔

"یہی کہ میں تم سے شادی کروں گا۔"

"نہیں زوّار شاہ!" وہ فوراً بول پڑی۔

"کیوں؟"

وہ جواب دینے کے بجائے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ جانتی تھی، وہ اس کا کوئی عذر قبول نہیں کرے گا۔

"سارا! بتاؤ نا۔ تم مجھے آغا جی سے بات کرنے سے کیوں روک رہی ہو۔"

"بھئی ابھی مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"لیکن مجھے تو کرنی ہے۔"

"تو تم کرلو۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو زوّار شاہ!" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی "ابھی ہم سے بڑے موجود ہیں۔ پہلے ان کی شادیاں ہونے دو۔ جب ہماری باری آئے گی تب ایسی کوئی بات چھیڑنا۔"

وہ چاہتی تو ابھی دوٹوک بات کر کے اسے منع کر دیتی لیکن جانتی تھی کہ وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا اور ابھی رات ہی تو اس نے لڑکیوں کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کی تھی اور اب اگر اس کی طرف سے نہ سہی زوّار شاہ ہی کی طرف سے کوئی بات بھی ہوتی تب بھی قصوروار وہی ٹھہرائی جاتی۔ اس لیے اس نے ابھی سہولت سے اسے روک دیا۔ ویسے بھی کل وہ جا رہی تھی اور آج کا دن اطمینان سے گزارنا چاہتی تھی۔

دوپہر میں وہ نادیہ کے ساتھ آغاجی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب وہ پکار کر کہنے لگا۔

"سنو، تمہارا فون ہے۔"

"ممی کا ہوگا۔ آؤ نادیہ۔ تم بھی ممی سے بات کر لینا۔"

وہ نادیہ کو لیے ہوئے اس کے پاس آئی اور ریسیور لے کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف نومی تھا۔ اس روز اس نے محض زوّار شاہ کو چھیڑنے کی غرض سے نومی سے ایسی باتیں کی تھیں کہ اس نے جل کر ریسیور پٹخ دیا تھا۔ اب اس کا مقصد اسے چھیڑنا نہیں تھا۔ بس چاہتی تھی کہ کوئی ایسی بات ہو جو اس کے دل پر جا لگے اور وہ اس سے متنفر ہو جائے۔

"بڑے بے مروت ہو نومی! میں نے ہر روز تمہارے فون کا انتظار کیا۔" دزدیدہ نظروں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"واقعی۔ میں تمہارے بغیر کہیں بھی انجوائے نہیں کر سکتی۔" پھر ہنستی ہوئی بولی۔

"ہاں۔ اللہ میاں کے ہاں بھی دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔ تمہاری اسی بائیک پر، اور سنو۔ کل میں آ رہی ہوں۔"

"میرا خیال ہے لائن کٹ گئی۔" وہ مایوسی سے سرہلاتے ہوئے بولی اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"تمہاری ایسی باتوں سے لائن نہ کٹتی تو کیا ہوتا۔" وہ جل کر بولا اور وہ ہنستی ہوئی نادیہ کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ آغاجی کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

اگلے دن جب وہ جانے کی تیاری کر رہی تھی تو سب نے اسے گفٹ دیے۔ بی بی جان، تائی جان اور چچی جی نے ممی اور سحر آپی کے لیے بھی سوٹ دیے۔ سب چیزوں کو سوٹ کیس میں بند کر کے اس نے ڈیڈی کا بیگ بھی چیک کیا اور ابھی کمرے سے نکلنے کو تھی کہ وہ آ گیا۔

اس تمام عرصے میں وہ پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اس گھر کے کسی بھی لڑکے کو لڑکیوں کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے قدرے حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

"تو تم جا رہی ہو۔"

"ظاہر ہے۔ میں جانے ہی کے لیے آئی تھی۔" اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر کب آؤ گی؟" وہی گرفت میں لینے والا انداز۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"فون کرو گی؟"

اس نے یونہی اثبات میں سرہلا دیا تو وہ کہنے لگا۔

"میں روزانہ تمہیں فون کروں گا۔ اور سنو! جب موقع ملے گا۔ میں تمہارے پاس آؤں گا۔" اس کے موشی سے دیکھنے پر بولا۔ "انتظار کرو گی؟"

"زوّار شاہ!" ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور اُس نے اس کی طرف سے رُخ موڑ لیا۔

"سارا! میں تمہیں بہت مس کروں گا۔" وہ اس کے بے حد قریب کھڑا کہہ رہا تھا۔ اسے اپنا دل ٹھہرتا سا لگا۔ آنکھوں کے سامنے دُھند چھانے لگی تو وہ اس کے قریب سے نکل کر کمرے سے ہی نکل آئی۔

سب سے مل کر جب وہ ڈیڈی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو بہت آزردہ ہو رہی تھی۔ یہ اطمینان تو تھا کہ وہ سب کے شبہات کو رد کر کے ان کے دلوں میں گھر کر کے جا رہی ہے لیکن خود اپنے دل کی ناؤ جس طرح بیچ بھنور میں پھنسی تھی۔ اس سے وہ خاصی شکستہ ہو رہی تھی۔

"تو سارا بی بی! زندگی میں یہ مقام بھی آنا تھا۔" اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کا خیال تھا بہت جلد زندگی پہلے والے معمول پر آ جائے گی۔ اور وہ سارا تجمل شاہ ہر بات میں تفریح کا پہلو تلاش کر کے خوب انجوائے کرے گی۔ لیکن کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کی ہر شعوری اور لاشعوری کوشش ناکام ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ اپنا سب کچھ ہار آئی ہو۔

دن بھر اس کے خیال سے بچنے کی خاطر وہ اپنے آپ کو مختلف کاموں میں مصروف رکھتی لیکن ایک مخصوص وقت پر فون کی بجتی بیل سے اس کی ساری محنت رائیگاں جاتی۔ شروع کے چند دنوں میں اس نے غور نہیں کیا تھا۔ کہ زوّار شاہ ٹھیک آٹھ بجے اسے فون کرتا ہے اس لیے کئی بار اس نے خود ریسیو کیا اور اب جبکہ جان گئی تھی تو اس نے فون اُٹھانا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن مخصوص وقت پر وہ چونکتی ضرور تھی۔ کتنی بار سحر آپی نے آ کر اس سے کہا۔

"زوّار شاہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اور ہر بار اُس نے کہلوا دیا وہ گھر پر نہیں ہے۔

آخر ایک روز سحر آپی نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

وہ ان کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔

"ارے!" سحر آپی پریشان ہوگئیں۔ اور بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔
"تم جب سے آغا جی کے گھر سے ہو کر آئی ہو میں تمہیں پریشان اور اپنے آپ سے اُلجھتے دیکھ رہی ہوں اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو مجھے بتاؤ اور یہ زوّار شاہ کا کیا معاملہ ہے؟"
"سحر آپی! مجھ سے انجانے میں بڑی بھول ہوئی۔" پھر اس نے ساری بات انہیں کہہ سنائی۔ اس کی ساری بات سُن کر سحر آپی کتنی دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہیں۔
"آپ بتایئے میں کیا کروں۔"
"میں تو یہی کہوں گی کہ جو ہوا۔ اسے بھول جاؤ۔"
"بھولنا ہی تو چاہتی ہوں لیکن زوّار شاہ ہر روز فون کر کے میری کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے۔"
"تم اسے سختی سے منع کر دو کہ تم سے کوئی رابطہ نہ رکھے۔"
"ایسا کروں گی تو وہ مجھے الزام دے گا کہ میں نے اسے دھوکا دیا۔"
"دیکھو سارا! تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔"
سحر آپی اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔
"ایک تو یہ کہ تم اس الزام کو چپ چاپ تنہا سہہ لو ورنہ دوسری صورت میں ہم سب لپیٹ میں آئیں گے۔"
اس نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا تو سحر آپی کہنے لگیں۔
"اگر تم نے زوّار شاہ کی حوصلہ افزائی کی تو وہ یقیناً تمہارے لیے حویلی میں سب سے لڑے گا اور پھر ہما نے جو باتیں کی تھیں، وہ سب سچ ہو جائیں گی۔ کیا تم یہ چاہو گی کہ تمہارے ساتھ ساتھ ممی کو بھی الزام دیا جائے۔"
"یہی تو میں نہیں چاہتی۔"
"تو پھر اسے یہیں روک دو۔ کہہ دو کہ تم اس کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکو گی۔"
"لیکن آپی! میں اپنے دل کا کیا کروں جو اس کا تمنائی ہے۔"
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور دل کا کیا ہے۔ یہ تو چاند کی تمنا بھی کرتا ہے۔ تو کیا ہم اسے چاند توڑ کر دے دیتے ہیں، نہیں ناں۔ تو میری جان! جس طرح ہم چاند کی تمنا کرنے پر اسے بہلا لیتے ہیں تو تم بھی اپنے دل کو بہلا لو۔ نہیں بھی بہلا سکو تو وقت گزرنے کے ساتھ خود بہل جائے گا۔"
قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔
"البتہ دوسرا راستہ زیادہ دشوار گزار ہے۔ ممی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ ایک تو آغا جی نے انہیں قبول نہیں کیا دوسرے ساری زندگی وہ اس خوف میں مبتلا رہیں کہ کہیں ڈیڈی انہیں چھوڑ کر نہ چلے جائیں اور بالآخر ڈیڈی لوٹ ہی گئے۔ کچھ وقت کے لیے ہی سہی۔ گئے تو اور یقیناً آئندہ بھی جائیں گے۔ اور تم تو ڈیڈی کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ سارا جبکہ میں نے ممی کو بہت ڈسٹرب دیکھا۔ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کیا تم ایسے حالات کا سامنا کر سکو گی؟" وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"یہی بہتر ہے کہ زوّار شاہ کی کچھ باتیں سن لو اور بس۔"
سحر آپی نے جتنی آسانی سے بات ختم کر دی، وہ سب کرنا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ اگلے کئی دن تک وہ اپنے آپ کو زوّار شاہ سے بات کرنے کے لیے تیار کرتی رہی اور جس دن اس نے سحر آپی سے کہا کہ آج وہ خود زوّار شاہ سے بات کرے گی۔ اسی دن وہ خود آ گیا۔ محض اتفاق تھا کہ جس وقت وہ آیا۔ وہ نومی کے ساتھ لان میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کو وہ ڈگمگا گئی۔ دل نے مچل مچل کر اس کے راستوں میں مسکراہٹوں کے پھول بچھانے کی ترغیب دی۔ آنکھیں الگ اسے دیکھ کر منادی کرنے لگیں۔ ہماری دھرتی سیراب ہوئی۔
"میرے خدا!" وہ ٹوٹنے لگی، بکھرنے لگی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے سہارا تو چاہیے ہی تھا سو نومی کا بازو تھام لیا۔
"کون ہے؟" نومی پوچھ رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہا اس کی کم علمی پر اس کا دل کھول کر مذاق اُڑاتے ہوئے کہے۔
"اسے نہیں جانتے یہ زوّار شاہ ہے۔" وہ کچھ نہیں بول سکی۔ ہونٹ آپ ہی آپ بھینچ گئے تھے۔
"سارا کیسی ہو؟" وہ اس کے قریب آ کر پوچھنے لگا۔
"نومی! یہ زوّار شاہ ہے۔ میرے تایا جی کا سب سے چھوٹا بیٹا۔" وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نومی کو مخاطب کر کے اس کا تعارف کروانے لگی۔ نومی نے ہیلو کہہ کر اس سے ہاتھ ملایا پھر وہ کہنے لگی۔
"زوّار شاہ! تم اندر چلے جاؤ۔ ڈیڈی موجود ہیں اور پلیز مائنڈ مت کرنا۔ میں ذرا نومی کے ساتھ جا رہی ہوں۔"
نومی کا بازو اس نے پہلے سے تھام رکھا تھا۔ اب غیر محسوس طریقے سے اسے کھینچتی ہوئی لے گئی اور وہ حیران حیران سا کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
"اتنی بداخلاق کب سے ہو گئی ہو تم؟" باہر آتے ہی نومی اس سے کہنے لگا۔
"کیا مطلب؟"
"تمہارا کزن اتنی دور سے آیا ہے۔ کم از کم اسے اندر تک تو پہنچا دیتیں۔"
"وہ خود جا سکتا ہے۔"
"ہاں۔ لیکن تمہارا فرض تھا۔"
"بس مجھے میرے فرائض مت یاد دلاؤ۔" وہ جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔
"جانا کہاں ہے۔" وہ پوچھنے لگا۔
"تمہارے گھر۔ بہت دن ہو گئے ہیں ماموں جی اور مامی جی سے ملے ہوئے۔"
"اور جب میں کہہ رہا تھا۔"
"تمہارے ہی کہنے سے جا رہی ہوں۔" وہ ہنسی تو اس نے عادت کے مطابق ایک جھٹکے سے بائیک آگے

بڑھادی۔ نومی کے گھر پہنچتے ہی اس نے فون کیا۔

''سحر آپی! میں ماموں جی کے گھر ہوں۔ ابھی نومی کے ساتھ آئی ہوں۔''

''سنو سارا! وہ زوّار شاہ آیا ہے۔'' اپنے تئیں سحر آپی نے اسے اطلاع دی۔

''میں جانتی ہوں آپی! اسے دیکھ کر ہی تو میں نومی کے ساتھ آگئی ہوں۔''

''بے وقوف کب تک فرار کا راستہ اختیار کرتی رہو گی۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ اُلجھ کر پوچھنے لگی۔

''فوراً واپس آؤ۔''

''نہیں آپی! میں اس سے کوئی بات نہیں کر سکوں گی۔ میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ ممی کو بتا دیجئے میں آج یہیں رہوں گی۔''

''سارا!'' سحر آپی اسے سمجھانا چاہتی تھیں لیکن اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر بظاہر وہ آسیہ اور ثمینہ کے ساتھ کبھی باتوں میں مصروف رہی اور کبھی کچن میں لیکن اس کا دھیان مسلسل گھر کی طرف رہا جہاں زوّار شاہ موجود تھا۔ رات بھی وہ بہت بے کل رہی۔ کتنی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ حالانکہ آسیہ ثمینہ اور نومی کے ساتھ مووی دیکھ کر وہ ایک بجے کے قریب بستر پر گئی تھی۔ پھر بھی جاگتی رہی۔ اپنے آپ کو سمجھاتے ہار گئی۔ جب بھی اس کا خیال جھٹکنا چاہا۔ اس کی کوئی نہ کوئی بات ذہن پر دستک دینے لگی۔

''تم اچھی لڑکی ہو۔'' اول روز ہی اس نے کہا تھا اور پھر۔

''کائنات میں اُترتی یہ ڈھیر ساری خوبصورتیاں اور نیا پن تمہارے وجود کا مرہونِ منت ہے۔''

''میں وقت کی مٹھی سے کچھ لمحے چرا لایا ہوں اور انہیں تمہاری سنگت میں امر کرنا چاہتا ہوں۔''

''زوّار شاہ!'' اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ''میرے لیے تو ہر وہ پل امر ہو گیا ہے جو تمہاری سنگت میں گزرا اور آنکھوں میں ہر منظر ٹھہر گیا ہے مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں میں تمہیں بھول نہیں سکتی اور نہ ہی تمہاری آرزو کر سکتی ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ آج جو سلوک میں نے تمہارے ساتھ کیا۔ تم اس کے حقدار تو ہرگز نہیں تھے۔''

صبح ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ سحر آپی کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا ''زوّار شاہ چلا گیا۔ اب تم جلدی سے آ جاؤ۔''

گھر آ کر اسے معلوم ہوا کہ زوّار شاہ آغا جی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ حویلی میں دو تین شادیاں تھیں۔ اور آغا جی نے سب کو بصد اصرار بلایا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن ممی بھی جا رہی تھیں۔ کیونکہ آغا جی نے خاص طور سے انہیں بلایا تھا۔ اسے لیے اسے بھی جانا پڑا۔ حویلی میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ صبا آپی اور اسماء مایوں بیٹھ چکی تھیں۔ جب وہ ممی ڈیڈی اور سحر آپی کے ساتھ حویلی میں داخل ہو رہی تھی۔ اس وقت اس نے زوّار شاہ کو برآمدے میں ستون کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ سب سے مل کر اسماء کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جانتی تھی۔ زوّار شاہ کم از کم یہاں نہیں آئے گا۔ وہ اس کا سامنا کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پیدا کر سکی تھی۔ لیکن آخر کب تک اس سے سامنا نہ ہوتا۔ وہ آغا جی کے بلانے پر نیچے آئی تھی۔ اور وہ آغا جی کے پاس پہلے

سے موجود تھا۔ اس کی آمد کو یکسر نظر انداز کیے اپنے جوتے کی نوک سے قالین کو ہلکے ہلکے ٹھوکر مار رہا تھا۔ وہ چپ چاپ آغا جی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''پُتر! آغا جی اسے دیکھ کر کہنے لگے۔'' تم ذرا زوّار شاہ کے ساتھ اپنی پھوپھو جی کے پاس چلی جاؤ۔''

''میں!'' اس کے حلق میں پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ہاں پُتر! اور تو کوئی فارغ نہیں ہے۔ تم ہی چلی جاؤ۔ کچھ سامان وغیرہ پہنچانا ہے۔ اور شاہ کے لیے تمہاری تائی جی کچھ چیزیں دے رہی ہیں۔ وہ تم احتیاط سے انہیں دے دینا۔'' پھر اس سے کہنے لگے۔

''جاؤ زوّار شاہ! اب دیر مت کرو۔''

''اچھا آغا جی چلتا ہوں۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا اور آغا جی کے کہنے پر وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی تو اندر ہی اندر بہت ڈر رہی تھی۔ خیال تھا کہ وہ اپنی توہین کا بدلہ تو ضرور لے گا لیکن وہ ایک لفظ نہیں بولا۔ بس گاڑی کی اسپیڈ جتنی بڑھا سکتا تھا، بڑھاتا گیا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچے نظریں ونڈ اسکرین پر جمی تھیں اور دونوں بھنوؤں کے درمیان کھڑی گہری لکیر اس کے اندرونی خلفشار کی نشاندہی کر رہی تھی۔ وہ راستوں سے واقف نہیں تھی لیکن جب گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو وہ اطراف دیکھ کر چونک گئی۔ یہ پھوپھو جی کا گھر تو نہیں تھا بلکہ وہ ریسٹ ہاؤس تھا جہاں وہ سب کے ساتھ آئی تھی۔ ''یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

''نیچے اُترو۔'' وہ جواب دینے کے بجائے رعب سے بولا۔

''زوّار شاہ!'' وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے دروازہ کھول کر اسے نیچے دھکیل دیا۔ وہ زمین پر گر گئی تھی اور فوراً اُٹھنے کے بجائے گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اتر کر اس کے پاس آیا اور کلائی تھام کر اُٹھا کر تقریباً گھسیٹتا ہوا ڈھلوانی راستے سے اوپر لے گیا۔

''زوّار شاہ! میں اس سلوک کی عادی نہیں ہوں۔''

''میں بھی اس سلوک کا عادی نہیں تھا۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا۔ خیر اس کا حساب تو بعد میں لوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ۔ یہاں وقت گزاری کے لیے تم نے میرے ساتھ دل لگی کا ناٹک کیوں رچایا؟''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''بکواس مت کرو۔ کیا یہاں سب سے زیادہ بے وقوف تمہیں میں ہی نظر آیا تھا۔ تمہیں میرے جذبوں سے کھیلنے کی اجازت کس نے دی۔ آج تک کبھی کسی نے ایسی جسارت نہیں کی تھی۔''

''میں بھی ایسی جسارت نہ کرتی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اسماء سے منسوب ہو۔'' وہ جو اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا ایک دم رُک گیا۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''تمہاری بہنوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا اور کیوں کیا یہ غلط ہے؟''

''نہیں۔'' وہ پھر بس ایک لفظ کہہ کر خاموش ہو گیا تو وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر چیخ پڑی۔

''پتا نہیں تم اپنے حواسوں میں نہیں رہے یا میں حواس کھو رہی ہوں۔''

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے خود ہی اسے کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا پھر جا کر اس کے لیے پانی لے آیا۔
”سنو۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اب آغا جی کا کوئی فیصلہ قبول نہیں کروں گا۔“
”تو کیا تم نے آغا جی سے۔“
”نہیں۔“ اس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کیونکہ اس سے پہلے ہی جہانگیر لالہ نے اسماء کے لئے آغا جی سے کہہ دیا تھا۔“
”اور اسماء!“
”اسماء بھی یہی چاہتی تھی اور آغا جی نے دونوں کی رضامندی سے فیصلہ ان دونوں کے حق میں دے دیا۔ یوں میں خود بخود آزاد ہو گیا۔“ بات کے اختتام پر وہ ہلکے سے مسکرایا جبکہ وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ پوری آنکھیں کھولے غیر یقینی کی کیفیت میں۔
”لیکن زدار شاہ! میں نے خود دیکھا ہے جب اسماء کھڑکی میں کھڑی ہو کر تمہیں دیکھا کرتی تھی۔“
”ظاہر ہے۔ لان میں صبح ہی صبح ایکسر سائز تم ہی کیا کرتے تھے۔“ وہ ہنس پڑا۔
”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اگر تم حویلی کی چار دیواری سے آگے نظریں دوڑاتیں تو تمہیں جانگیر لالہ چہل قدمی کرتے نظر آتے۔“
”پتا نہیں۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ اس نے انگلیوں پر پیشانی ٹکالی تو گزرے دنوں کی کتنی باتیں یاد آنے لگیں۔
”کیا سوچنے لگیں؟“ وہ اس کا کندھا ہلا کر بولا۔
”کچھ نہیں۔“ وہ طویل سانس لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ چلیں۔“ ابھی پھوپھو جی کی طرف بھی جانا ہے۔“
”جی نہیں۔“ وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
”کیا مطلب؟“
”ابھی مجھے تم سے اس سلوک کا حساب لینا ہے جو اپنے گھر میں تم نے میرے ساتھ کیا۔“
وہ ذرا سا جھینپ کر ہنس پڑی۔
”آئی ایم سوری زدار شاہ! اصل میں۔“ وہ رُکی پھر کہنے لگی۔ ”اب تم جان تو گئے ہو کہ یہ سب کس لیے ہوا۔“
”تم بھی جان لو سارا! کہ اب میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔“ وہ اس کی پیشانی کو اُنگلی سے چھو کر اس کا چہرا اونچا کرتے ہوئے بولا تو وہ بس ایک پل کو ہی اس کی طرف دیکھ سکی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں اور لہجے میں وہی جذبے سمٹ آئے تھے جنہیں محسوس کر کے وہ نروس ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی وہ نروس ہوئی اور وہ محظوظ ہو کر ہنس پڑا۔

بے سمت جستجو کا سفر

”کیا کر رہی ہو......؟“ امی کی آواز پر اس نے الماری کے اندر اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر جواب دیا۔
”صبح کے لیے کپڑے نکال رہی ہوں۔ ابھی استری کر کے رکھ دوں۔“
”ہاں صبح تو وقت بھاگتا ہے......“ امی اس کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹا احسن کو اسکول بھی بھیجنا ہوتا ہے۔ آج جلدی سو گیا احسن۔“
”جی......!“ وہ الماری بند کر کے پلٹی تو امی کو بیٹھا دیکھ کر سمجھ گئی کہ یا تو انہیں نیند نہیں آ رہی یا کوئی خاص بات کہنی ہے۔ اور خاص بات جاننے کے تجسس میں اس نے فوراً استری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور کپڑے ایک طرف رکھ کر امی کے پاس آ بیٹھی۔
”کیا بات ہے، نیند نہیں آ رہی آپ کو......“
”نہیں بس، اب سونے جا رہی تھی۔“ امی نے سوئے ہوئے احسن پر نظر ڈالی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔
”آج ثمینہ کی اماں آئی تھیں ایک رشتہ بتا کر گئی ہیں۔“
”کون ہے......؟“ اس نے فوراً پوچھا۔
”بتا رہی تھیں، کسی فرم میں اچھے عہدے پر ہے۔ دو بچے ہیں، بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔“ امی نے بتا کر اس

کے متوقع سوال سے بچنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

''میرے بچے کو قبول کرے گا......؟''

''یہ باتیں تو بعد میں طے ہونے والی ہیں، ابھی تو......''

''نہیں......'' وہ حسب عادت فوراً ٹوک کر بولی ''سب سے پہلے میرے بچے کو قبول کرنے کی بات طے ہوگی، میں ہزار بار آپ سے کہہ چکی ہوں اور آپ ثمینہ کی اماں کو بھی سمجھا دیجئے کہ جہاں بھی بات کریں، میرے بچے کا ضرور بتائیں اور جو قبول کرنے کی ہامی بھرے، اس سے آپ بات چلا سکتی ہیں۔''

''میں کہوں گی ثمینہ کی اماں سے......'' امی چاہنے کے باوجود اسے کوئی دلیل نہیں دے سکیں کیونکہ اس کی ہٹ دھرمی سے واقف تھیں کہ وہ اس سے ہٹ کر کوئی بھی بات نہیں سنے گی، الٹا نہیں لیکچر دینے بیٹھ جائے گی۔ اس لیے وہیں بات ختم کر کے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کیا بتایا آپ نے؟ اس کے کتنے بچے ہیں......؟'' اس نے جاتی ہوئی امی کو روک کر پوچھا۔

''دو......'' امی نے دو کہنے پر اکتفا کیا۔

''ٹھیک ہے، جب میں اس کے دو بچوں کو قبول کرنے پر تیار ہوں تو اسے بھی میرا ایک بچہ قبول کرنا پڑے گا۔''

وہ ابھی کچھ اور کہتی لیکن امی سونے کا بہانا کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ تب اس نے قدرے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کپڑے اٹھائے اور استری کرنے بیٹھ گئی۔

وہ کوئی ناسمجھ، نادان لڑکی نہیں تھی۔ اچھی خاصی میچور، پڑھی لکھی تھی پھر جاب بھی کرتی تھی، اس لحاظ سے تو اسے معاملہ فہم ہونا چاہیے تھا۔ اور شاید تھی بھی لیکن ایک اس معاملے میں حد درجہ نادانی کا ثبوت دے رہی تھی۔ حالانکہ سوچنے کی بات تھی کہ کوئی دوسرا شخص کیونکر اس کے بچے کی ذمہ داری قبول کرے گا۔ لیکن اسے غالباً ضد ہوگئی تھی۔

''نہیں، میں احسن کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔ اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی......'' اگلی شام بھابھی نے اس رشتے کا ذکر چھیڑ کر ابھی کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بول پڑی۔

''احسن کو کہیں جنگل میں نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہاں ہمارے پاس رہے گا۔ امی، ابو ہم سب ہیں ناں اس کا خیال رکھنے والے کیا تمہیں ہم میں سے کسی پر بھروسا نہیں......'' بھابھی نے دھیرج سے کہا۔

''بات بھروسے کی نہیں اصول کی ہے۔ جب اگلا دو بچے میرے سر ڈال رہا ہے تو میرے ایک بچے کے لیے گنجائش کیوں نہیں رکھتا؟''

''مرد کے پاس دوسرے کی اولاد کے لیے گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ صرف عورت کا ظرف ہے جو دوسری عورت کی اولاد پال لیتی ہے خواہ مجبوراً سہی لیکن مرد مجبور نہیں ہوتا، اس لیے اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی۔''

دھیرج سے بولتی ہوئی بھابھی کی آواز اپنے آپ تیز ہوگئی۔ ''یہ ساری باتیں تمہیں خود سمجھنی چاہئیں۔ کوئی

نادان بچی نہیں ہو تم......عمر نکلی جارہی ہے تمہارا احسن بڑا ہو رہا ہے۔ خوامخواہ کی ضد میں ایک اچھے رشتے کو مت ٹھکراؤ......''

''جسے آپ کی ضد کہہ رہی ہیں، وہ میری مجبوری ہے۔''

''مجبوری کو پاؤں کی زنجیر مت بناؤ، رباب! اگر احسن کا خیال کرو گی تو تمہیں اپنے دل سے دوسری شادی کا خیال نکالنا پڑے گا۔ آگے تمہاری مرضی......'' بھابھی نے آخراً کتا کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

بھابھی کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ دوسری شادی کا خیال دل سے نکالنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس گھر میں اس کی جگہ ماں باپ کے ہونے تک ہے۔ پھر بھابھیاں دو دن کا وجود گوارا نہیں کریں گی۔ اور بھائی تو تھے ہی زن مرید جبکہ احسن ابھی صرف سال کا تھا۔ اس کے بڑا ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ جو اس کے سہارے زندگی گزارنے کا سوچتی۔ ابھی تو خود اپنے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس پوری دنیا میں کیا کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا جو اس معصوم بچے کو اپنی سائبانی کا مان دے سکے۔

''مما......!'' احسن نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اسے سوچوں کے بھنور سے نکال لیا...... ''آپ کو نیند نہیں آرہی......؟''

''نہیں......؟'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اس کی آنکھوں کی نمی سے احسن بھی سمجھا۔

''نہیں بیٹا!'' اس نے احسن کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے پر لٹا لیا پھر اس کے بالوں کو چوم کر بولی۔ ''آپ کے پاپا تو بہت دور چلے گئے اور اب سب یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی آپ سے دور چلی جاؤں لیکن میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

''کہاں مما، آپ کہاں جارہی ہیں۔؟'' احسن نے اس کے بازوؤں سے نکل کر پوچھا۔

''کہیں نہیں۔'' وہ قصداً مسکرائی۔ ''چلو۔ اب آپ سو جاؤ، صبح اسکول جانا ہے۔''

''آپ کو بھی آفس جانا ہے، آپ بھی سو جائیں۔'' احسن نے بڑے پن کا مظاہرہ کیا تو وہ ہنس پڑی۔ پھر اُٹھ کر لائٹ آف کی اور احسن کو سلانے کے بعد بھی کتنی دیر تک وہ جاگتی رہی تھی۔

صبح اس کا آفس جانے کا بالکل دل نہیں چاہا۔ ایک تو نیند پوری نہیں ہو رہی تھی دوسرے ذہن الجھا ہوا تھا۔ لیکن گھر میں جو موضوع چھڑ چکا تھا اس سے بچنے کی خاطر وہ آفس چلی آئی۔ لیکن یہاں بھی بہت کوشش کے باوجود اپنا دھیان نہیں بٹا پا رہی تھی۔ بھابھی کی باتوں میں سچائی تھی جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ پھر بھی وہ خود کو فریب دینے میں لگی ہوئی تھی۔

''پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔ کوئی تو ہوگا جسے احسن کی معصومیت پر پیار آئے گا یا اس کی یتیمی پر ترس۔''

"کیا مسئلہ ہے......؟" نورین صبح سے اسے خود سے الجھتے دیکھ رہی تھی اور اس انتظار میں بھی تھی کہ وہ خود اسے بتائے گی اور جب اس نے نہیں بتایا تو اسے ٹوکنا پڑا۔

"ہیں......!" اس نے چونک کر دیکھا۔

"مسئلہ گمبھیر لگتا ہے جب ہی اب تک حل نہیں ہو سکا۔ مجھے بتاؤ شاید میں کچھ مدد کر سکوں......"

نورین نے بڑے یقین سے کہہ کر اپنی خدمات پیش کیں تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

"تم سے بھی حل نہیں ہوگا......"

"مسئلہ تو بتاؤ......"

"وہی شادی......اس کے دو بچوں کی ماں بن جاؤں اور اپنے بچے کو چھوڑ دوں......"

اس نے تاسف سے کہہ کر اونہہ کے انداز میں سر جھٹکا تو نورین کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

"تم نے کیا جواب دیا......؟"

"میں امی سے کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے بچے کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی۔ ساتھ لے جاؤں گی۔" اس نے نورین کو یوں دیکھا جیسے وہ اسے شاباش دے گی، لیکن اس کے برعکس نورین نے ذرا سا ہنس کر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا جس پر وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولی۔

"کیا ہوا، کچھ غلط کہا میں نے......"

"نہیں......"

"پھر تم نے منہ کیوں موڑ لیا......؟"

"ٹائم دیکھو، پانچ بجنے میں دو منٹ ہیں، جاؤ باس کو بتاؤ اور پھر باہر کہیں اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" نورین نے اپنا بیگ چیک کرتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر باس کے کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے آتے ہی اپنا بیگ اٹھا کر نورین کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"چلو، اس ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں" نورین نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر روڈ کراس کرتی ہوئی اسے ریسٹورنٹ میں لے گئی۔

"یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے رباب۔" نورین بیٹھتے ہی شروع ہو گئی "یہاں بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو دوبارہ اپنا گھر بسانے کے لیے بچوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ جو نہیں دے سکتیں، ان کا گھر نہیں بستا میری طرح......"

اس نے چونک کر دیکھا تو کہنے لگی۔

"دوبار گھر اجڑ چکا ہے میرا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اپنے گھر میں نے خود اجاڑے۔ حالانکہ میری پہلی شادی ہی بہت دیر میں ہوئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ کوئی پروپوزل نہیں تھا بلکہ اپنے حسن و خوبصورتی کے زعم میں میں اچھے اچھے پروپوزل ریجیکٹ کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ سے چھوٹی ساری بہنوں کی شادیاں ہو گئیں، وہ بچوں کی مائیں بن گئیں۔ تب مجھے احساس ہوا تو گو کہ بہت دیر نہیں ہوئی تھی پھر بھی میرے لیے جیسے سارے دروازے بند

ہو گئے تھے۔ لوگ آتے، مجھے دیکھتے اور بڑے آرام سے ریجیکٹ کر دیتے۔ جیسے میں کرتی رہی تھی۔ اور پھر میں جو اپنے لیے بہت اعلیٰ وارفع سوچتی تھی، ایک عام سے بندے سے شادی پر آمادہ ہو گئی لیکن اس کے ساتھ میں زیادہ عرصہ نباہ نہیں کر سکی۔

وہ میرے مقابلے میں کم رو اور کم پڑھا لکھا تھا اور شاید اس کی حد سے زیادہ جی حضوری نے ہی میرا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا جو میں اسے خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ اور سوچتی کہ میں نے ناحق جلدی کی۔ ایسی کوئی عمر تو نہیں نکلی جا رہی تھی میری، مجھے بہت اچھا شوہر مل سکتا تھا بلکہ اب بھی مل سکتا ہے۔ اور جس روز مجھے یہ خیال آیا کہ ابھی بھی مجھے اچھا شوہر مل سکتا ہے میں نے اس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت میں اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ لیکن میں نے بچے کا بھی نہیں سوچا اور اس سے طلاق لے لی۔"

نورین نے اپنی زندگی کے پہلے باب کو مختصراً بیان کر کے یوں تاسف سے سر ہلایا جیسے اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہو اور وہ جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی، اسی خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"انسان جب اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا تو پھر آگے مسلسل غلطیاں ہی کرتا جاتا ہے۔" نورین نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں نے بھی یہی کیا۔ حالانکہ مجھے لوگوں کی طرف سے بہت طعنے ملے لیکن میں ہر ایک کو منہ توڑ جواب دیتی رہی کہ جو میں نے کیا، ٹھیک کیا اور پھر بچے کی پیدائش کے بعد میں نے جاب کر لی کیونکہ میں دیکھی ہی خوبصورت اور اسمارٹ تھی اس لیے لوگ مجھے سراہتے تھے۔ مجھ سے دوستی کے بہانے ڈھونڈتے اور جب انہیں معلوم ہوتا کہ میں مطلقہ اور بچے کی ماں ہوں تب بھی وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے مزید ہمدردی جتا کر کہتے کہ بہت ظلم ہوا آپ کے ساتھ۔ اتنی خوبصورت اتنی اسمارٹ ہیں۔ کیا ہوا تھا......؟

اور میں مزید ہمدردی حاصل کرنے کے لیے خود کو مظلوم اور اس شخص کو ظالم ثابت کرتی۔ یہاں تک کہتی کہ اس نے اپنے بچے کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ جبکہ سچ یہ ہے کہ وہ کئی بار اپنے بچے کو دیکھنے آیا لیکن میں نے ہر بار اسے مایوس لوٹا دیا تھا۔ بہر حال لوگوں کی ہمدردی سے میں یہ سمجھنے لگی تھی کہ میں جب بھی شادی کی بات کروں گی تو اتنے اچھے لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے بچے سمیت قبول کرنے پر فوراً تیار ہو جائے گا۔ اب پتا نہیں یہ میری نادانی تھی یا اپنے بارے میں حد سے زیادہ خوش فہمی، جب لوگ مجھ سے پوچھتے۔

"آئندہ آپ کا کیا ارادہ ہے، کیسے شخص سے شادی کریں گی؟" تو میں مظلومیت کی تصویر بن کر جواب دیتی۔

"مجھے کسی بات کا کوئی لالچ نہیں۔ بس کوئی اچھا انسان ہو جو میرے بچے کو قبول کرے۔ میرے بچے نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا، وہ اس شفقت سے محروم ہے۔"

اور میرے اس جواب پر لوگ بظاہر میری ہاں میں ہاں ملاتے لیکن پھر دھیرے دھیرے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر جاتے۔

اگر میں اس وقت اس حقیقت کو تسلیم کر لیتی کہ کوئی دوسرا شخص میرے بچے کو قبول نہیں کرے گا اور پھر اسی

حساب سے بچے کو ذہنی طور پر تیار کر کے خود سے تھوڑا دور کر لیتی تو شاید میرا گھر بس جاتا لیکن اس کے برعکس میں ضد میں آ گئی کہ شادی بھی ضرور کرنی ہے اور بچے کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے......"

نورین اپنی دوسری غلطی کا اعتراف کر کے اسے دیکھنے لگی تو اس بار وہ فوراً بول پڑی۔

"پھر، تمہاری شادی ہوئی......؟"

"ہاں، ایک شخص تیار ہو گیا تھا، نکاح میں اس نے میرے بچے کو قبول کیا لیکن وہ بچے کا باپ نہیں بنا......عورتیں تو یونہی بدنام ہیں یار، مرد تو تنگ دلی اور تنگ نظری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس شخص نے میرے بچے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جو مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ ویسے یہاں بھی غلطی میری ہی تھی جو میں اول روز بچے کو ساتھ لے گئی تھی۔"

نورین نے بتا کر آخر میں پھر اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو وہ ذرا سا اچھلی۔

"اس میں غلطی کیا ہے، جب اس نے بچے کو قبول کیا تو تمہیں اسے ساتھ ہی لے جانا تھا۔"

"ہاں......لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ اسی وقت، پہلے مجھے اپنی جگہ، اپنا مقام بنانا چاہیے تھا اس کے بعد بچے کو لے جاتی۔ میں نے تو اول روز ہی اپنے اور اس کے درمیان دیوار کھڑی کر دی تھی جسے جب اس نے ذرا سا بھی کھسکانا چاہا۔ میں نے اسے ٹوک دیا۔ اور مرد تو بیوی اور اپنے درمیان اپنی سگی اولاد کو برداشت نہیں کرتا اور وہ تو صرف میرا بچہ تھا۔ جسے زبردستی اس کے سر پر ڈال کر ایک طرح سے میں نے خود اسے بچے پر ظلم کرنے پر مجبور کیا۔ پھر برداشت بھی نہیں کر سکی۔ تم ایسی غلطی مت کرو رباب! تمہیں اگر شادی کرنی ہے تو کچھ عرصے کے لیے تمہیں بچے کو خود سے الگ کرنا ہوگا۔ اس میں صرف تمہاری ہی نہیں بچے کی بھلائی ہے۔"

نورین اپنے حالات بتا کر اب اسے سمجھانے لگی تھی۔

"دیکھو۔ جب لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو وہ ایک ہی رات میں سسرال میں اپنی جگہ اور مقام نہیں بنا سکتی۔ وقت لگتا ہے، جب بچے کی ماں بنتی ہے، تب اپنے حقوق تسلیم کروانے کے قابل ہوتی ہے۔ اس سے پہلے اس کی حیثیت کھلونے جیسی ہوتی ہے۔ اور کھلونے کی حقیقت جانتی ہو نا جب تک من کو بھائے اس کے بعد توڑ کر پھینک دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا......" پھر اچانک پوچھنے لگی......"تمہارے گھر میں کون کون ہے۔؟"

"سب ہیں، امی، ابو، بھائی، بھابھیاں، ان کے بچے......بہنیں اپنے گھروں کی ہیں......" وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"پھر کیا مشکل ہے، تمہارا بچہ آرام سے نانا، نانی کے پاس رہ سکتا ہے۔ وہ کم از کم اسے پیٹ بھر روٹی تو کھلا دیں گے۔ سوتیلا باپ تو ایک ایک نوالہ گنتا ہے۔ اس پر گالیاں الگ، خواہ کتنا پڑھا لکھا اور حیثیت والا آدمی کیوں نہ ہو۔ اس کی اصلیت یہیں کھلتی ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر تمہیں بتا رہی ہوں اور نیک نیتی سے مشورہ دوں گی کہ بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کی غلطی کبھی نہیں کرنا۔ تمہارا میکہ ماشاء اللہ بھرا پڑا ہے۔ اگر ایک بچے کو ڈانٹے گا تو دوسرا پیار کرنے والا بھی موجود ہے سمجھ رہی ہو نا، اور اگر یہ نہیں کر سکتیں تو دوسری شادی کا خیال دل

سے نکال دو۔" آخر میں نورین نے بھابھی کی طرح دوٹوک بات کہہ دی۔

"مجھے شادی کا شوق نہیں ہے، میں آگے کا سوچتی ہوں، میرا بچہ ابھی صرف چار سال کا ہے، اسے بڑا ہونے میں بہت وقت ہے اور اتنا عرصہ مجھے میکے میں کون برداشت کرے گا۔ ابھی دو بھائیوں کی شادیاں ہونی ہیں۔ ان کے بعد تو میرے لیے جگہ بھی نہیں رہے گی۔" اس نے دکھ سے کہا۔

"ہاں، یہ بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ بس تو شادی کر کے پہلے شوہر کے گھر اور اس کے دل میں اپنی جگہ بناؤ۔ اس کے بعد بچے کی جگہ بنانے میں تمہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اچھا انسان ہو، تمہاری محبت اور خدمت گزاری سے متاثر ہو کر فوراً ہی کہے کہ تم اپنے بچے کو لے آؤ۔"

"ہوں......" وہ کتنی دیر تک پرسوچ انداز میں سر ہلاتی رہی پھر نورین کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟ میرا مطلب ہے اپنی غلطیوں سے سبق تو سیکھ چکی ہو۔"

"ہاں لیکن اب دیر ہو چکی ہے۔" نورین قصداً مسکرائی۔

"نہیں، ابھی بھی تم خوبصورت اور اسمارٹ ہو......" اس کی تعریف میں ہرگز مبالغہ نہیں تھا۔

"مجھے پتا ہے لیکن اب میرا بچہ بڑا ہو چکا ہے۔ ماشاء اللہ بارہ سال کا ہے، اور اتنی عمر کے بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ اگر میں نے شادی کی تو وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ ابھی بھی لوگ اسے طعنہ دیتے ہیں کہ تمہاری ماں نے دو شادیاں کیں دو طلاقیں لیں......خیر لوگوں کو تو بکواس کرنے کی عادت ہوتی ہے اور میں پروا بھی نہیں کرتی لیکن میرا بچہ محسوس کرتا ہے۔ اور اگر اب میں نے اس کے لیے قربانی نہیں دی تو میری زندگی تو خراب ہوئی ہی ہے، وہ بھی کچھ نہیں بن سکے گا۔ یوں بھی اب تو پانچ چھ سال کی بات ہے۔ میرا بچہ جوان ہو جائے گا پھر انشاء اللہ مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔"

آخر میں نورین کی آنکھیں آنے والے دنوں کے تصور سے چمکنے لگی تھیں۔

"کاش میرا بچہ بھی اتنا بڑا ہوتا......" اس نے گہری سانس کھینچی۔ پھر گھڑی دیکھتی ہوئی بولی۔ "بہت دیر ہو گئی۔ چلنا چاہیے۔"

"ہاں......!" نورین نے ویٹر کو بلا کر چائے کا بل ادا کیا۔ پھر دونوں باہر نکل کر آئیں تو کہنے لگی......"سنو۔ میری باتوں پر غور ضرور کرنا اور ہر بات کا روشن پہلو سامنے رکھنا، سمجھیں......"

اس نے ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں بھابھی نے اسے کچھ مشکوک نظروں سے دیکھا پھر منہ موڑ کر کچن میں چلی گئیں تو ایک پل کو وہ سن سی ہو گئی پھر مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے احسن کا خیال آیا اور یہ کہ وہ روزانہ کی طرح اس کے انتظار میں برآمدے میں موجود نہیں تھا۔ اور ابھی بھی کسی طرف سے اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تب وہ فوراً کمرے سے نکل کر بھابھی کے پاس کچن میں جا کر پوچھنے لگی۔

"بھابھی! احسن کہاں ہے؟"

"انور کے ساتھ گئے ہیں سب بچے، پارک میں......" بھابھی آٹا گوندھنے میں مصروف تھیں، منہ موڑے بغیر بولیں تو احسن کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ کہنے لگی۔

"مجھے آج دیر ہو گئی، آفس سے تو وہی پانچ بجے نکل آئی تھی پھر نورین کے ساتھ بازار چلی گئی۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی، جلدی جلدی کرتے بھی دیر ہو گئی۔"

بھابھی نے اس کے صفائی پیش کرنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا، جس سے وہ خجل ہو کر رہ گئی۔ اور وہاں کھڑے رہنے کا مزید کوئی جواز سمجھ میں نہیں آیا تو پلٹتی ہوئی بولی۔

"آپ آٹا گوندھ کر رکھ دیں، روٹی میں پکا دوں گی۔"

پھر رات کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی وہ معمول کے مطابق احسن کو اس کا ہوم ورک کروانے بیٹھ گئی لیکن بار بار اس کا دھیان ادھر ادھر ہو رہا تھا۔ کبھی نورین کی باتیں، کبھی بھابھی کی مشکوک نظریں اور کبھی امی کا چبھتا ہوا لہجہ "کہاں چلی گئی تھیں......؟"

"مما......!" احسن نے اپنی کتابیں بیگ میں بند کرتے ہوئے اسے پکارا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"آج آپ نے مجھے کہانی بھی سنانی ہے، صبح آپ نے پرامس کیا تھا۔"

"ہوم ورک کر لیا سب......!"

"سب کر لیا......" احسن اپنا بیگ اٹھا کر بیڈ سے اتر گیا تو وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی، وہ بیگ ٹیبل پر رکھ کر واش روم میں چلا گیا وہاں سے آیا تو اچھل کر بیڈ پر چڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔

"چلو اب سو جاؤ......" اس نے بہت آہستگی سے اپنی گردن میں حمائل اس کے بازو نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں مما! پہلے کہانی......"

"مجھے کوئی کہانی یاد نہیں......" وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ زیرو کا بلب جلا کر ٹیوب لائٹ آف کی پھر آ کر اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولی۔ "اچھے بچے مما کو تنگ نہیں کرتے۔"

"پھر مما چلی جاتی ہیں......؟" احسن کی معصومیت سے کہنے پر اس نے چونک کر پوچھا۔

"کہاں......؟"

"پاپا کے پاس......" پتا نہیں بچے نے یہ بات کسی سے سنی تھی یا اس کے اندر ایسا کوئی خوف تھا۔ وہ کتنی دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"بیٹا! اگر میں چلی گئی تو آپ کیا کرو گے......!"

شاید اس کی بات احسن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، اس لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو قدرے توقف سے وہ پھر پوچھنے لگی۔

"آپ روؤ گے تو نہیں......؟"

"نہیں......"

"نانی اماں کو تنگ بھی نہیں کرو گے......؟"

"نہیں۔ وہ تو نومی تنگ کرتا ہے، میں تو نہیں کرتا، نانی اماں کہتی ہیں میں اچھا بچہ ہوں۔"

"ہاں۔ آپ بہت اچھے بچے ہو......"

اس نے احسن کی پیشانی چومی پھر اسے اپنے برابر لٹا کر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی، کچھ دیر میں ہی وہ سو گیا تو اس کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

واقعی کس قدر ظلم تھا، اتنا معصوم بچہ جو پہلے ہی باپ کی شفقت سے محروم تھا اسے ماں سے بھی دور کرنے کی تدبیریں ہو رہی تھیں، کاش وہ اسے لے کر کہیں دور جا سکتی۔ یا وہ جو اپنے بچوں کے لیے ماں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ اس کے بچے کے سر پر بھی ہاتھ رکھ دیتا۔ آخر مرد اتنے خودغرض کیوں ہوتے ہیں۔ عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مردانگی تو نہ ہوئی۔ نہیں میں کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کروں گی جو میرے بچے کو مجھ سے دور کر دے......

اس کا ذہن پھر بہک گیا تھا۔

بلکہ میں شادی ہی نہیں کروں گی۔ صاف منع کر دوں گی امی کو، میں اور میرا بچہ کسی پر بوجھ نہیں ہیں۔ اگر اس گھر میں ہمارے لیے جگہ نہیں ہے تو میں کسی ہاسٹل میں انتظام کر لوں گی لیکن احسن کو نہیں چھوڑوں گی۔

اس نے سوتے ہوئے احسن کو بازوؤں میں لے کر سینے میں بھینچ لیا تھا۔

اور جب اگلے روز اس نے امی اور بھابھی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کے ساتھ یہی باتیں دہرائیں تو امی رونے لگیں۔

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تم ہم پر بوجھ ہو سکتی ہو یا اس گھر میں تمہارے لیے جگہ تنگ پڑ جائے گی۔"

"پھر میری شادی کا کیوں سوچتی ہیں آپ......؟" وہ ان کے رونے سے پریشان ہو کر بولی۔

"کیسے نہ سوچوں، مرنے والے کے ساتھ تمہاری زندگی ختم تو نہیں ہو گئی۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں ابھی کنواری بیٹھی ہیں اور تمہیں تقدیر نے بیوگی کی چادر اوڑھا دی۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے، میری قسمت۔"

"باقی ساری عمر قسمت کو رونے میں نہیں گزاری جا سکتی رباب......!" بھابھی اسے ٹوک کر بولیں...... "ان برسوں میں تمہیں اتنا تو سمجھ لینا چاہئے کہ مرد کے بغیر چلنا کس قدر مشکل ہے۔ ہم سب تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"میں اگر خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہوں۔ وقت جیسے تیسے گزر ہی جاتا ہے۔ میں احسن کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

ماں کی تان پھر اسی بات پر ٹوٹی تو بھابھی زچ ہو کر بولیں۔

"احسن کو چھوڑنے کی کیا بات ہے، کہیں سات سمندر پار نہیں جا رہیں تم، یہیں اس شہر میں رہو گی، پھر مرد کو رام کرنا کون سا مشکل ہے، شادی ہو جائے تو مرد خود ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔" بھابھی نے اسے سمجھاتے ہوئے امی سے تائید چاہی۔ "کیوں امی! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں......"

"اور ہم اتنا زور اس لیے دے رہے ہیں کہ یہی مناسب وقت ہے ایک تو احسن چھوٹا اور ناسمجھ ہے اور دوسرے جو رشتہ آیا ہوا ہے، وہ انتہائی موزوں ہے۔ اگر میں سچ کہوں تو شیراز کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہوگی، دو بچوں کا باپ ہونے کے باوجود لوگ اسے خوشی سے اپنی لڑکی کا رشتہ دے سکتے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کی بہن کو تم پسند آ گئی ہو۔"

بھابھی کی آخری بات پر اس نے سر جھکا لیا۔

"اتنا مت سوچو، زیادہ سوچنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ مزید اکٹھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آگے تمہاری مرضی۔"

بھابھی ایک طرح سے بات ختم کر کے اُٹھ کھڑی ہوئیں تو اس نے گہری سانس سینے کے اندر روک کر دزدیدہ نظروں سے امی کو دیکھا پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

عورت کو اپنی زندگی میں کئی بار اپنی مرضی اور خواہش کے برعکس فیصلے کرنے کے ساتھ سمجھوتے بھی کرنے پڑتے ہیں اور اس رات ایک نیا سمجھوتا کرتے ہوئے اس نے تمام خدشات کا گلا گھونٹ کر عزم سے سوچا تھا کہ وہ پوری ایمانداری سے شیراز احمد کے بچوں پر اپنی ممتا نچھاور کرے گی اور بدلے میں اس سے اپنے بچے کے لیے تھوڑی سی جگہ کی بھیک بھی نہیں مانگے گی، جب تک وہ ناخدا خود اپنی زبان سے نہیں کہے گا، وہ احسن کو ساتھ نہیں لے جائے گی۔

صبح احسن کو اسکول بھیج کر وہ معمول کے مطابق آفس جانے کے لیے تیار ہوئی۔ پھر کچن میں آ کر جلدی جلدی ناشتا کرتے ہوئے اس نے بظاہر سرسری انداز میں بھابھی سے کہا۔

"بھابھی! میں استعفیٰ دینے جا رہی ہوں۔"

بھابھی نے چونک کر دیکھا تو وہ ہنوز اسی انداز میں کہنے لگی۔

"میری واپسی میں دیر ہو سکتی ہے کیونکہ آفس کے بعد میرا بازار جانے کا ارادہ ہے، اگر نورین تیار ہو گئی تو اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ آپ امی کو بتا دیجیے گا۔"

"اور......؟" بھابھی کی معنی خیز مسکراہٹ سے وہ نظریں چرا گئی۔

"اور کیا......؟"

"امی سے اور کیا کہوں......؟"

"کہہ دیجیے گا۔ آج سے احسن ان کے پاس سوئے گا......" وہ جلدی سے کہہ کر کچن سے نکل آئی۔

"سنو......!" بھابھی اس کے پیچھے دروازے تک آ کر پکار کر بولیں۔ "ہم سب تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ دل پر کوئی بوجھ نہیں رکھنا۔ مجھے یقین ہے احسن زیادہ تم سے دور نہیں رہے گا۔"

"اللہ حافظ......!" اس نے جواب میں قصداً مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔

اور آنکھوں کے سامنے چھائی دھند کی پروا کیے بغیر تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

آفس جاتے ہی اس نے نورین کو بتا دیا کہ آج اس کا آخری دن ہے وہ استعفیٰ دے رہی ہے۔ اور نورین نے سبب نہیں پوچھا بلکہ بڑے آرام سے کہنے لگی۔

"چلو اچھا ہے جان چھوٹی تمہاری اب آرام سے گھر داری کرنا جیسا کہ نوے، پچانوے فیصد عورتیں کر رہی ہیں۔"

"اور باقی پانچ فیصد کیا کرتی ہیں؟" اس نے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ میری طرح دھکے کھاتی ہیں۔" نورین نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا لیکن اس کے لہجے میں خود اپنے لیے تاسف کے ساتھ ملامت بھی تھی۔

"نہیں نورین......!" اس نے غالباً اس کا دل رکھنے کے لیے کچھ کہنا چاہا لیکن نورین فوراً ٹوک کر بولی۔

"حقیقت یہی ہے۔ باقی سب خود کو فریب دینے والی باتیں ہیں...... اس روز میں نے پہلی بار تمہارے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا تھا ورنہ اس سے پہلے میں دوسروں کو الزام دیتی رہی ہوں۔ فلاں نے میرا گھر اجاڑ دیا تو فلاں نے مجھے نہیں بسنے دیا۔ ایسی کوششیں لوگوں کی طرف سے ہوتی ضرور ہیں لیکن جو عورت اپنے گھر کی بنیادیں مضبوط رکھتی ہے اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ اور میں نے تو دونوں بار بنیادوں میں اپنی کسی قربانی کا لہو نہیں ٹپکایا تھا۔ پھر نکلی بھی بڑے زعم سے تھی ٹھوکر مارتی ہوئی۔ کیونکہ مجھے گھر داری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے دونوں بار میں کوئی سمجھوتا کرنے پر بھی تیار نہیں ہوئی۔"

سنو!" اچانک خیال آنے پر وہ پوچھنے لگی۔ "تمہارے بچے کا باپ تو ہے ناں؟"

"ہاں زندہ ہے اور میرا بچہ اسے خط بھی لکھتا ہے۔" نورین نے طنز آمیز تلخ ہنسی کے ساتھ بتایا تو وہ فوراً بولی۔

"پھر میرا مطلب ہے۔ تم دوبارہ اس سے نکاح کر سکتی ہو......"

نورین نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس سے نظریں بھی چرا گئی اور یونہی دراز کھول کر اس میں ہاتھ مارنے لگی۔

"بچے کی خاطر ہی سہی، اسے اپنا باپ مل جائے گا۔" وہ نورین کی خاموشی سے یہی سمجھی کہ وہ اس کی بات سے اتفاق نہیں کر رہی جب ہی تو عاجزی سے اس کے بچے کا احساس دلایا تب دراز بند کر کے نورین اسے دیکھ کر قصداً مسکرا کر بولی۔

"شاید میں بھی یہی چاہتی ہوں بلکہ اپنے دوسرے شوہر سے طلاق لیتے وقت غالباً میرے لاشعور میں یہی خیال تھا لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ مرد دوسرے کی چھوڑی ہوئی بیوی کو تو اپنا لیتا ہے لیکن اپنی بیوی ایک بار ہاتھ

سے نکل جائے تو دوبارہ کسی قیمت پر اسے قبول نہیں کرتا۔"

"تم اس سے کہہ کر تو دیکھو، شاید بچے کی خاطر وہ......"

نورین کی نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میرے بچے نے ایک بار اسے خط میں لکھا تھا۔" وہ خود ہی بتانے لگی۔ "بلکہ میں نے لکھوایا تھا کہ ہم تینوں ایک ساتھ رہیں تو کتنا اچھا ہو۔ اور جواب میں اس نے براہ راست مجھے مخاطب کر کے لکھا تھا کہ ایسا خیال بھی کبھی دل میں نہ لانا، کیونکہ میں اپنی تذلیل بھولا نہیں ہوں اور نہ بھول سکتا ہوں۔"

"نہیں، پہلے میں نے نہیں ملنے دیا تھا پھر اس نے جیسے قسم کھالی کہ بچے کے بلانے پر بھی نہیں آتا۔ ان بارہ برسوں میں تین چار بار بچے کے نام کچھ پیسے بھیجے ہیں اور بس۔" نورین نے کہہ کر گہری سانس کھینچی پھر کہنے لگی۔

"خیر چھوڑو، میرا اب کوئی مسئلہ نہیں کیونکہ میں اپنے لیے کوئی سہارا ڈھونڈنے کے بجائے خود بچے کا سہارا بننے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ ایک نئے عزم کے ساتھ۔ تم سناؤ تمہاری بات طے ہوگئی......؟"

"نہیں، ابھی آج تو میں نے اپنی رضامندی دی ہے۔ باقی مراحل گھر والے طے کریں گے۔ اور پتا نہیں اس میں کتنا وقت لگے اور پتا نہیں بات بنتی بھی ہے کہ نہیں......"

وہ پیڈ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی ہوئی بولی۔

اور بات بننے دیر نہیں لگی، کیونکہ شہزاد احمد کو بہت جلدی تھی۔ دو چھوٹے بچوں کو سنبھالنا انہیں مشکل ہو رہا تھا۔ صبح آفس جاتے ہوئے انہیں بہن کے گھر چھوڑنا۔ واپسی میں ساتھ لے کر آنا۔ پھر رات میں کتنی بار اٹھنا پڑتا تھا۔ غالباً انہیں بچوں سے زیادہ بچوں کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے اس لڑکی کا انتخاب کیا تھا جو پہلے سے ماں تھی ورنہ حقیقتاً ان کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ خود اپنے خاندان میں کتنے لوگ تیار بیٹھے تھے۔ ایک دو نے ان کی بہن سے کہلوایا بھی لیکن شیراز احمد نے صاف منع کر دیا اور شادی کے لیے بیوہ یا مطلقہ کی شرط رکھی جو بچے کی ماں بھی ہو۔ اور اس شرط کے پیچھے ان کی انتہائی خود غرضانہ سوچ تھی کہ ایک تو انہیں بیوی کے ناز نخرے نہیں اٹھانے پڑیں گے جیسا کہ کوئی لڑکی شادی کے ابتدائی دور میں توقع رکھتی ہے۔ دوسرے لڑکی کسی طرح ماں بننے کا فخر نہیں حاصل کرنا چاہے گی۔ اس لیے انہوں نے پہلے ہی سے ایک ماں کا انتخاب کیا تھا۔ جسے بچوں کے بارے میں کچھ بتانے یا سمجھانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔

اور وہ جو اپنے بچے کو چھوڑ کر پوری ایمانداری سے شیراز احمد کے بچوں کی ماں بننے کا عزم لے کر آئی تھی وہ بہر حال ایک عورت بھی تھی۔ بے شک اس کے اندر نئی نویلی دلہن والے ارمان نہ ہوں پھر بھی بیوگی کی چادر کی جگہ سر پر سہاگ کا آنچل اوڑھتے ہی تحفظ کے احساس کے ساتھ اسے نورین کی بات یاد آئی تھی۔

"ہو سکتا ہے، وہ اچھا انسان ہو۔ اور تمہاری محبت و خدمت گزاریوں سے متاثر ہو کر فوراً کہے کہ اپنے بچے کو لے آؤ۔"

اور اس نے پہلی بار بہت احتیاط سے دور کھڑے شیراز احمد کو دیکھا۔ بڑی شاندار پرسنالٹی تھی اور گفتگو کے انداز میں ٹھہراؤ محسوس ہو رہا تھا۔ بھابھی نے ان کی تعریف میں جتنا کچھ کہا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ نظر آ رہے تھے۔ ویل ایجوکیٹڈ، ویل مینرڈ اینڈ ویل پرسنالٹی، اسے لگا جیسے وہ بہت جلد اس گھر میں اپنا مقام بنا لے گی پھر اسے احسن کے سلسلے میں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔

"شیراز! اب ہم چلتے ہیں......" ان کی بہن نے پکار کر کہا تو وہ بہنوئی کو وہیں چھوڑ کر تیز قدموں سے اس طرف آ کر بولے۔

"جی آپی! شعیب بھائی بھی جانے کی بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں، صبح انہیں جلدی آفس جانا ہوتا ہے۔ چلو تم رباب کو کمرے میں لے جاؤ۔ اور دیکھو اس سے کھانے کو پوچھ لینا۔ اچھا رباب! میں چلتی ہوں......"

وہ غالباً میاں کو انتظار میں کھڑے دیکھ کر جلدی جلدی بول رہی تھیں۔

"اور ہاں شیراز! سنی ابھی سویا نہیں ہے شاید تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے۔ اچھا، خدا حافظ......بس یہیں رکو باہر آنے کی ضرورت نہیں ہے......"

وہ کہتی ہوئی تیز تیز قدموں سے اپنے میاں کے پیچھے ہال کمرے سے باہر نکل گئیں تو وہ جو بے دھیانی میں دونوں بہن بھائی کو دیکھنے لگی تھی۔ شیراز کے اپنی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ہی سر جھکا گئی۔ قدرے توقف سے شیراز احمد اس کی طرف پلٹ کر بولے۔

"آیئے رباب! بچے انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے اٹھنے میں بہت جلدی کی نہ بہت دیر، بس چند لمحے، شاید وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھائیں اور جب ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ہال کمرے سے نکلتے ہی برآمدہ تھا پھر پہلا کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہی شیراز احمد بیڈ پر بیٹھے بچے کو پکار کر بولے۔

"سنی، بیٹا! آپ کی ممی آئی ہیں......"

سنی نے پہلے حیران ہو کر دیکھا پھر ایک دم خوش ہو کر اپنی جگہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور دونوں بازو پھیلائے تو وہ اس پر احسن کا گمان کر کے بے اختیار کھنچی چلی گئی، پھر اسے سینے سے لگاتے ہی وہ جذباتی ہو گئی تھی۔

"میں آ گئی ہوں بیٹا! اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

شیراز احمد کے ہونٹوں پر چمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی کیونکہ یہ منظر ان کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"اوکے بیٹا! آپ ممی سے باتیں کرو......"

وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو وہ کچھ چونک کر ان کے پیچھے دیکھنے لگی۔

"آپ اتنے دنوں سے کہاں چلی گئی تھیں ممی؟"

سنی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر پوچھا تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

''کتنے دنوں سے......؟''

''اتنے بہت سارے دنوں سے......''

''آپ مجھے یاد کرتے تھے......؟'' وہ اس کی بات کا جواب گول کر گئی۔

''ہاں اور ہما تو بہت روتی ہے گندی بچی ہے۔''

سنی کے کہنے پر اسے ہما کا خیال آیا تو فوراً اسے چھوڑ کر کاٹ کے پاس آئی۔ سال بھر کی بچی منہ میں فیڈر لیے بے خبر سو رہی تھی۔ فیڈر میں دودھ نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کہیں تھرموس اور دودھ وغیرہ نہیں تھا۔ تب وہ سنی سے پوچھنے لگی۔

''ہما کا دودھ کہاں ہے؟''

''پتا نہیں۔'' سنی کے جواب سے وہ مایوس سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''آپ کو بھی نہیں پتا۔'' سنی کے پوچھنے پر وہ قدرے ٹپٹا گئی پھر اس سے کچن کا پوچھنے کے بجائے کہنے لگی۔

''مجھے پتا ہے، آپ میرے ساتھ کچن میں چلو، پہلے ہما کا فیڈر بنائیں گے پھر آپ کو بھی دودھ پینا ہے، اس کے بعد سوئیں گے۔''

''چلیں۔'' سنی بیڈ سے اترا تو وہ رک کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

پھر اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سنی کو احسن کی طرح دھیرے دھیرے تھپک کر سلایا اور اس کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ شیراز احمد تو بڑے آرام سے اسے بچوں کے پاس چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ کوئی ذومعنی جملہ یا مسکراہٹ میں چھپا کوئی اشارا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی وہ خود سے جا کر ان کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتی تھی۔

زیرو پاور کی مدھم سی روشنی میں اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ سوا بارہ ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن اپنے گھر کی طرف چلا گیا جہاں بھابھی اس وقت بچوں کو ڈانٹ کر سلاتی ہیں اور احسن......

''پتا نہیں احسن سو گیا ہوگا یا میرے بارے میں سوال پر سوال کر کے امی کو پریشان کر رہا ہوگا......'' اس نے سوچتے ہوئے پلکیں موند لیں۔ اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔

یوں آنا کہ آہٹ نہ ہو
ننھے کو گھبراہٹ نہ ہو
نندیا ذرا جلدی سے آنا

احسن یہ لوری بہت شوق سے سنتا تھا اور اس وقت وہ بند پلکوں کے اندر اسے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی کہ اپنے قریب آہٹ محسوس کر کے اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اسی پل شیراز احمد نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھا دیا تھا۔

صبح وہ معمول کے مطابق فجر کی نماز کے لیے اٹھ گئی تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر پہلے بچوں کے کمرے میں جھانک کر ان کی طرف سے اطمینان کیا پھر نماز پڑھی...... سنی، احسن کے برابر تھا اور اس کے اسکول جانے کے خیال سے وہ نماز سے فارغ ہوتے ہی ناشتا بنانے میں لگ گئی۔ اس دوران ہما کے رونے پر اسے چولہا بند کر کے اس کے پاس آنا پڑا اور جلدی جلدی اس کی نیپی تبدیل کرتے ہوئے وہ سنی کو بھی پکار رہی تھی۔

''سنی! اُٹھو بیٹا! اسکول نہیں جانا۔''

''سنی! اسکول نہیں جاتا۔'' عقب سے شیراز احمد کی آواز پر وہ بے اختیار ان کی طرف پلٹ کر بولی۔

''کیوں؟''

''ابھی اس کا ایڈمیشن نہیں ہوا۔'' انہوں نے کہا تو وہ پھر کیوں کہتے کہتے رہ گئی اور ہما کو اٹھا کر واش روم کا رخ کیا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلا کر واپس آئی تو پوچھنے لگی۔

''آپ ناشتا کس وقت کریں گے......؟''

''گزشتہ ایک سال سے تو کوئی روٹین نہیں تھی، اب جو روٹین تم بناؤ گی وہی چلے گی......''

لہجہ سرسری سہی پھر بھی انہوں نے اسے گھر کا مان بخش دیا تھا۔

''شکریہ، آپ چلیں، میں سنی کو لے کر آتی ہوں۔''

اس نے کہا اور سنی کے پاس بیٹھ کر اسے اٹھانے لگی۔

پھر ناشتے کی ٹیبل پر اس نے پہلے دونوں بچوں کو اپنے ہاتھ سے کھلا کر فارغ کیا اس کے بعد اپنے لیے چائے بناتے ہوئے شیراز احمد سے مزید چائے کا پوچھا تو وہ اخبار میں مصروف رہ کر بولے۔

''ہاں...... بنا دو......'' اس نے کپ میں چائے بنا کر ان کے پاس رکھ دی اور خود ناشتا کرنے لگی، کچھ دیر بعد جب انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ کر چائے کا کپ اٹھایا تب وہ کہنے لگی۔

''سنی کو اسکول جانا چاہیے۔ آپ نے اسے داخل کیوں نہیں کروایا؟''

''اصل میں گزشتہ سال ہم یو کے جانے والے تھے تو خیال تھا، سنی کا اسکول وہیں سے شروع ہوگا۔ لیکن پھر ہما کی پیدائش پر ان کی ممی کی ڈیتھ ہو گئی تو ظاہری بات ہے سارا کچھ ڈسٹرب ہو گیا اور میں بچوں کی طرف سے غافل تو نہیں ہوا پھر بھی ان کے بارے میں کچھ طے نہیں کر سکا۔''

وہ خاصے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہے تھے۔ چائے کے آخری گھونٹ سے سگریٹ سلگانے تک خاموشی رہی، اس کے بعد پھر کہنے لگے۔

''ابھی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سنی کو اسکول میں داخل کروا دیں۔ ادھر کچھ پتا نہیں کب میرا لندن جانا فائنل ہو جائے۔''

''آ......'' اس کے لب جانے کیا کہنے کی کوشش میں نیم وا ہو کر رہ گئے اور قدرے گم صم سی حالت میں وہ

انہیں دیکھے گئی تو غالباً اس کی کیفیت بھانپ کر وہ کہنے لگے۔

''اتنی جلدی تو شاید ممکن نہ ہو۔ جاتے جاتے بھی چھ آٹھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے اور اتنے عرصے کے لیے تم اگر چاہو تو سنی کو یہاں کسی قریبی اسکول میں ڈال دو......''

پھر انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو جانے واقعی آفس سے لیٹ ہو گئے تھے یا اس طرف سے اس کا دھیان ہٹا کر اپنی گرفت میں لینا مقصود تھا کہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''آج پہلے ہی دن تم نے مجھے لیٹ کر دیا۔''

''سوری!'' وہ قدرے نروس ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ان کے ساتھ برآمدے تک آئی تو رک کر کہنے لگے۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو چوکیدار سے کہہ دینا اور ہاں ایک عورت کام کرنے کے لیے آتی ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا روٹین ہے چوکیدار کو معلوم ہوگا۔ بہرحال آج تم خود اپنے حساب سے اس کے ساتھ وقت طے کر لینا اور تمہیں کہیں جانا ہو تو مجھے آفس فون کر دینا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔ اوکے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر ایک دم پوچھنے لگی۔

''آپ دوپہر میں......''

''نہیں، میں اب شام میں ہی آؤں گا۔''

وہ فوراً بولے اور اللہ حافظ کہہ کر چلے گئے۔ تو وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر بچوں کا خیال آنے پر سنی کو پکارتی ہوئی لاؤنج میں آئی تو دونوں کارپٹ پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔

''ممی! ابھی ڈیڈی ہمیں پھوپھو کے گھر چھوڑنے جائیں گے ناں؟''

سنی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ کچھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں گرتی ہوئی بولی۔

''نہیں بیٹا! میں جو آ گئی ہوں۔ اب آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ کل میں آپ کو اسکول لے جاؤں گی۔ اسکول جاؤ گے ناں......!''

''ہما بھی جائے گی......؟''

''نہیں ہما تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔''

اس نے ہما کو دیکھا تو بے اختیار اس پر پیار آیا۔ فوراً اُٹھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور بچے صرف پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔ ہما کو تو ماں کی آغوش ملی ہی نہیں تھی فوراً اسے اپنی ممی مان لیا تھا۔ پتا نہیں اس معصوم بچے کو کیا کہہ کر بہلایا گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا، وہ خاصا لاپرواسا ہے اور شاید بچے کے اور اب اس کے حق میں بھی یہی بہتر تھا۔ ورنہ اس کی جگہ اگر کوئی ذہین اور ضدی بچہ ہوتا تو اس کے لیے بہت مشکل ہوتی۔

وہ ہما کو سینے سے لگائے سنی کو دیکھتے ہوئے یہی سب سوچ رہی تھی۔ کہ فون کی بیل نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے ہما کو دیکھا، وہ ماں تا کی نرم گرم آغوش میں سو چکی تھی۔ تب اسے آرام سے صوفے پر لٹا کر اس نے آ کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف بھابھی تھیں ان کی آواز سنتے ہی اس نے احسن کا پوچھا۔

''احسن کیسا ہے بھابھی! میرا مطلب ہے تنگ تو نہیں کیا اس نے اسکول گیا ہے......؟''

''دھیرج سے میری جان دھیرج سے، احسن ٹھیک ہے اور معمول کے مطابق اسکول گیا ہے۔''

بھابھی نے بڑے آرام سے ٹوکتے ہوئے احسن کا بتایا۔ لیکن وہ پھر بھی جذباتی ہو گئی۔

''میرا پوچھ رہا تھا......؟''

''ہاں، اور جب میں نے اسے بتایا کہ تم اس کے پاپا کے پاس گئی ہو تو وہ خوش ہو گیا۔''

''آپ نے ایسا کیوں کہا......!''

''مجھے یہی کہنا چاہیے تھا کیونکہ احسن کو اپنے پاپا یاد نہیں ہیں اور ظاہر ہے اب شیراز احمد ہی اس کے پاپا کہلائیں گے۔ بہرحال تم سناؤ، ٹھیک تو ہو......'' بھابھی بات بدل گئیں۔

''جی......!''

''شیراز احمد کے بچے پرابلم تو نہیں ہیں......؟''

''نہیں بھابھی! یہ تو بڑے پیارے بڑے معصوم بچے ہیں۔'' اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

''اور شیراز......؟''

''وہ بھی ٹھیک ہیں، اچھے ہیں، شام میں آئیں گے تو میں ان کے ساتھ آؤں گی...... مجھے احسن......''

''رباب......!'' بھابھی درمیان میں بول پڑیں۔ ''تم احسن کی فکر نہیں کرو، پہلے اپنے گھر میں شیراز اور ان کے بچوں کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرو اس کے بعد تمہیں احسن کو اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔''

یہ باتیں اتنی بار سن چکی تھی کہ اب اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس لیے اس موضوع سے ہٹ کر اس نے امی، ابو کا پوچھا پھر فون بند کر دیا......

شام میں جب اس نے شیراز سے امی کے ہاں چلنے کو کہا تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ بلکہ فوراً چلنے کو تیار ہو گئے تھے، البتہ سنی اور ہما کو انہوں نے راستے میں اپنی بہن کے ہاں چھوڑ دیا اور اس کے ٹوکنے سے پہلے ہی کہنے لگے۔

''واپسی میں ہم کہیں اور چلیں گے۔ بچے ساتھ ہوں تو بندہ کچھ پابند سا ہو جاتا ہے۔'' ان کی بات کو سچ مان کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔

پھر امی کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظریں احسن کو تلاش کرنے لگیں اور بھابھی کو کیونکہ وہ اپنی آمد کا بتا چکی تھی اس لیے انہوں نے مصلحتاً اس کے آنے سے پہلے ہی سب بچوں کو انور کے ساتھ باہر بھیج دیا تھا۔

''بچے کہاں ہیں......؟'' موقع ملتے ہی اس نے بھابھی سے پوچھا۔

''انور کے ساتھ پارک گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے......'' بھابھی سرسری انداز میں جواب دے کر کچن

شیراز احمد ابو جی سے باتیں کرتے ہوئے اس کی بے چینی نہ صرف محسوس کر رہے تھے بلکہ سمجھ بھی رہے تھے۔
اس کے باوجود ان کے دل میں اس ماں کے لیے کوئی احساس نہیں جاگا۔ اس کے برعکس بڑے اطمینان سے بیٹھے
تھے۔ کچھ دیر بعد آنگن سے بچوں کی آوازیں سنائی دیں تو رباب کا دل چاہا بھاگ کر جائے لیکن پھر کسی خیال کے
تحت اس نے خود کو روک لیا۔ اور انتظار کرنے لگی۔

جب احسن نے کمرے میں آ کر اسے پکارا تب بے قراری سے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے بھی
اس کا دھیان شیراز احمد کی طرف تھا۔ وہ ممتا کی بے قراری اور تقاضوں پر ان کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی اور
اسے سخت مایوسی ہوئی کہ ادھر سے کوئی توجہ نہیں ملی۔ بلکہ شیراز احمد نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ تب وہ احسن کو اسی
طرح بازوؤں میں لیے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ آنگن میں بچھی چارپائی پر اسے لے کر بیٹھی تو وہ پوچھنے لگا۔

"مما! آپ پاپا کو لینے گئی تھیں......؟" ہلکے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

"کہاں ہیں پاپا......؟"

"وہ اندر ہیں......لیکن ابھی آپ ان سے نہیں ملو گے۔" وہ آنسو پیتی ہوئی بولی۔

"کیوں مما......؟"

"بس بیٹا......!" اس نے احسن کو سینے میں بھینچ لیا۔ "کوئی سوال نہیں کرو......مما جواب نہیں دے سکتیں۔"

"رباب......!" بھابھی نے دھیرے سے اس کا کندھا دبایا۔ "یہ کیا بے وقوفی کر رہی ہو۔ احسن! تم جاؤ بیٹا
نومی کے ساتھ کھیلو۔"

"یہ انصاف نہیں ہے بھابھی۔!" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

"انصاف ان پر چھوڑ دو......" بھابھی نے انگلی سے اوپر اشارا کیا تو اس کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئی
تھیں۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ شیراز احمد کے گھر اور ان کے بچوں میں یوں رچ بس گئی کہ اگر احسن
اخیال نہ ہوتا تو وہ خود بھی یہی سمجھتی کہ اس نے اپنی نئی زندگی کی ابتدا اسی گھر سے کی تھی۔ شیراز احمد کے ساتھ......
رنی اور ہما نے بھی اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اس گھر میں حقیقتاً اسے ہر طرح کا اطمینان اور سکون تھا۔ لیکن
احسن کی دوری اسے اندر ہی اندر بے چین رکھتی تھی۔

اور شیراز احمد کی تنگ دلی پر اسے افسوس ہوتا تھا۔ جو اسے تو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس کی ہر بات مانتے۔
جب بھی امی کے گھر جانے کا کہتی، اسی وقت لے جاتے۔ لیکن خود انہوں نے کبھی بھول کر بھی احسن کو مخاطب نہیں
کیا۔ وہ اگر قریب بھی کھڑا ہوتا تو یوں انجان بنے رہتے جیسے سرے سے اسے پہچانتے ہی نہ ہوں۔ اور بچے خود
سے لپک کر کبھی کسی کی طرف نہیں جاتے۔ وہ محبت کی پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔ احسن ان کی بے نیازی سے پہلے

ف ہوا پھر ان کی آمد پر ادھر اُدھر چھپنے لگا تھا۔ یہ صورتحال اس کے لیے نہ صرف پریشان کن بلکہ انتہائی تکلیف
ی اور کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا، بدلے میں وہ بھی سنی اور ہما کو نظر انداز کرنا شروع کر دے۔ شاید اس طرح
راز احمد کو احساس ہو۔

ایک آدھ بار اس نے کوشش بھی کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ سنی جب بھی اسے پکارتا تھا تو اسے
ما پر احسن ہی کا گمان ہوتا۔ اور دکھی ممتا بے اختیار اس کی طرف لپکتی تھی۔ تب ہار مان کر اس نے شیراز احمد کی
بے حسی سے بہت خاموشی سے سمجھوتا کر لیا۔ اور یہ تو پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ ان سے اپنے بچے کے لیے بھیک
ہیں مانگے گی اور کیوں مانگے، وہ اس ناخدا سے۔ اس میں اگر انسانیت ہوتی تو وہ نکاح میں ہی اس یتیم بچے کو
بول کر سکتا تھا۔

نورین نے ٹھیک کہا تھا کہ خواہ کتنا پڑھا لکھا اور حیثیت والا آدمی کیوں نہ ہو، اس کی اصلیت یہیں کھلتی ہے۔
ں وقت نورین کی بات یاد آنے پر اس نے اسی وقت اسے آفس فون کر ڈالا۔

"یہ میں ہوں......رباب......" اس نے کہا تو ادھر نورین نے خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔

"آہا رباب......کیسی ہو......؟"

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ......"

"میرے پاس سنانے کو وہی پرانی باتیں ہیں البتہ تمہارے پاس نئی تازہ......سب سے پہلے تو خوشخبری
اؤ......" نورین کے معنی خیز لہجے کے باوجود سمجھی نہیں۔

"خوشخبری......!"

"ہاں بھئی، آبادی میں اضافے والی......" نورین نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بھئی، ابھی ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے کیونکہ ہما ابھی بہت چھوٹی ہے......"

"تم غالباً شیزار کی بیٹی کی بات کر رہی ہو، ارے وہ چھوٹی ہے یا بڑی، تمہیں اس سے کیا، تمہاری کوکھ سے تو
تم نہیں لیا اس نے، تم اپنا سوچو، تمہاری حیثیت اسی وقت مستحکم ہوگی جب تم خود شیزار کے بچے کو جنم دو گی۔
بجھیں۔"

نورین نے جیسے زچ ہو کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"سمجھ گئی......" وہ جلدی سے بولی کیونکہ اس کے ایک ہی سانس میں بولنے سے پریشان ہو گئی تھی۔

"اور تمہارا احسن کیسا ہے......؟"

"ٹھیک ہے، امی کے پاس ہوتا ہے......"

"شیراز تمہیں اس سے ملنے سے روکتے تو نہیں......!" نورین نے موضوع بدل کر بھی اسے پریشان ہی کیا

"نہیں نورین! شیراز نے مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی، میں جس وقت کہتی ہوں مجھے لے جاتے ہیں۔

البتہ وہ خود احسن سے بات نہیں کرتے......"
اس نے دکھ سے بتایا تو نورین اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔
"چلو یہ بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے تم پر پابندی نہیں لگائی۔ تم اس بات کو محسوس مت کرو کہ وہ احسن سے بات نہیں کرتے بلکہ تمہارے بچے کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ ابھی ان کا ایک امیج بنالے گا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ ہر پہلو سے اس بچے پر عیاں ہوتا جائے گا۔ تو اس طرح بچے کے دل میں تمہارا مقام برقرار رہے گا۔ اور اگر زندگی میں کبھی اس شخص کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی تو تمہارا بچہ شاکڈ نہیں ہوگا...... ویسے شیراز ہیں کیسے......؟"
"احسن کے علاوہ ہر معاملے میں بہت اچھے......" اس نے صاف گوئی سے کہا......
"بس تو رباب! صبر کرلو اور خوش رہو۔ کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یوں بھی مرد کو اپنے بچوں کے لیے ماں مل جاتی ہے لیکن عورت اس معاملے میں بڑی بدقسمت ہے، اسے اپنے بچے کے لیے باپ کبھی نہیں ملتا......"
نوری نے اسے حوصلہ دیا پھر اچانک یاد آنے پر کہنے لگی......
"ارے ہاں...... میرے پاس ایک نئی خبر ہے، سنوگی......"
"ضرور......"
"ابھی پچھلے دنوں میرے بچے کے نام اس کے باپ کی طرف سے بیس ہزار کا ڈرافٹ آیا تھا۔" نورین مزے لے کر بتانے لگی۔
"لیکن اس بار میرے آفاق نے ڈرافٹ پھاڑ کر واپس بھجوا دیا اور ساتھ میں اسے یہ بھی لکھا کہ مجھے آپ کی اور آپ کے پیسوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے میری ماں ہی میرے لیے سب کچھ ہے......"
"اچھا......!" وہ کوشش کے باوجود خوشی کا اظہار نہیں کرسکی۔
"میں نے کہا، شاباش بیٹا! ہمیں اللہ کے سوا کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے، اور یہی سچ ہے رباب میں، جب تک دوسروں کا سہارا ڈھونڈتی رہی پریشان رہی۔ یقین کرو، رات رات بھر جاگ کر یہی سوچتی رہتی تھی کہ ہمارا کیا ہوگا۔ پھر ایک روز شعر پڑھا، وہ کیا ہے کہ......

سہارا جو ڈھونڈتے ہیں کسی کا بحر میں
سفینہ ایسے لوگوں کا اکثر ڈوب جاتا ہے

بس اسی وقت سے اپنا ہر معاملہ اللہ پر چھوڑ کر میں نے خود ہمت کرلی اور گو کہ ابھی چند سال اور مجھے کچھ تکلیفیں اٹھانی ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے۔ میں پریشان نہیں ہوں۔"
نورین کے لہجے میں ان تکلیفوں کے بعد ملنے والی راحتوں کی جھنکار تھی۔
"ہاں نورین! ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔"
اس نے کہا اور ہما کے رونے کی آواز پر نورین سے معذرت کرکے فون بند کردیا اور جلدی سے جا کر ہما کے

لیے فیڈر بنا لائی۔ پھر اسے جھولے میں لٹا کر فیڈر اس کے منہ میں دی اور دھیرے دھیرے جھلانے لگی۔ اس کی نظریں بظاہر ہما کو دیکھ رہی تھیں لیکن ذہن مسلسل نورین کی باتوں کو سوچ رہا تھا۔ پھر ایک دم اپنے اور نورین کے حالات کا موازنہ کرنے لگی اور آخر میں اس نے نورین کی طرح خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اس کا دل آنے والے وقت کو سوچ کر سہم سا گیا تھا۔ جب احسن اس سے سوال کرے گا۔
"ماں! تم نے اپنی خوشیوں کی خاطر مجھے نظرانداز کیوں کردیا تھا۔ میرے بڑا ہونے کا انتظار کیوں نہیں کیا......؟"
اور وہ کیا جواب دے گی۔ کیا اسے یقین دلا سکے گی کہ یہ خوشیوں کے نہیں مجبوریوں کے سودے تھے۔

شام میں شیراز آئے تو وہ کتنی دیر تک ان کے سامنے نہیں گئی۔ قصداً خود کو پہلے کچن اور پھر بچوں کے ساتھ مصروف رکھا۔ کیونکہ دن بھر کی سوچوں نے اسے پریشان کردیا تھا اور وہ بے حد مضمحل دکھائی دے رہی تھی۔ جانتی تھی کہ شیراز نہ صرف فوراً محسوس کرلیں گے بلکہ پوچھیں گے بھی ضرور کہ اسے کیا ہوا ہے اور وہ اپنی زندگی کا یہ دکھ یا المیہ ان کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتی تھی کہ اس کے ذمہ دار وہی تھے۔
"رباب......!" بالآخر شیراز خود ہی اسے پکارتے ہوئے آگئے۔" کہاں مصروف ہو بھئی......؟"
"جی کوئی کام ہے آپ کو......" وہ ان کی طرف پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ تعجب سے بولے۔
"یہ کیا بات ہوئی، یعنی جب کوئی کام ہوگا تب ہی تمہیں بلایا جائے گا۔"
"نہیں...... وہ...... میں ذرا سنی کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔" وہ قدرے بوکھلا گئی۔
"یہ ہوم ورک کا وقت نہیں ہے، چلو کہیں باہر چلتے ہیں، جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک کرکے آؤ، ہری اپ......"
انہوں نے کہا تو وہ ہما کو ان کے حوالے کرکے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد کمرے سے نکلی تو وہ بچوں کے ساتھ برآمدے میں کھڑے تھے۔
"کہاں چلیں گے......؟" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔
"پلے لینڈ......" پیچھے سے سنی بول پڑا۔ "ممی! پلے لینڈ چلیں، میں جھولے پر بیٹھوں گا، اور ہما کو بھی اپنے ساتھ بٹھاؤں گا۔"
"چلیں، جہاں بچے کہہ رہے ہیں......" اس نے سنی کی بات نہیں ٹالی اور شیراز کو وہیں چلنے کا کہا۔
تاریکی پھیلنے کے ساتھ پلے لینڈ کی رونق میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جگمگاتی روشنیوں میں دونوں بچے بہت خوش ہو رہے تھے۔ اور بچے اپنے ہوں یا کسی اور کے اپنی معصوم ہنسی اور شرارتوں سے توجہ کھینچ لیتے ہیں وہ بھی بہل گئی تھی۔
شیراز ایک طرف کھڑے ہو کر خاموشی سے دیکھتے رہے...... وہی بچوں کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کبھی سنی

کو جھولے پر بٹھاتی۔ کبھی ہما کو گود میں لے کر کسی طرف اشارا کر کے اسے کھلکھلانے پر مجبور کرتی۔ پھر بے اختیار اس کے پھولے پھولے گالوں کو چومنے لگتی۔ تو ادھر شیراز احمد کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل جاتی پھر وہیں سے کھانا کھاتے ہوئے وہ واپس آئے تھے...... اتنی اچھل کود سے بچے تھک گئے تھے۔ اس نے آتے ہی دونوں کو سلا دیا۔ پھر اپنے کمرے میں آئی تو شیراز بریف کیس کھولے جانے کن کاغذات میں مصروف تھے۔ اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھنے لگے۔

''تمہارا پاسپورٹ ہے یا بنوانا پڑے گا......؟'' اور اسے غالباً یاد نہیں تھا کہ انہوں نے اول روز لندن جانے کی بات کی تھی۔ جب ہی چونکے بغیر سادگی سے بولی۔

''نہیں، پاسپورٹ تو نہیں ہے میرا......''

''اچھا تو یہاں آ کر بیٹھو......'' انہوں نے بریف کیس کھسکا کر اس کے لیے جگہ بنائی۔ پھر ایک فارم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''یہ فارم سائن کر دو اور اپنا شناختی کارڈ بھی دے دینا۔ میں کل ہی جمع کروا دوں گا۔''

''کیوں، میرا مطلب ہے، یہ پاسپورٹ کی ضرورت کیوں آن پڑی......؟'' اس نے فارم لیتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ کسی بھی وقت میرا لندن جانا فائنل ہو سکتا ہے۔'' اس بار ان کا انداز سرسری تھا اور وہ ٹھٹک گئی۔

''ہاں، لیکن......'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی، ارے لوگ تو باہر جانے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں، اور ہم تو اس لحاظ سے بہت لکی ہیں۔''

وہ ان کے چمکتے چہرے سے نظریں ہٹا کر فارم سائن کرنے لگی۔ پھر اٹھ کر الماری سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر انہیں تھمایا اور کمرے سے نکلنے کا بہانا ڈھونڈنے لگی، یا شاید اس شخص سے دور جانے کا۔

''بیٹھ جاؤ......'' انہوں نے اس کے کھڑے رہنے پر ٹوکا تو وہ ذرا سا چونکی اور پھر بوجھل قدموں سے اپنی جگہ پر بیٹھنے آ رہی تھی کہ بچوں کے کمرے سے ہما کے چیخ کر رونے کی آواز سن کر اسے بھاگنے کا موقع مل گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا......؟'' اس نے ہما کو گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا تو بچی اپنی ٹانگوں کو پٹخ کر اور زیادہ رونے لگی۔ وہ سمجھ گئی زیادہ کھیل کود سے اب اس کی ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔

''کیوں رو رہی ہے......؟'' شیراز نے دروازے میں آ کر پوچھا تو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''شاید تھک گئی ہے......''

''اچھا، میں سو رہا ہوں، مجھے صبح جلدی اُٹھا دینا......'' وہ ہما کی طرف سے کوئی تشویش ظاہر کیے بغیر اطمینان سے سونے چلے گئے۔ جس پر وہ کتنی دیر تک سوچتی رہی کہ یہ ان کی بے حسی ہے یا حد درجے کا اطمینان۔ اور دوسری

یک تھی کہ رت جگے تو ماؤں کے حصے میں آتے ہیں اور وہ ماں تھی۔

وہ ہما کو لٹا کر اس کی ٹانگوں پر تیل کی مالش کرنے لگی، ادھر سنی بھی نیند میں ٹانگیں چلا رہا تھا۔ جب ہما سکون ...ئی تب وہ سنی کے پاس آ بیٹھی اور اس کی ٹانگوں پر تیل لگاتے ہوئے اس کی ذہنی رو بہک گئی۔

...سنو۔ احسن کے بعد میری ٹانگوں پر بھی تیل لگا دینا، بہت درد ہو رہا ہے......''

...پے تئیں معصومیت سے کہا گیا تھا لیکن وہ اس کی آنکھوں میں چمکتی شوخیاں دیکھ رہی تھی۔

''جی نہیں، آپ خود لگا لیں......''

''احسن کو بھی تو لگا رہی ہو......'' فوراً احتجاج ہوا تھا۔

''یہ بچہ ہے اور آپ بچے کے باپ......''

''کیوں، کیا بچے کے باپ پر یہ مہربانی نہیں ہو سکتی۔''

''بالکل نہیں......'' وہ بچے کی ماں بن کر اٹھلا رہی تھی۔ لہجے میں تفاخر بھی تھے۔ جیسے اب تم سے زیادہ ...رے بچے کا حق ہے مجھ پر......

''کیوں، کیوں......؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''اس لیے کہ آپ کا وقت گزر گیا اب اس کا وقت ہے۔'' وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو کر اسے مزید چھیڑ ...تی۔

''اس کی تو میں ایسی کی تیسی کر دوں گا......'' وہ سوتے ہوئے احسن پر جھپٹنا چاہتا تھا لیکن وہ ڈھال بن کر ...تی۔

''خبردار......''

''ہٹ جاؤ سامنے سے......'' وہ فلمی ڈائیلاگ بولنے لگا تھا۔ بالکل فلمی انداز میں...... ''میں نہیں چھوڑوں گا ...اس نے تمہیں مجھ سے دور کیا ہے۔ میں اسے تم سے دور کر دوں گا......''

''جاؤ، جاؤ، میرے بچے کو مجھ سے دور کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔''

وہ ہنسی روک کر اسی کے انداز میں بولی تھی۔

''اف......!'' سنی کا پاؤں سینے پر لگنے سے اسے جھٹکا لگا تھا اور شاید دھچکا بھی...... پھر بھی اس نے سنی کا ...ں ہونٹوں سے چوما، اور روانی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے صاف کرتی ہوئی اس کے پاس اُٹھ ...لیکن کمرے سے نہیں گئی۔ اور وہ پوری رات اس نے اس کمرے میں ٹہلتے ہوئے گزاری...... کبھی اسے ...ین کی باتیں یاد آتیں کبھی بھابھی کی۔

''احسن کو چھوڑنے کی کیا بات ہے۔ کہیں سات سمندر پار نہیں جا رہیں تم...... یہیں اسی شہر میں رہو گی، پھر ...رام کرنا کون سا مشکل ہے۔ شادی ہو جائے تو مرد خود ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے......''

''آنے والا وقت کسی نے نہیں دیکھا پھر اتنے یقین سے ایسی باتیں کیوں کی گئیں۔'' وہ بہت دکھ سے سوچ

رہی تھی۔
"تم نے بھی تو کوشش نہیں کی......" یہ آواز پتا نہیں کس کی تھی۔
"کیسی کوشش؟ کیا میں خود بات کروں شیراز سے۔ احسن کے لیے......؟" وہ ٹھٹک کر رکی تھی۔
"ہاں...... ہوسکتا ہے، وہ اسی انتظار میں ہوں۔ اسے انا کا مسئلہ مت بناؤ رباب......!"
اور جب اندھیرے کی آغوش سے مدھم سا اجالا اپنی چھب دکھلا رہا تھا تب اپنی انا کو کچلنے میں کامیاب ہو کر وہ نماز کے لیے کھڑی ہوگئی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ شیراز نے جلدی اٹھانے کا کہا تھا اس لیے جلدی سے چائے بنا کر وہ کمرے میں لے آئی۔ انہیں اٹھا کر چائے کا کپ سامنے کیا تو اس کی سرخ بوجھل آنکھوں کو دیکھ کر انہوں نے کپ کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔
"کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"
"جی بس وہ رات میں ہما نے جگائے رکھا۔ بہت بے چین رہی اور سنی بھی......" وہ نظریں چرا کر بولی۔
"تو یہ رت جگے کی لالی ہے، تھک گئی ہوگی تم بھی۔ ایسا کرو اب تم سو جاؤ...... ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔"
انہوں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر پاس بٹھاتے ہوئے کہا تو وہ لہجے کو خوشگوار بنا کر بولی۔
"جناب! ابھی ناشتا بنانا ہے۔ سنی کو اسکول بھیجنا ہے اور پھر ہما اٹھ گئی تو اسے کون دیکھے گا......"
"ہوں......!" انہوں نے سوچتے ہوئے چائے کا گھونٹ لیا پھر کہنے لگے۔
"مجھے ایک دو ضروری کام ہیں اس کے بعد میں آجاؤں گا۔ یعنی دوپہر سے پہلے اوکے......"
"جی......!" وہ اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
پھر ناشتا بناتے ہوئے وہ اسی وقت شیراز سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کرتی رہی۔ کیونکہ انہوں نے آج ہی فارم جمع کروانے کا کہا تھا۔ اور اگر وہ احسن کو ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگئے تو پھر نئے سرے سے اس کے نام کا اندراج کروانے میں پرابلم نہ بھی ہوئی تو وقت تو لگے گا اور ایسا کوئی معمولی سا بہانہ راہ میں حائل ہوجائے۔ بہرحال ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے سنی کو اسکول بھیجا اور ہما کو لے کر اپنے کمرے میں آئی تو شیراز بریف کیس میں جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔
"رات تم نے اپنا شناختی کارڈ دیا تھا مجھے......!"
"جی......!"
"کہاں گیا......؟" وہ پھر بریف کیس میں دیکھنے لگے۔
"آپ نے شاید تکیے کے نیچے رکھا تھا......" وہ کہتی ہوئی آگے بڑھی اور تکیے کے نیچے سے شناختی کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ اور یہ اچھا موقع تھا بات آپ ہی آپ شروع ہوگئی تھی۔ وہ ان کے سامنے آکر پوچھنے لگی۔
"بچوں کے ناموں کا اندراج آپ میرے پاسپورٹ میں کرائیں گے یا اپنے......" وہ ذرا سا چونکے لیکن

ذرا سنبھل کر کہنے لگے۔
"بچوں کے نام پہلے بھی ان کی ماں کے پاسپورٹ میں تھے اور ابھی بھی ماں کے ساتھ ہوں گے...... تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے......"
"اعتراض کیوں ہوگا......"
"پھر تم نے یہ سوال کیوں اٹھایا......؟" وہ بریف کیس بند کر کے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ تو اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ اندر ہی اندر جزبز ہوتی نظریں چرا کر ہما کو دیکھنے لگی، جو بیڈ پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"ارے......!" اسے موقع مل گیا۔ ہما کو اٹھا کر بیڈ پر بٹھانے میں اس نے قصداً کچھ وقت لگایا پھر دوبارہ پہلے والی پوزیشن میں کھڑی ہو کر بولی...... "میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہم اتنی دور جائیں گے اور جانے کتنے عرصے کے لیے۔ اگر احسن کو بھی...... میرا مطلب ہے......"
"رباب......!" انہوں نے آگے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اسے لیے ہوئے صوفے پر آکر بیٹھے تو کہنے لگے...... "مجھے اگر تمہارے بچے کو یہاں لانا ہوتا تو میں اول روز اسے تمہارے ساتھ لے کر آتا اور نہیں لایا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے گھر میں اس کے لیے جگہ نہیں تھی بلکہ مجھے اس میں اس بچے کی بھلائی نظر آئی تھی۔ یہاں آکر وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں جب میں آفس سے آتا ہوں تو سنی اور ہما کس طرح لپک کر میری طرف آتے ہیں۔ بلکہ ہر بچہ شام میں باپ کی طرف اسی طرح لپکتا ہے۔ اور مجھے ڈر تھا کہ ایسے میں تمہارا بچہ کبھی انجانے میں بھی مجھ سے نظر انداز ہوگیا تو اس کے ساتھ ساتھ تم بھی محسوس کرو گی۔ اور اس وقت ماحول عجیب سا ہو جاتا ہے۔ آپس میں رنجش اور کشیدگی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تمہارے بچے کا ذہن متاثر ہو۔ وہ ماشاءاللہ بہت ذہین بچہ ہے۔ یہاں لا کر یا اسے اپنے ساتھ لندن لے جا کر تم اس کے ساتھ ظلم کرو گی۔ ویسے تمہاری مرضی......"
انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اسے تاریک پہلو دکھا کر فیصلہ اس پر چھوڑ دیا۔ تو وہ جو قدرے گم صم انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ گہری سانس سینے کے اندر دبا کر سر جھکا گئی۔ تب وہ گھڑی پر نظر ڈالتے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"اوکے، میں چلتا ہوں، اور سنو تم پلیز آرام کرنا کھانا وانا پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں لیتا آؤں گا۔"
وہ کچھ نہیں بولی نہ ہی انہیں سی آف کرنے کے لیے اٹھی۔ بس انہیں کمرے سے جاتے ہوئے دیکھا اس کے جیسے وہ ٹوٹ گئی تھی۔
"پتا نہیں شیراز احمد! تم نے اپنی تنگ دلی، اور تنگ نظری کا اعتراف کیا ہے یا خود کو اعلا ظرف ثابت کرنے کی۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ درحقیقت تم کیا ہو......"

شیراز احمد نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا اور اس نے ان کی توقع کے عین مطابق احسن کو ساتھ لے جانے سے منع کر دیا۔ لیکن شیراز پر اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان کی باتوں کی روشنی میں اس نے یہ فیصلہ کیا ہے، اس کے برعکس وہ تو لے جانا چاہتی تھی لیکن امی، ابو، احسن کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا ان کی خوشی کی خاطر وہ اپنے بچے کو ان کے پاس چھوڑ رہی ہے اور شیراز احمد کو کسی کی خوشی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے وہ بہت اطمینان سے ہو گئے تھے اور ان کا یہ اطمینان اس نے شدت سے محسوس کیا۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ بہت بے چین سے تھے اور بات بات پر جھنجلاتے بھی رہے تھے۔ اور یہ کیفیت اس وقت تک تھی جب تک اس نے احسن کو یہیں چھوڑ جانے کی بات نہیں کی۔ بہرحال اب ان کے اطمینان پر اس کا ردعمل فطری تھا کہ ہما خالی فیڈر ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے پیچھے گھوم رہی تھی اور وہ دیکھ کر بھی انجان ہی بنی ہوئی تھی۔ آخر بھوک سے نڈھال ہو کر ہما نے فیڈر پٹخ دیا فرش پر بیٹھ کر رونے لگی، تب بھی اس نے توجہ نہیں دی تو سنی چیخ کر بولا۔

''ممی! ہما کو بھوک لگی ہے، اسے فیڈر بنا دیں۔''

''دیکھتے نہیں میں کام کر رہی ہوں، فارغ ہوں گی تو بنا دوں گی۔'' جواباً وہ بھی چیخی تو سنی نے قدرے سہم کر اور حیران ہو کر اسے دیکھا پھر آگے آ کر پہلے فیڈر اٹھایا پھر ہما کے پاس بیٹھ کر بولا۔

''چپ ہو جاؤ، ممی کام کر لیں پھر دودھ بنا دیں گی۔'' اس نے ایک لمحہ کو رک کر ان دونوں کو دیکھا پھر فوراً سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گئی اس وقت کوئی کام نہیں تھا پھر بھی اس نے کام نکال لیا۔

بیڈ پر سے چادر کھینچ لی اور الماری میں سے دوسری نکال کر بچھانے لگی، ہما کے مچل مچل کر رونے کی آواز آ رہی تھی اور وہ چادر بچھانے کے بعد بڑے آرام سے لیٹ گئی پھر آنکھوں پر بازو رکھ کر تنفر سے سوچا۔

''میرا بچہ تو تمہارے ظلم سے بچ گیا شیراز احمد! لیکن تمہارے بچوں کو کون بچائے گا۔''

''چہ چہ۔'' یہ ملامت اس کے اندر سے تھی خود اس کے لیے ''ان معصوموں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے رباب! ان پر ظلم کر کے انہیں خود سے دور مت کرو۔ یہ تمہاری مامتا کی تسکین کا باعث ہیں۔''

''اف!'' وہ تکیے پر سر پٹخنے لگی۔ معاً گہری خاموشی کا احساس ہوا ہما کے رونے کی آواز آ رہی تھی نہ سنی کی اسے چپ کرانے کی۔ کچھ دیر اس نے جیسے سانس روک کر کوئی آواز سننے کی کوشش کی پھر اٹھ کر کمرے سے نکلی تو سچ مچ اس کا پورا وجود سن ہو گیا۔ وہیں برآمدے کے فرش پر دونوں بچے ایک روتے اور دوسرا اسے چپ کراتے سو گیا تھا۔ چند لمحو بعد اس کے وجود میں پہلے ذرا سی حرکت ہوئی پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے لپکی تھی۔ اور یہ مامتا کی طاقت تھی جو اس نے ایک ساتھ دونوں بچوں کو اٹھا لیا تھا۔

''ممی! دودو۔'' ہما کی سسکی اس کے دل کے آر پار ہو گئی۔

''میری جان۔'' وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال پا رہی تھی۔ ورنہ دل چاہ رہا تھا۔ دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو ختم کر ڈالے، اتنی معصوم جانوں پر ظلم کر کے وہ معافی کے قابل نہیں رہی تھی۔ خود اپنا ضمیر بری طرح ملامت

کر رہا تھا۔ ایسی سنگدل تو وہ کبھی نہیں تھی۔ محض شیراز احمد کی ضد میں وہ کیا کر بیٹھی تھی۔

دونوں بچوں کو بیڈ پر لٹانے اور ہما کی فیڈر بنا لانے تک وہ ضبط کی جانے کون کون سی منزلیں طے کر آئی تھی۔ اس کے بعد یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ اس کا پورا وجود آنسو بن گیا تھا۔ اتنا تو شاید وہ بیوگی کی چادر اوڑھتے ہوئے بھی نہیں روئی تھی اور نہ احسن سے دوری کے خیال نے اتنا تڑپایا تھا۔

''ممی! ممی!'' سنی اس کے رونے سے پریشان ہو کر اس سے لپٹا جا رہا تھا۔

''بیٹا! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت بری ہوں۔''

وہ حواسوں میں نہیں تھی۔ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ سنی بالکل نہیں سمجھ رہا تھا۔ ہما نے دودھ ختم کرتے ہی رونا شروع کر دیا۔ اور اب وہ بھوک سے نہیں بلکہ اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

''چپ کرو ہما! ممی کو تنگ نہیں کرو۔'' سنی اسے ڈانٹنے لگا، پھر اپنے ننھے منے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

''ممی آپ کے لیے پانی لاؤں۔''

''میری جان!'' اس نے سنی کو اور ساتھ میں ہما کو بھی کھینچ کر اپنی آغوش میں بھر لیا۔

''آپ کیوں رو رہی ہیں ممی۔'' سنی کو چین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بازو میں سے سر نکال کر پوچھنے لگا۔

''اب نہیں روؤں گی۔ کبھی نہیں۔'' اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں پھر باری باری دونوں کی پیشانی چوم کر انہیں خود سے الگ کر کے بٹھایا اور منہ دھونے کے ارادے سے اٹھ گئی۔

پھر دن جیسے بھاگنے لگے تھے۔ شیراز کے کہنے پر اس نے سارا گھر کا سامان ایک کمرے میں منتقل کرنا شروع کر دیا اور لندن آنے سے دو دن پہلے بس وہی ایک کمرہ مقفل کر کے باقی گھر کرائے پر دے کر شیراز اسے اور بچوں کو لے کر آپی کے گھر گئے۔ یوں بھی اس تمام عرصے میں شیراز نے بچوں کو ایک بار بھی اس کے ساتھ امی کے ہاں نہیں جانے دیا تھا۔ اسے جب بھی جانا ہوتا وہ پہلے بچوں کو آپی کے پاس چھوڑتے تھے۔ اس کے پیچھے جانے ان کی کیا سوچ تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی اور کبھی ٹوکا بھی نہیں۔ بہرحال یہ آخری دو دن وہ احسن کے پاس رہنا چاہتی تھی اور اس پر شیراز نے اعتراض بھی نہیں کیا۔ خود ہی اسے چھوڑ گئے تھے۔

''کتنے سال کا اگریمنٹ ہے شیراز کا۔'' بھابی نے پوچھا تو جیسا اسے شیراز نے بتایا تھا اس نے وہی جواب دیا۔

''دو سال۔''

''چلو دو سال تو یوں گزر جائیں گے۔'' بھابی نے اپنی طرف سے اسے اطمینان دلایا۔ لیکن وہ شاکی ہو رہی تھی۔

''درمیان میں سات سمندر حائل ہیں۔''

''اب سات سمندر کوئی اہمیت نہیں رکھتے رباب! سائنس کی ترقی سے مہینوں کی مسافتیں دنوں اور گھنٹوں

میں سٹ گئی ہیں۔'' بھابھی نے کہا۔ تو وہ خاموش ہو رہی۔ یوں بھی بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

پھر رات میں دیر تک محفل جمی رہی۔ اس کی دونوں بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ امی نے خاص طور پر رات کے کھانے پر سب کو بلایا تھا۔ اور باری باری سب نے اسے احسن کی طرف سے اطمینان دلایا، یوں تو اسے اطمینان ہی تھا کہ یہاں سب احسن سے محبت کرنے والے تھے۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ آخر ماں تھی اور آگے دو سال کی دوری اسے مل رہی تھی۔ یہاں کم از کم ہفتے میں ایک دو بار اس سے مل تو لیتی تھی۔ بہرحال رات گئے جب اس کی بہنیں اپنے گھروں کو رخصت ہوگئیں، تب یہ محفل برخاست ہوئی اور اسے احسن کے ساتھ لیٹنے کا موقع ملا۔ لیکن اس وقت تک وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کر اتنا تھک گیا تھا کہ لیٹتے ہی اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔

''اتنی جلدی سو رہے ہو۔'' اس نے احسن کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی۔

''نیند آ رہی ہے مما!'' وہ جمائی لیتا ہوا بولا۔

''مما سے باتیں نہیں کرو گے۔'' وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

''آپ کریں ناں باتیں۔'' وہ زبردستی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔

''آپ کو پتا ہے، میں بہت دور جا رہی ہوں اور جلدی جلدی آپ سے ملنے نہیں آسکوں گی۔''

وہ اس معصوم بچے سے اپنا دکھ کہہ رہی تھی اور پتا بھی نہیں چلا وہ کب نیند کی وادیوں میں اتر گیا تھا۔

اور وہ جب نیند سے جاگی تو شیراز احمد، سنی اور ہما کے سنگ ایک نئی منزل کی جانب پرواز کر رہی تھی۔

اگر وہ...... دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتی تو شاید اپنی زندگی پر خود اسے بھی رشک آتا۔ اب تو ایک خلش سی ساتھ ساتھ تھی۔ گو کہ لندن آ کر وہ بہت مصروف ہوگئی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج، دو بچوں کو سنبھالنا اور سنی کو اسکول لانے لے جانے بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ حقیقتاً اس گھر کی ذمہ داریاں وہ بہت احسن طریقے سے نبھا رہی تھی لیکن اپنے وجود کا جو حصہ وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس کے لیے وہ کسی کسی وقت اتنی بے چین ہوتی کہ دل چاہتا سب چھوڑ کر چلی جائے۔

شیراز کے سامنے وہ قصداً احسن کا ذکر نہیں کرتی تھی کیونکہ یہاں آنے سے پہلے وہ فیصلہ اس پر چھوڑ کر اپنے تئیں سرخرو ہو چکے تھے اور اس شخص سے وہ ساری باتیں کر سکتی تھی ایک صرف یہی بات نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ احسن کے لیے اداس ہے۔

رات اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مسلسل کروٹیں بدل رہی تھی اور یہ کوئی پہلی رات نہیں تھی۔ اکثر اسے یا تو نیند نہیں آتی تھی یا پھر وہ سوتے میں سے چونک کر اٹھ جاتی تھی۔ اس کے بعد اپنی تڑپتی ممتا کو تھپک تھپک کر سلانے میں اسے بہت وقت لگتا تھا اور آج ممتا کو قرار نہیں تھا۔ کتنی دیر کوشش کے بعد بھی وہ اسے سلانے میں ناکام ہوگئی تو بہت احتیاط سے اپنے کمرے سے نکل کر بچوں کے کمرے میں آ گئی۔ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ وہ کچھ دیر

کھڑی باری باری دونوں کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم بیٹھ کر جھپٹنے کے انداز میں سوئے ہوئے سنی کو بازوؤں میں بھر کر اتنی زور سے سینے سے بھینچا کہ وہ نیند میں چیخ پڑا۔

''ممی!''

''ہاں بیٹا! میں ہوں تمہارے پاس۔ دیکھو، میں تم سے دور نہیں گئی، کبھی نہیں جاؤں گی، تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

وہ چھلکتے آنسوؤں سے بے خبر جانے کیا کیا بول رہی تھی۔

''ممی!'' اس کے بازوؤں کے تنگ حلقے میں سنی کا دم گھٹنے لگا۔ ''مجھے پیاس لگی ہے۔''

''میری پیاس تو بجھنے دو بیٹا۔'' وہ اس کے بالوں پر پیشانی ٹکا کر بولی۔

''میں آپ کے لیے پانی لاؤں۔'' سنی کو اس کے بازوؤں سے نکلنے کا بہانا چاہیے تھا۔ ''آپ کو پیاس لگی ہے ناں۔''

''پانی نہیں بیٹا۔ یہ پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔''

''میں پاپا کو بتاتا ہوں، ممی رو رہی ہیں۔'' سنی کو اپنے بالوں میں اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس ہونے لگی۔

''نہیں۔'' وہ ایک دم سنی کو بازوؤں سے آزاد کر کے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ ''پاپا سو رہے ہیں۔ انہیں نہیں اٹھانا، آپ بھی سو جاؤ۔''

''آپ رو رہی ہیں۔''

''نہیں۔ کہاں رو رہی ہوں دیکھو۔''

آنسوؤں سے دھلے چہرے پر اس نے مسکراہٹ سجائی اور حیران سنی کو زبردستی لٹا کر تھپکنے لگی، بچہ نیند میں سے اٹھا تھا جلدی ہی سو گیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ہما بھی اسکول جانے لگی تو اس کا کچھ وقت فراغت میں کٹنے لگا۔ شیراز وہی صبح کے گئے شام میں آتے تھے البتہ ہر ویک اینڈ پر کہیں نہ کہیں گھمانے ضرور لے جاتے تھے۔ باقی روزمرہ کے گھر کے علاوہ باہر کے کام بھی وہ خود کر لیتی تھی، یعنی سبزی، گوشت اور ضرورت کی دوسری اشیاء لانا اس کے سامنے والے اپارٹمنٹ اور تھرڈ فلور پر بھی پاکستانی فیملیز تھیں۔ مسز خان اور مسز قریشی دونوں کے ساتھ اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی اور تینوں جب مل بیٹھتیں تو ان کی باتوں میں زیادہ ذکر گھر والوں کا ہوتا۔

یوں بھی دیار غیر میں اپنا دیس اور گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ جسے شدت سے یاد کرتی تھی اس کا ذکر گول کر جاتی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے سنی اور ہما کی سوتیلی ماں سمجھے حالانکہ ان بچوں کو جس طرح اس نے اپنایا تھا، اس پر کبھی کبھی خود شیراز کو بھی شبہ ہونے لگتا تھا کہ وہ ان کی اپنی ماں ہے۔ اس کے باوجود وہ بہت محتاط تھی کیونکہ جانتی تھی کہ ماں کے ساتھ جب سوتیلی کا لفظ آ جائے تو پھر سب کچھ الٹ ہو جاتا ہے۔ محبت میں بھی نفرت کے پہلو کھوجے جاتے ہیں اور وہ لوگوں کی باتوں سے دلبرداشتہ ہو کر ان معصوم بچوں کو اپنی بے غرض و بے

لوث محبت اور مامتا سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس وقت وہ کھانا پکانے سے جلدی فارغ ہو کر مسز خان کے پاس جانے کا سوچ رہی تھی کہ آفس سے شیراز کا فون آ گیا انہوں نے بتایا کہ واپسی میں ان کے ساتھ ایک مہمان بھی ہو گا، لہٰذا رات کے کھانا پر کچھ اہتمام کر لیا جائے۔

وہ مسز خان کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اسی وقت کچن میں آ گئی، کیونکہ پھر بچوں کے اسکول سے آ جانے کے بعد وہ اطمینان سے کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ ایک پیر کچن میں تو ایک پیر اندر ہوتا تھا۔ اس لیے اس نے کبابوں کے لیے قیمہ اسی وقت تیار کر لیا اور سویٹ ڈش میں فروٹ کسٹرڈ بنا کر فریج میں رکھ دیا۔ اس کے بعد جا کر بچوں کو اسکول سے لے آئی تو پہلے ان کے ساتھ کھانا کھایا پھر کچھ دیر آرام کی غرض سے دونوں کو ساتھ لے کر لیٹ گئی۔ سنی اب بہت شرارتی ہو گیا تھا اور خصوصاً ہما کو چھیڑ کر مزا لیتا۔ کسی کسی وقت اسے بھی عاجز کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سونے کے موڈ میں نہیں تھا جب ہی بار بار ہما کو چٹکی کاٹ رہا تھا۔

''دیکھو احسن! اب میں تمہیں ماربیٹھوں گی۔'' ہما کی شکایت پر اس نے قدرے غصے سے ڈانٹا تو وہ ہنسنے لگا۔

''احسن نہیں ممی! میرا نام سنی ہے۔''

''مجھے پتا ہے۔'' وہ اپنی بے اختیاری پر جز بز ہو کر بولی اور سنی ابھی اتنا سمجھدار نہیں ہوا تھا جو پوچھتا کہ پھر اس نے احسن کیوں کہا اس کے برعکس اسی طرح ہنستا ہوا اس کی نقل اتارنے لگا۔

''احسن! میں تمہیں ماربیٹھوں گی۔''

''احسن کے بچے چلو سوؤ۔''

''نہیں ممی! میں کارٹون دیکھوں گا۔''

''اچھا! پہلے ہما کو سونے دو، پھر میں ٹی وی آن کروں گی ورنہ نہیں۔'' اس کی دھمکی کام کر گئی۔ سنی چپ چاپ بیٹھ گیا، تب ہما کو سلا کر وہ اسے لاؤنج میں لے آئی اور ٹی وی آن کر کے خود بھی وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔

پھر شیراز کے آنے سے پہلے ہی اس نے کھانا تیار کر لیا اور سنی کو بھی سمجھا دیا کہ مہمان کے سامنے کوئی بدتمیزی نہیں ہو گی نہ ہی وہ ہما کو چھیڑے گا، اور ابھی اس کی ہدایات جاری تھیں کہ شیراز اپنے مہمان کے ساتھ آ گئے۔

''یہ عمران ہے، میرے اسکول، کالج کا ساتھی۔'' شیراز اس کا تعارف کراتے ہوئے بولے۔ ''گزشتہ چار سالوں سے یہاں ہے اور مجھے معلوم تو تھا لیکن اس کا ایڈریس نہیں تھا میرے پاس، بس آج اچانک ملاقات ہو گئی اور عمران! یہ تم اس طرح حیران ہو کر کیا دیکھ رہے ہو، بھئی یہ میری مسز ہیں۔ سلام کرو انہیں۔''

''او، ہاں السلام علیکم!'' اس نے چونکنے کے بعد سلام کیا پھر اپنی حیرت کا جواز پیش کیا۔ ''سارا دن مسز کا ذکر نہیں کیا تم نے، اس لیے انہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔''

''کیوں تمہارے سامنے تو فون کیا تھا میں نے۔'' شیراز نے ٹوکا تو وہ صاف مکر گیا۔

''میرے سامنے نہیں تو۔''

''اچھا خیر، بچوں سے ملو۔ اب وہ حیران ہو کر دیکھ رہے ہیں کہ یہ کون سی مخلوق آ گئی ہے۔'' شیراز نے اس کی توجہ بچوں کی طرف دلائی تو وہ ایک دم سنی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھتا ہوا بولا۔

''آہا سنی! ماشاء اللہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔'' اس نے چونک کر دیکھا اور فوراً اس کی حیرت سمجھ میں آ گئی کہ جو سنی کو جانتا ہے، وہ اس کی ماں سے بھی واقف ہو گا۔ تب وہ ان سب کو وہیں چھوڑ کر کچن میں آ گئی محض اس خیال سے کہ شیراز اس کی الجھن دور کر دیں گے۔ لیکن وہ بھی اس کے پیچھے آ گئے تھے۔

''کھانا تیار ہے۔''

''جی!''

''بس تو فوراً لگا دو۔''

''وہیں ٹیبل پر موجود ہے سب، آپ منہ ہاتھ دھو کر آ جائیں۔'' وہ کہتی ہوئی فریج کھول کر کسٹرڈ نکالنے لگی۔

پھر کھانے کے دوران عمران بتانے لگا کہ اس کی فیملی پاکستان میں ہے اور یہ کہ وہ دو بار ویزا بھیج چکا ہے لیکن اس کی بیوی یہاں آنے کو تیار نہیں ہے۔

''کیوں!'' شیراز نے قدرے تعجب سے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''ایک تو وہ اپنے عزیزوں سے دور نہیں آنا چاہتی۔ دوسرے اس کا کہنا ہے کہ بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ اصل میں وہ خاصی مذہبی خاتون ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' اس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ''اور ان کا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ یہاں کا ماحول بچوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

''آخر اور لوگ بھی تو رہتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں بچوں کو ماحول سے زیادہ والدین کی تربیت بناتی ہے۔''

''دونوں۔'' وہ فوراً بولی۔ ''اب یہ دیکھیں میری ذمہ داری اس گھر کے اندر تک ہے اور بچے جیسے جیسے بڑے ہوں گے، باہر کے ماحول کا اثر ضرور قبول کریں گے خیر شیراز کا ایگریمنٹ تو دو سال کا ہے۔ اس لیے مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔''

''بس دو سال۔'' عمران نے شیراز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو انہوں نے ذرا سا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اس کا مطلب ہے، مجھے اپنی بیوی سے شاکی نہیں ہونا چاہئے۔''

''نہیں، کتنے بچے ہیں آپ کے!'' اس نے ہما کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی طرح دو اور یہ میں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں، آپ دونوں بچوں کو کھانا کھلا رہی ہیں، خود کب کھائیں گی؟''

''ماں کا آدھا پیٹ تو بچوں کو کھلا کر بھر جاتا ہے، اس کے بعد اگر دل چاہا تو کھا لوں گی۔''

وہ مسکرا کر بولی اور کسٹرڈ کا پیالہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''آپ یہ لیں ناں۔''

"شکریہ۔" وہ کچھ حیران ہو رہا تھا اور بار بار اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس نے دونوں بچوں کو کسٹرڈ بھی اپنے ہاتھ سے کھلایا پھر وہاں سے اٹھاتی ہوئی بولی۔

"چلو بیٹا! اب آپ اپنا ہوم ورک کرو۔ میں کچھ دیر میں آتی ہوں اور ہاں سنی! آپ بہن کو تنگ نہیں کرنا۔"

"پھر آپ کہانی سنائیں گی ناں۔" سنی کی شرط تیار تھی۔

"آپ ہوم ورک کرلو گے تب، چلو جاؤ شاباش۔" وہ دونوں کو بھیج کر ان سے پوچھنے لگی۔ "آپ چائے پئیں گے۔"

"ضرور پئیں گے۔" وہ فوراً بولا پھر شیراز کے ساتھ اُٹھ کر لاؤنج میں چلا گیا۔ تو اس نے پہلے ٹیبل صاف کی پھر کچن میں آ کر چائے بنانے لگی اور خود اس نے کیونکہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اپنے لیے چائے بھی نہیں بنائی کہ بچوں کو سلانے کے بعد آ کر بھوک لگی تو وہ پہلے کھانا کھائے گی اس کے بعد چائے کا موڈ ہوا تو وہ بھی پی لے گی۔ لہٰذا دو مگ بنا کر اس نے ٹرے میں رکھے اور لاؤنج میں آئی تو شیراز کہنے لگے۔

"دیکھو، ہما پکار رہی ہے۔"

"جی جا رہی ہوں۔" وہ ٹرے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر بچوں کے کمرے میں آ رہی تھی کہ اس کی سماعتوں سے عمران کا سوال ٹکرایا تھا۔

"یار! وہ سنی کی ممی کہاں گئیں؟" اور وہ بلا ارادہ نہیں بلکہ قصداً شیراز کا جواب سننے کے لئے پردے کی اوٹ میں رک گئی۔

"ہما کی پیدائش پر ان کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔" عمران نے صرف سنی کا نام لیا تھا اور شیراز نے ہما کا نام لے کر گویا اسے بتایا کہ دونوں بچے اس پہلی عورت کے ہیں۔

"اوہ ویری سیڈ!" عمران نے پہلے افسوس کا اظہار کیا پھر کہنے لگا۔ "ویسے یار! لکی ہو تم کہ دوبارہ بیوی کے ساتھ بچوں کے لیے اچھی ماں بھی مل گئی۔ میں اگر پہلے تمہاری مسز سے نہ مل چکا ہوتا تو گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ یہ ان بچوں کی ماں نہیں ہیں۔"

"کوئی بھی گمان نہیں کر سکتا۔" شیراز کے فاتحانہ لہجے نے اس کے قدم دوبارہ روک لیے تھے۔ "میں نے انتخاب ہی ایسی عورت کا کیا جو پہلے سے ماں تھی اور اسے میرے بچوں کی ماں بننے میں دیر نہیں لگی۔"

"کیا مطلب؟ کیا بھابھی پہلے سے۔"

"ہاں ایک وجہ بھی ہے اور تم جانتے ہو بلکہ شاید کبھی ایسی عورت کو دیکھا ہو جس کا بچہ دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہو۔ اس عورت کی ممتا کا یہ عالم ہوتا ہے کہ پھر وہ ہر بچے پر اپنے بچے کا گمان کر کے دیوانہ وار لپکتی ہے اور بچے کو سینے میں بھینچ کر اپنی ممتا کو تسکین پہنچاتی ہے۔"

شیراز کا انداز ہنوز تھا اور عمران غالباً حیران ہو رہا تھا جبکہ ادھر سناٹے میں آ گئی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے، بھابھی کا بچہ کہیں کھو گیا ہے۔" عمران کی آواز کہیں دور سے آتی لگی تھی۔

"نہیں نہیں، کھویا نہیں ہے بلکہ میں نے اسے قبول نہیں کیا اور کھو جائے یا نظروں سے اوجھل رہے ایک ہی ہے، اس سے دوری نے ہی تو رباب کو اول روز میرے بچوں کو آغوش میں بھرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ کہاں ایسا ن ہے، عورتیں لاکھ دعوا کریں بنتی وہی سوتیلی ما ہیں۔"

"میرے خدا!" اس کے اندر گھمسان کا رن پڑا تھا۔ آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں۔

"تمہاری حکمت عملی کامیاب سہی لیکن کیا یہ اس عورت کے ساتھ ظلم نہیں ہے۔"

عمران کے متاسفانہ لہجے کا نوٹس لیے بغیر شیراز بڑے آرام سے بولے۔

"اور جو میرے بچوں کے ساتھ ہوتا، اسے تم کیا کہتے۔"

"ضروری تو نہیں۔"

"یہی حقیقت ہے میری جان۔" شیراز فوراً اسے ٹوک کر بولے۔ "اپنا بچہ سامنے ہو، قریب ہو تو پھر دوسرے ں کے لیے بس تھوڑی سی گنجائش ممکن ہے۔ اسی لیے میں نے مزید برتھ پر بھی کنٹرول کر لیا تا کہ سنی اور ہما کسی ام پر نظر انداز نہ ہوں۔

اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی ظلم کیا ہے۔ ظلم تو تب ہوتا کہ میں رباب کے بچے کو قبول کرتا پھر اس کے تھ برا سلوک کر کے اسے نکال دیتا۔ اس کے برعکس میں نے شادی کا پیغام بھیجنے کے ساتھ ہی واضح الفاظ کہلوا دیا تھا کہ اس کے بچے کی میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد کوئی جبر، کوئی زبردستی نہیں تھی کہ وہ ر و میری شرط مان لیں۔ ان کی مرضی انہوں نے مان لی اور اگر نہیں مانتے تو مجھے کوئی اور رباب مل جاتی۔"

آخر میں شیراز کی ذرا سی ہنسی نے سارے میں آگ لگا دی تھی۔ یہاں وہاں ہر طرف شعلے ہی شعلے تھے۔ اس ے سہارے کے لیے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائی تو وہ کھل گیا اور وہ گرتے گرتے بچی۔

"ممی!" سنی نے لکھنا چھوڑ کر اسے دیکھا لیکن وہ ان سنی کرتی واش روم میں آ گئی اور واش بیسن کا نل پورا ول کر ٹھنڈے یخ پانی سے منہ اور خصوصاً آنکھوں پر چھینٹے مارنے لگی، لیکن یہ آگ اندر لگی تھی جس پر ٹھنڈے پانی کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ تب نل بند کر کے وہ کمرے کے بیچوں بیچ آن کھڑی ہوئی اور بلا ارادہ دونوں ں کو گھورنے لگی۔ جن کا باپ اپنی حکمت عملی کی کامیابی پر نازاں ہو کر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ اس سے کوئی نصافی یا ظلم سرزد ہوا ہے۔

"اور میں بھی تم پر ظاہر نہیں کروں گی شیراز احمد کہ تمہاری اجلی اجلی شخصیت کے اندر چھپے شاطر اور مکار شخص کو دیکھ چکی ہوں۔"

وہ لمحوں میں فیصلہ کر کے بچوں کے پاس آ بیٹھی۔ کیونکہ اس شخص کی ضد میں وہ ایک بار پہلے ان کے ساتھ وتی کر گئی تھی اور دوبارہ ایسا کوئی عمل اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ اس کے دل میں شیراز احمد جیسی سختی نہیں تھی نہ ہی وہ نورین کی طرح اتنی باہمت یا دوسرے لفظوں میں خودسر تھی کہ کھڑے کھڑے سب کو ٹھوکر مار کر چلی ی۔ اس گھر میں اس کا تھا ہی کیا۔ شیراز نے یہاں تک تو کہہ دیا تھا کہ انہیں کوئی اور رباب مل جاتی۔ گویا ان

کے لیے ربابوں کی کمی نہیں تھی کس قدر بے مایہ ہوگئی تھی وہ خود اپنی نظروں میں بھی۔

پھر کتنے دن اس نے بظاہر خاموشی میں گزارے، لیکن اس کے اندر مسلسل توڑ پھوڑ کا عمل جاری رہا، البتہ بچوں پر اسی طرح مہربان تھی اور اس میں ہرگز بھی بناوٹ نہیں تھی بلکہ حقیقتاً وہ دل کے ہاتھوں مجبور بھی تھی۔

"ان معصوموں کا کیا قصور، یہ تو مجھے ہی اپنی ماں سمجھتے ہیں اور خدا کی قسم میرے لیے بھی یہ احسن سے کم نہیں ہیں۔"

اس نے اپنے دل کو ٹٹولنے کے بعد خود کو باور کر دیا تھا۔ "میں کبھی کسی موڑ پر انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ یہ میرے بچے ہیں۔ میرے اپنے۔"

اور ان بچوں کی ماں اتنا حق تو رکھتی تھی کہ شیراز احمد سے اپنے لیے کچھ اور مانگ سکے۔ اتنے دنوں کی خاموشی کے بعد اس رات اس نے شیراز احمد کے اندر کی پرسکون ندی میں بڑی خوب صورتی سے ایک کنکر اچھال دیا تھا۔

"شیراز! ہما بھی ماشاءاللہ اسکول جانے لگی ہے۔ اب ہمارے آنگن میں ایک اور پھول کھلنا چاہیے۔"

شیراز نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً سنبھل بھی نہیں سکے۔

"میں سوچ رہی ہوں، اپنا چیک اپ کرا لوں، ہوسکتا ہے کوئی پرابلم ہوگئی ہو۔" اس نے کن انکھیوں سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تو وہ بس ہوں کی آواز نکال سکے جس پر وہ فوراً بولی۔

"کل ہی چلیں گے۔"

"نہیں۔" وہ نظریں چرا گئے۔ "مجھے زیادہ بچے پسند نہیں ہیں، بس دو کافی ہیں۔"

"دو سے تین، کوئی بہت زیادہ تو نہیں ہو جائیں گے۔" وہ سنبھل کر بول رہی تھی کیونکہ جان گئی تھی کہ وہ ان کی من چاہی بیوی نہیں ہے ورنہ اٹھلا کر ضد کرتی۔

"اچھا دیکھیں گے۔"

ان کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔ پھر فوراً اس کی طرف سے کروٹ بدل گئے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جس میں طنز، تاسف، استہزا سبھی کچھ تھا کہ اب کم از کم یہ شخص روزانہ کی طرح بہت اطمینان سے نہیں سو سکتا تھا اور وہ اسے سونے بھی نہیں دے گی، ہر رات کی ابتدا پر یونہی اسے چھیڑے گی جب تک وہ اس کے سامنے اعتراف نہ کر لے کہ برتھ کنٹرول کے بعد وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے والا اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے کتنا نادم ہوتا ہے۔

اور شیراز احمد نادم نہیں ہوئے۔ اس کی روزانہ کی تکرار سے چڑ کر اس رات وہ الٹا اس پر برہم ہونے لگے۔

"تم عورتوں کو بچے پیدا کرنے کا شوق ہوتا ہے کیا یا اس بہانے مرد کو مجبور اور لاچار بنانا چاہتی ہو۔ معاف کرنا بابا بیگم! میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا، اب نہ آئندہ کبھی۔"

"کیوں، ایسی کوئی انہونی خواہش تو نہیں ہے میری۔"

"انہونی ہی ہے میرے لیے کیونکہ میں۔ میرا مطلب ہے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد میں نے۔"

وہ ابھی بھی بات پوری نہیں کر سکے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جو اس شخص کو نادم دیکھنا چاہتی تھی وہ اس کی ایک لمحہ کی بے بسی بھی نہیں دیکھ سکی اور سر جھکا کر اندر ہی اندر خود کو ملامت کرنے لگی کہ وہ بہرحال اس کا شوہر ہے۔ اپنے اور اپنے بچوں کی مفاد کی خاطر اس نے جو مناسب سمجھا کیا۔ اسے بھی تو کوئی کمی نہیں دی۔ ایک مقام دیا اور سب بڑی ابھاگن سے سہاگن کیا۔

"آئی ایم سوری شیراز! آپ کو پہلے بتانا چاہیے تھا، میں ناحق آپ کو پریشان کرتی رہی۔"

وہ اپنے رویے پر نادم ہو کر بولی تو شیراز کن انکھیوں سے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھنے لگے، پھر آہستہ سے ا کا ہاتھ تھپک کر رہ گئے تھے۔

شیراز احمد کی حکمت عملی میں غالباً یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ اسے ہمیشہ اس کے بچے سے دور رکھیں گے، جب پاکستان سے آتے ہوئے انہوں نے لندن میں دو سال قیام کا کہا تھا لیکن پورے بیس برس بیت گئے تھے۔ بچے جوان ہوگئے اور ابھی بھی ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ستم تو یہ کہ اتنے برسوں میں ایک بار بھی وہ نہ خود ستان گئے نہ اسے جانے دیا تھا۔ منع بھی نہیں کرتے تھے بس یوں کہتے۔

"ہاں بس اس بار بچوں کی چھٹیوں میں پاکستان چلیں گے۔" اور چھٹیوں میں کہیں اور کا پروگرام بنا لیتے، نیڈا، جرمنی، امریکہ، فرانس جانے کہاں کہاں۔

"جب تک ہم یہاں ہیں، آرام سے دنیا گھوم سکتے ہیں۔ پاکستان جانے کے بعد کہاں موقع ملے گا اور پھر ر جانا تو وہیں ہے۔" ہر بار وہ ایسی ہی باتیں کرتے تھے اور وہ جو بڑے شوق سے امی ابو کو لکھتی تھی کہ اس بار وہ ہران سے ملنے آئے گی۔ وہ سخت مایوس ہو جاتی اور کیونکہ شیراز کی حکمت عملی جان چکی تھی اس لیے ان کی سوچ سے دکھ ہوتا تھا۔ وہ جو اسے احسن سے دور رکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اسے دل سے بھی نکال پھینکے گی تو یہ تو ت تک ممکن نہیں تھا بلکہ روز محشر بھی وہ اس کے نام سے پکارا جائے گا۔ جانے اس حقیقت کو شیراز احمد جھٹلانے یوں تلے ہوئے تھے۔

بہرحال یہ اتنے طویل برس جس طرح اس نے گزارے تھے یہ وہی جانتی تھی گو کہ بظاہر زندگی میں کوئی کمی، ئی دکھ نہیں تھا۔ سنی اور ہما کے شاید فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ عورت ان کی جنم دینے والی ماں نہیں ہے۔ باہر نے کا ایک ہی فائدہ ہوا تھا کہ یہاں ان بچوں کو بہکانے والا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ ورنہ اب تک یہ ضرور جان ہوتے اور ان بچوں کی اتنی محبتوں کے باوجود اسے ہر پل احسن کی کمی محسوس ہوتی رہی تھی گو کہ امی، بھابی اور ن کے خطوط سے اسے احسن کی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں سے آگاہی ملتی تھی۔ پھر بھی وہ ماں تھی۔ اس کا دل تا تھا کہ اپنے بچے کی کامیابی پر اسے سینے سے لگائے پھر اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دے اور وہ نہیں تھا تو اکثر ایسے موقعوں پر وہ بے اختیار سنی کی پیشانی چوم کر کہتی تھی۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ ایسی ہی شاندار کامیابیاں عطا کرے۔"

"ہائیں!" سنی حیران ہو جاتا تھا، "یہ میری کون سی شاندار کامیابی کا ذکر کر رہی ہیں!"

"ممی اکثر ایسے خواب دیکھتے ہیں سنی!" ہما درمیان میں آ جاتی تھی۔ "جلدی بتائیں ممی، رات آپ کے خواب میں سنی نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا۔"

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ دیکھنا ایک دن میرا سنی بہت بڑا آدمی بنے گا۔"

احسن کا نام ابھی زبان تک نہیں آتا تھا کہ وہ سنبھل جاتی تھی اس کے باوجود وہ کبھی کبھی سنی کو بے اختیار احسن کہہ کر مخاطب کر جاتی تھی اور اس کے ٹوکنے پر کبھی انجان بن جاتی یا پھر ایک ہی جواز اس نے سوچ رکھا تھا۔

"احسن کا مطلب ہے۔ بہت اچھا، بہت نیک اور جب میرے دل میں تمہیں بہت اچھا، بہت نیک دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے تو میں تمہیں احسن پکارتی ہوں۔"

"کیوں ممی! یہ خواہش کبھی کبھی کیوں؟ کیا آپ مجھے ہمیشہ اچھا اور نیک نہیں دیکھنا چاہتیں۔"

سنی کے سوال پر لاجواب ہو کر وہ قدرے سٹپٹا جاتی۔

"تم ہمیشہ سے بہت اچھے، بہت نیک ہو۔" اور یہی سچ تھا کہ یہ دونوں بچے اس کے بہت فرماں بردار تھے۔ باپ سے زیادہ اس سے محبت کرتے تھے اور یہ اس کی بے غرض و بے لوث چاہت اور تربیت کا صلہ تھا کہ وہ ننھے منے پودے آج تناور درخت بن کر اسے ٹھنڈی کیف آگیں چھایا کا احساس بخش رہے تھے۔

سنی کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور شیراز چاہتے تھے کہ وہ یہیں جاب کرے۔ لیکن اس نے منع کر دیا، صرف اپنی ماں کی وجہ سے کہ گزشتہ چار پانچ سالوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی ماں پاکستان جانے کی شدید خواہش رکھتی ہے لیکن اس کے ڈیڈی ٹال جاتے ہیں اور تب سے ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنی تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ لندن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے گا اور اب وہ اسی بات پر شیراز سے بحث کر رہا تھا۔

"پاکستان میں تمہیں اچھی جاب نہیں ملے گی۔"

"میرا مسئلہ جاب نہیں ہے ڈیڈی! آپ نے اتنے برسوں میں جو کمایا، اس سے ہم پاکستان میں اپنا بزنس کریں گے۔" شیراز نے جس مسئلے سے اسے خائف کرنا چاہا، اس نے سرے سے اسے اہمیت ہی نہیں دی۔

"تم وہاں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتے۔"

"ہم وہیں ایڈجسٹ ہوں گے کیونکہ ہماری شناخت، ہماری پہچان وہی پاکستان ہے۔ یہاں اتنے برس گزار کر بھی ہم وہی اجنبی کے اجنبی رہے۔ آئی ایم سوری ڈیڈی! میں مزید اس اجنبی دیس میں ٹھہرنے کے حق میں نہیں ہوں اور آپ کو بھی اپنا سب کچھ سمیٹ کر واپس چلنا ہوگا۔"

اس کے حتمی انداز پر شیراز تلملا گئے۔

"یہ پٹی تمہیں تمہاری ماں نے پڑھائی ہوگی۔"

"ممی اگر کہتیں تو مجھے آپ سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان کی بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

اس کے مضبوط لہجے پر شیراز ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگے، تو قدرے توقف سے وہ اپنے لہجے پر قابو پا کر کہنے لگا۔

"میں آپ کی بات بھی نہیں ٹال سکتا ڈیڈی! لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔ یہاں ہمارا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ آپ میرا نہیں تو ہما کا خیال کریں۔ شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور یہاں اس کی شادی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

اس کی آخری بات پر شیراز احمد سوچ میں پڑ گئے اور کچھ دیر بعد اس کا کندھا تھپک کر بولے تھے۔

"او کے بیٹا! اپنی ممی سے کہہ دو، پاکستان چلنے کی تیاری کریں۔" اور جب اس نے سنا تو کتنی دیر تک اسے یقین ہی نہیں آیا کہ شیراز احمد واقعی پاکستان جانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور یقین آیا تو فوراً جذبات میں سنی کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بولی تھی۔

"کتنے بڑے ہو گئے تم، ماشاء اللہ۔"

"ارے ممی! آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے اتنے برسوں بعد مجھے دیکھا ہو۔" سنی اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے تھام کر بولا۔

"ہاں بیس پورے بیس برس۔"

وہ اپنے آپ میں نہیں تھی اور اس سے پہلے کہ سنی حیران ہوتا شیراز نے اسے پکار لیا تھا۔

پھر شیراز نے سب سے پہلے پاکستان اپنی آپی کو فون کر کے اپنی آمد کا بتانے کے ساتھ انہیں اپنا گھر خالی کروانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی تاکہ جاتے ہی انہیں رہائش کی پرابلم نہ ہو۔ اس کے بعد جلدی جلدی کرتے بھی دو مہینے لگ گئے۔ کیونکہ سارا اثاثہ سمیٹنا تھا۔ بہرحال یہ وقت بھی گزر گیا اور اپنی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس کی نظریں بے قراری سے لوگوں کے ہجوم میں بھٹکنے لگی تھیں۔

پہلے مرحلے پر شیراز کی آپی، ان کے میاں اور بچوں سے سامنا ہوا تو ان سب سے مل کر وہ فوراً بھابھی اور بھیا کی طرف بڑھ گئی پھر بہنیں اور ایک ایک کے گلے لگتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا۔

"احسن کہاں ہے۔"

"وہ لاہور میں ہوتا ہے۔ ہم نے اسے تمہاری آمد کی اطلاع نہیں دی۔" آخر میں اس کی بہن شہناز نے سرگوشی میں بتایا تو وہ ایک دم اس سے الگ ہو گئی۔

"کیوں، کیوں اطلاع نہیں دی۔"

"بعد میں بتاؤں گی، ابھی خاموش رہو، دیکھو تمہارے بچے ادھر آ رہے ہیں۔" [illegible] ارکر کہا وہ فوراً سنبھل کر سنی اور ہما کو دیکھنے لگی۔ پھر باری باری سب سے ان کا تعارف کرایا او [illegible] لیے ہی خیال تھا جب ہی بڑی گرم جوشی سے سب سے ملے۔

شیراز کا ارادہ سیدھا گھر جانے کا تھا لیکن آپی بہت اصرار سے ان سب [illegible] اپنے ساتھ لے [illegible] ور

بھابھی سے اس نے اگلے دن آنے کا کہہ دیا تھا۔

اور حقیقتاً طویل مسافتوں نے اسے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنی وہ منزل پر آ کر نڈھال ہوئی تھی۔ حالانکہ آپی کے گھر میں جشن کا ساسماں ہو گیا تھا۔ ہما اپنی دونوں پھوپھو زاد بہنوں کے ساتھ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ سنی کو فواد مل گیا تھا۔ شیراز اپنے بہنوئی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے اور آپی بھی اس سے زیادہ اپنے بھائی کی طرف متوجہ تھیں۔ یوں بھی وہ چپ چاپ گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کی حالت واقعی اس ماں جیسی ہو رہی تھی جس کا بچہ دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہو۔

''احسن کو میرے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟'' اس کے اندر مسلسل یہ تکرار ہو رہی تھی اور کیونکہ شہناز نے جواب نہیں دیا تھا اس لیے وہ خود ہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں احسن اس سے ناراض تو نہیں ہے اور شاید اس سے ملنا ہی نہ چاہتا ہو۔ پتا نہیں کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں کہ میں کیسی ماں ہوں جو۔

''اف......'' اس نے جھرجھری لے کر شیراز احمد کو دیکھا پھر صوفے کی بیک پر سر رکھا تھا کہ سنی اس کے پاس بھاگا آیا۔

''ممی! آپ تھک گئی ہیں شاید، چلیں گھر چلتے ہیں۔''

''ہاں!'' وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی ''اپنے ڈیڈی سے کہو۔''

''ڈیڈی کا تو مجھے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں لگتا۔ دیکھ لیں یہاں آنے کو تیار بھی نہیں تھے اور خوش بھی کتنے ہیں۔'' سنی نے شیراز کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اچانک متوجہ ہو گئے۔

''کیا بات ہے بیٹا!''

''وہ میں گھر چلنے کو کہہ رہا ہوں چلیں نا۔''

''ارے میاں کھانا تیار ہے، تم جانے کی بات کر رہے ہو۔'' آپی کہتی ہوئی فوراً کھانا لگوانے کی غرض سے کھڑی ہو گئیں تو وہ بھی ان کے ساتھ اُٹھ گئی۔

پھر کھانے کے بعد چائے کا دور بھی خاصا طویل تھا یوں گھر آتے آتے بارہ بج گئے تھے اور اگلے دن صبح ہی وہ امی ابو کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئی تو ہمیشہ کی طرح شیراز نے منع نہیں کیا بلکہ خود بھی اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئے۔ البتہ سنی اور ہما کو انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ کیونکہ پھر وہ بھی نانا، نانی کے پاس جانے کا اصرار کرتے اور اب پتا نہیں وہ حقائق چھپانے کے لیے بچوں سے کب تک غلط بیانی کرتے رہیں گے۔

وہ تمام راستہ یہی سوچتی رہی لیکن انہیں ٹوکا نہیں محض اس خیال سے کہ اپنی کامیاب حکمت عملی میں انہوں نے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا، ضرور پہلے سے کچھ سوچ رکھا ہوگا بہرحال ایک طویل عرصے بعد امی ابو سے مل کر اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک گئیں۔ کتنے بوڑھے ہو گئے تھے اس کے ماں باپ اور انسان خواہ کتنا بڑا ہو جائے، ماں باپ کے سامنے ہمیشہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتا ہے وہ بھی جیسے ایک ننھی منی بچی تھی۔ جب شیراز ابو اور بھیا کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تب دوسرے کمرے میں وہ امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔

''بہت تھک گئی ہو امی! اور یہاں آ کر تو میری تھکن اور بڑھ گئی ہے۔ آپ نے احسن کو کیوں نہیں بلایا۔ اسے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں میری۔''

''میری آنکھیں بھی یونہی ترستی رہی ہیں تمہارے لیے۔'' امی نے اپنی کمزور انگلیوں پر اس کی پلکوں کی نمی سمیٹتے ہوئے کہا تو اس نے بے تابی سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''پھر تو آپ کو احساس ہونا چاہیے تھا۔''

''احساس کیوں نہیں ہے بس وہ۔'' امی کے ہچکچانے پر وہ اور بے قرار ہو گئی۔

''کیا وہ، بتایئے ناں......کیا احسن ناراض ہے؟ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا؟''

''نہیں نہیں بیٹا! ایسی بات نہیں ہے۔''

''پھر پھر؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تو امی نے بھابھی کو پکار لیا اور ان کے آنے پر کہنے لگیں۔

''دلہن! وہ شیراز کا خط دکھاؤ رباب کو۔'' بھابھی وہیں سے پلٹ گئیں اور کچھ ہی دیر میں ایک لفافہ لا کر اسے تھما دیا تو اس نے نہ سمجھتے ہوئے پہلے لفافہ کو الٹ پلٹ کر پھر امی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''شیراز کا خط ہے، تمہارے آنے سے کوئی ہفتہ دس دن پہلے آیا تھا۔ تم پڑھ لو۔''

امی نے کہا تو اس نے ایسے ہی الجھتے ہوئے خط نکال کر سامنے کر لیا۔ مخاطب ابو تھے اور ابتدائی رسمی کلمات کے بعد انہوں نے اس کی بہت تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''مجھے ان برسوں میں کبھی کسی مقام پر رباب کو ٹوکنا نہیں پڑا۔ بہت عظیم عورت ہے وہ جس نے میری اولاد کو سگی ماں سے بڑھ کر محبت دی۔ شاید آپ کو حیرت ہو کہ سنی اور ہما کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ انہیں جنم دینے والی ماں کوئی اور تھی۔ ہم میں سے کسی نے انہیں نہیں بتایا اور میں چاہتا ہوں، آئندہ بھی انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے ورنہ ان کے دل میں رباب کا موجودہ مقام برقرار نہیں رہے گا اور اپنی اتنی قربانیوں کے عوض بچوں کی طرف سے ذرا سی لاپروائی یا بے رخی رباب کے لیے انتہائی دکھ اور تکلیف کا باعث ہوگی۔ جبکہ میں اپنی بیوی کو ایسے کسی دکھ سے ہمکنار نہیں کرنا چاہتا۔ یقیناً آپ بھی نہیں چاہیں گے، اس لیے بس اتنی مہربانی کیجئے کہ احسن کو میرے بچوں کے سامنے رباب سے ملنے سے روک دیجئے۔ ورنہ جواب تک راز ہے وہ ماں بیٹے کے ملن سے ایک پل میں آشکارا ہو کر رباب کی ساری قربانیاں خاک میں ملا دے گا۔''

آگے پھر اس کی تعریف اور عظمتوں کا اعتراف تھا لیکن اس کی آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔ ہاتھ سن اور ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ پھر قطرہ قطرہ پلکوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

''کب تک ایک ماں کے جذبات سے کھیلتے رہو گے شیراز احمد!'' اس نے پیشانی گھٹنوں پر رکھ دی تو اسے یاد آیا لندن جانے سے پہلے جب اس نے احسن کو ساتھ لے جانے کی بات کی تھی تب انہوں نے کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے، اس کا بچہ احساس کمتری کا شکار ہو اور اب یہی بات اس کے ماں باپ کو لکھی تھی کہ ان کی بیٹی دکھی نہ

ہو۔

''سراسر بلیک میلنگ!'' اس نے دکھ سے سوچا۔ ''تمہیں صرف اپنا اور اپنے بچوں کا مفاد عزیز ہے اور بس۔''

''بیٹا! شیراز نے کوئی غلط بات تو نہیں لکھی، تمہارا بھلا سوچا۔'' امی نے اس کا کندھا ہلا کر کہا تو وہ گھٹنوں سے آنکھیں رگڑ کر سر اونچا کرتی ہوئی بولی۔

''جی امی! وہ میرا بھلا ہی سوچتے ہیں۔''

''تمہاری کتنی تعریف لکھی ہے شیراز نے۔ تمہارے ابو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔ میری بیٹی نے میرا سر اونچا کر دیا۔''

''اچھا!'' وہ دکھ سے مسکرائی پھر کہنے لگی۔ ''بہرحال پہلا مرحلہ تو طے ہو گیا، اب آپ فوراً احسن کو بلوائیے۔''

''میں آج ہی تمہارے بھیا سے کہہ کر اسے فون کرواتی ہوں۔''

''ابھی میرا نہیں بتایئے گا۔ بس اچانک مجھے دیکھے گا اور پتا نہیں پہچانے گا بھی کہ نہیں۔'' وہ اب نئے خیال سے مسکرا رہی تھی۔

پھر دوپہر کا کھانا کھاتے ہی اس نے خود شیراز سے گھر چلنے کو کہا۔ کیونکہ کھانا کھاتے ہوئے اسے بار بار سنی اور ہما کا خیال آ رہا تھا۔ گو کہ اب وہ بچے نہیں تھے پھر وہ ان سے کہہ بھی آئی تھی کہ وہ کھانے پر ان کا انتظار نہ کریں۔ اس کے باوجود اسے یہی خیال آتا رہا کہ کہیں وہ انتظار میں بھوکے نہ بیٹھے ہوں۔ اور واقعی انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ جس پر وہ خفگی سے بولی۔

''مجھے پتا تھا، تم لوگ کھانا نہیں کھاؤ گے۔ اس لیے میں بھاگی چلی آئی۔ چلو اٹھو۔ کھانا نکال رہی ہوں۔''

''آپ بھی ہمارے ساتھ کھائیں گی ناں۔'' سنی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پوچھنے لگا۔

''میں کھا چکی ہوں پھر بھی تمہارا ساتھ دینے کے لیے تھوڑا اور کھا لوں گی۔''

وہ جانتی تھی، اس نے اگر صاف منع کیا تو وہ دونوں بھی نہیں کھائیں گے۔ اس لئے کھانا نکال کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی اور روٹی ہاتھ میں لیتے ہی کہنے لگی۔

''یہ روٹی ہما کے ہاتھ کی تو نہیں ہے۔ کس نے پکائی ہے؟''

''وہ فواد اور جویریہ آئے تھے، ابھی کچھ دیر پہلے گئے ہیں۔ اور یہ روٹی جویریہ نے پکائی ہے۔'' سنی نے بتایا تو وہ تعجب سے بولی۔

''چلے کیوں گئے۔ تم نے انہیں کھانے پر نہیں روکا۔''

''انہیں کہیں جانا تھا۔ غالباً جویریہ کی کسی دوست کے ہاں پھر آنے کو کہہ گئے ہیں۔''

''پھر بھی کھانے کا وقت تھا۔ کچھ دیر اور رک جاتے۔ خیر تم لوگ کھاؤ میں تمہارے ڈیڈی سے چائے کا پوچھ لوں۔'' وہ کہتی ہوئی اُٹھ گئی۔

دو روز بعد بھابھی نے فون کر کے اسے بتایا کہ چار بجے کی فلائٹ سے احسن آنے والا ہے تو اس کی آمد سے پہلے ہی وہ امی کے گھر پہنچ گئی تھی۔ بڑے صبر آزما لمحات تھے جو حقیقتاً گزرے ماہ و سال پر بھاری تھے۔ اس کے تصور میں وہی چار سال کا بچہ تھا۔ جو بھاگتا ہوا آ کر اس کی گود میں چڑھتا تھا۔ وہ اس کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا یاد کر رہی تھی۔ کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ پورا جوان آ گیا۔ تصور اور حقیقت کے درمیان برسہا برس کے فاصلے تھے جو اب نظروں نے پل میں طے کیے تھے۔

''مما! آپ۔'' ایک پل کی غیر یقینی اور اگلے پل اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں لے کر وہ یقین کی منزلیں طے کر رہا تھا۔

''میں اتنے برس تم سے دور رہی۔'' وہ رو رہی تھی۔

''نہیں مما! آپ کبھی مجھ سے دور نہیں ہوئیں۔ میرے ساتھ ساتھ رہیں ہمیشہ۔'' وہ اپنی ماں کو احساس جرم سے نکال رہا تھا۔

''ہر رات میں آپ کی لوری سن کر سویا۔
ہر صبح آپ کے پکارنے پر میری آنکھ کھلی۔
میری ہر کامیابی پر آپ نے میری پیشانی چوم کر مجھے مزید شاندار کامیابیوں کی دعائیں دیں۔
کون کہتا ہے آپ مجھ سے دور ہوئیں۔

''سنی میرے بچے!'' وہ دو حصوں میں بٹی ہوئی ماں تھی۔ گزشتہ برسوں میں سنی کا چہرا ہاتھوں میں لیتے ہی اسے بے اختیار احسن پکارتی رہی اور اب احسن کا چہرہ ہاتھوں میں تھا تو جانے کیسی بے اختیاری تھی جو اسے سنی کہہ رہی تھی۔

''یہ سنی نہیں احسن ہے۔'' عقب سے بھابھی نے ٹوکا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر احسن کی پیشانی چوم کر بولی۔

''ہاں۔ تم احسن ہو اور وہ بھی احسن ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کو میری ممتا کی آزمائش بنایا گیا اور دوسرے کو امتحان۔ اور شکر ہے اس پروردگار کا جس نے مجھے دونوں میں سرخرو کیا۔''

☆☆☆☆

شیراز اور سنی اپنا بزنس سیٹ کرنے میں اتنے مصروف ہوئے کہ صبح کے گئے رات میں لوٹتے تھے اور ہما کو اب فراغت ملی تھی تو وہ بہت جلدی بور ہو گئی تھی اور یہاں اس کی کوئی دوست بھی نہیں تھی۔ بس ایک جویریہ سے اس کی انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تھی لیکن ایک تو اس کا گھر دور تھا، دوسرے وہ کالج بھی جاتی تھی۔ اس لیے اس سے بس فون پر بات ہو جاتی تھی۔ عجیب روکھے پھیکے دن تھے کہ اچانک آپی نے ہما کو فواد کے لئے مانگ کر کچھ ہلچل سی مچا دی اور ساتھ میں انہوں نے جویریہ اور سنی کا ذکر بھی چھیڑ دیا تھا جس سے وہ سوچ میں پڑ گئی...... اسے بدلے کی شادیاں مناسب نہیں لگ رہی تھیں اور اس نے شیراز سے بھی کہا تھا کہ یا تو ہم جویریہ نہیں لیں گے یا ہما نہیں دیں

گے۔ شیراز اس کی بات سن کر خاموش ہو رہے تھے جس سے آپی کی آمد و رفت اور اصرار بڑھ گیا تب شیراز اس سے کہنے لگے۔

"مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی بلکہ میں سمجھتا ہوں یہی مناسب رشتے ہیں۔ گھر کے بچے ہیں اگر زیادہ دیکھے بھالے نہیں تب بھی ان کے خاندان کا تو ہمیں پتا ہے۔ دوسری جگہوں پر ہم کہاں اتنی چھان بین کرتے پھریں گے۔"

"یہ تو ہے......" ان کی بات ٹھیک تھی جب ہی اس نے فوراً اتفاق کر لیا۔ پھر کہنے لگی...... "پھر بھی ہمیں سنی اور ہما سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"ہاں۔ تم ان دونوں کی مرضی معلوم کر لو اور ذرا جلدی کیونکہ تم دیکھ رہی ہو، آپی کتنی جلدی مچا رہی ہیں۔"

"آپی تو لگتا ہے، اسی انتظار میں تھیں۔" وہ محظوظ انداز میں پھر اسی وقت ان کے پاس سے اُٹھ کر ہما کے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس سے پوچھنے لگی۔

"بیٹا! تمہیں معلوم ہے۔ تمہاری پھوپھو کیا چاہتی ہیں؟" ہما کا چہرہ ایک پل کو رنگین ہو گیا جس سے وہ بہت کچھ سمجھ گئی پھر بھی وضاحت ضروری سمجھی۔

"وہ فواد کے لیے تمہیں مانگ رہی ہیں اور تمہارے ڈیڈی کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ۔"

"ایک منٹ ممی!" ہما اچانک اسے روک کر بولی۔

"آپ نے صرف ڈیڈی کا نام لیا، اس کا مطلب ہے آپ کو اعتراض ہے۔"

"میرا اعتراض۔" وہ غالباً کہنے جا رہی تھی کہ میرا اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور اپنی بات سنبھالتی ہوئی بولی۔

"مجھے اعتراض صرف بدلے کی شادی پر تھا یعنی تمہاری پھوپھو نے فواد کے ساتھ جویریہ کے رشتے کی بات بھی کی ہے۔ خیر میری بات چھوڑ دو۔ تم بتاؤ۔"

"ہما! ممی کہاں ہیں؟" سنی نے دروازے سے جھانک کر پوچھا کہ اس پر نظر پڑی تو اندر آتا ہوا بولا۔

"آپ یہاں ہیں۔"

"کہو کیا بات ہے؟" وہ سنی کو دیکھنے لگی۔

"بات تو کوئی نہیں۔ بس آپ کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔" وہ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

"اچھا۔!" وہ ہنسی پھر ہما سے پوچھنے لگی۔ "کیوں ہما! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

"بخدا! سچ کہہ رہا ہوں ممی۔" وہ فوراً! بولا۔

"اچھا مان لیا۔ اب ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔ میں ضروری بات کر رہی ہوں۔" اس نے ٹوکتے ہوئے کہا اور ہما کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"آپ پہلے سنی سے پوچھیں، یہ کیا کہتا ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے؟" وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگا تو وہ اس کی طرف رخ موڑ کر بولی۔

"مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی تم دونوں کی شادی کی بات کر رہی تھی تمہاری پھوپھو بہت جلدی مچا رہی ہیں۔ اب تم اپنی رائے دو تا کہ ہم آگے انہیں جواب دے سکیں۔"

"میری رائے میں جویریہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اِدھر سے ہما بول پڑی۔

"ہائیں، یہ تم دونوں مذاق کر رہے ہو کیا۔" اس نے گردن موڑ کر ہما کو پھر اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"بالکل نہیں۔ آپ نے رائے پوچھی، ہم نے بتا دی۔"

"اب یہ بھی بتا دو کہ تمہارا جویریہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"ممی!" وہ ایک دم کرسی پیچھے دھکیل کر اس کے پیروں کے پاس گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ تھام کر بولا۔ "ہم نے پہلے کبھی آپ کی کسی بات سے اختلاف کیا ہے۔ نہیں ناں۔ تو اب بھی آپ کو ہم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو آپ کا دل چاہے کریں۔ اگر آپ کو فواد اور جویریہ پسند ہیں ہے تو ہامی بھر لیں ورنہ صاف پھوپھو کو منع کر دیں۔"

"سنی ٹھیک کہہ رہا ہے ممی! اول تو ہماری کسی کے ساتھ کمٹ منٹ نہیں ہے اور اگر ہوتی تب بھی ہم فیصلہ آپ پر چھوڑتے۔"

ہما نے سنی کی تائید کرتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک گئیں۔

"ہم نے کچھ غلط کہہ دیا ممی! آپ رونے کیوں لگیں۔" سنی پریشان ہو گیا۔

"ممی پلیز۔" ہما نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"میں رو رہی ہوں، کہاں رو رہی ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر کھلکھلاتی مسکراہٹ تھی۔ "اتنا پیار کرتے ہوئے تم مجھ سے، میرا مان بڑھا دیتے ہو پھر میں روؤں گی کیوں۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا میں۔"

اس نے اپنے کندھے پر رکھے ہما کے چہرے کو پیار سے چھوا پھر سنی کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو وہ کہنے لگا۔

"اب آپ مجھے بہت اچھا بہت نیک کہیں گی یعنی احسن!"

"شریر!" اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"صرف پیشانی چومنے سے کام نہیں چلے گا۔ دعائیں بھی دیں کہ اللہ مجھے ایسی ہزاروں شادیاں نصیب کرے۔"

سنی نے کہا تو ہما بے ساختہ زور سے ہنسی اور وہ ہنسی روک کر سنی کو گھورنے لگی تھی۔

پھر دونوں کے لیے ہامی بھرتے ہی وہ بہت مصروف ہو گئی تھی ایک کا جہیز اور دوسرے کی بری۔ اور شیراز نے سارے کام اسی پر چھوڑ دیئے تھے۔ کپڑوں اور اس کے ساتھ دوسرے لوازمات کی خریداری کے لیے اس نے

پیسے ہما کو دے دیے کہ وہ جویریہ کے ساتھ جا کر اپنی اور اس کی پسند سے لے لے۔ یوں وہ زیادہ بازاروں کے چکر لگانے سے بچ گئی تھی۔

البتہ زیورات کے لئے وہ شیراز کے ساتھ جا کر آرڈر دے آئی تھی۔ اور اس روز انہی زیوارت کے سلسلے میں اسے جیولر کے پاس جانا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ہما اور جویریہ بھی بازار جا رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑی۔ اور کیونکہ اس کا کام تھوڑی دیر کا تھا اس لئے مطلوبہ جگہ اترتے ہوئے اس نے ہما سے کہہ دیا کہ وہ ٹیکسی سے واپس چلی جائے گی اس لئے وہ دونوں اطمینان سے اپنی شاپنگ کریں۔

پھر وہ پندرہ منٹ میں ہی فارغ ہو گئی کیونکہ اس کے آرڈر کئے ہوئے زیوارت بھی بنے نہیں تھے اور جو بنے تھے وہ انہیں دیکھ کر اور اپنا اطمینان کر کے دوکان سے نکل آئی تو سوچا کچھ دیر کے لئے امی کے ہاں چلی جائے۔ کیونکہ ہما تین چار گھنٹے سے پہلے یہاں سے فارغ ہونے والی نہیں تھی۔ اور وہ اکیلی گھر جا کر کیا کرے گی۔ روڈ کراس کرنے کے لئے سگنل کا انتظار کرنے لگی تبھی قریب کھڑی گاڑی میں سے نکلتی ہوئی خاتون نے اسے متوجہ کر لیا۔

''سنیں۔ آپ رباب ہیں؟۔''

''جی۔!'' اس نے چونک کر دیکھا پھر ایک دم اس کے گلے لگ گئی۔ ''تم نورین ہو ناں۔''

''اف کتنے عرصے کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ کہاں رہتی ہو؟۔''

''میں لندن چلی گئی تھی۔ ابھی چھ مہینے پہلے ہم دوبارہ یہاں آ کر سیٹل ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا پھر ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ''تم اکیلی ہو۔''

''اکیلی تو تم بھی نظر آ رہی ہو۔'' نورین نے اس کے اطراف دیکھ کر کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''میری بیٹی اور ہونے والی بہو ساتھ ہیں لیکن انہیں ابھی بہت شاپنگ کرنی ہے اور میں کیونکہ ان کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی، اس لئے گھر جا رہی ہوں۔''

''کیوں تم ان کا ساتھ کیوں نہیں دے سکتیں، ابھی بوڑھی تو نہیں ہوئی ہو۔''

نورین نے اس کے اسمارٹ سراپے کو سراہتی نظروں سے دیکھا۔

''وہ جوانی بھی تو نہیں رہی۔ خیر تم سناؤ۔''

''بہت کچھ سناؤں گی۔ چلو میرے گھر۔'' نورین نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

نورین کا گھر گو کہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اچھا صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اسے بٹھاتے ہی نورین نے جانے کسے پکارنا شروع کر دیا۔

''زارا! زارا! جلدی آؤ۔'' ایک خوش شکل لڑکی دروازے میں نمودار ہوئی تو اس سے کہنے لگی۔ ''دیکھو۔ یہ میری پرانی اور بہت اچھی دوست رباب ہے۔ پہلے تو اس کے لئے کوئی ٹھنڈا ٹھنڈا لاؤ۔ اس کے بعد کھانا

زبردست ہونا چاہئے۔''

''نہیں نہیں، کھانے کا تکلف نہیں کرو۔'' اس نے منع کیا تو رعب سے بولی۔

''تم خاموش رہو۔ اور تم جاؤ زارا! بلکہ ٹھہرو، تمہارا تعارف تو میں نے کرایا نہیں۔ رباب! یہ میری بہو ہے۔ میرے آفاق کی دلہن۔''

''اچھا اچھا ماشاء اللہ۔ یہاں آؤ بیٹی۔!''

اس نے زارا کو قریب بلایا اور گلے لگا کر پیار کیا پھر جلدی سے پرس میں سے پانچ سو نکال کر اس کی مٹھی میں دباتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری شادی میں تو میں یہاں تھی نہیں اور ابھی راستے میں تمہاری ساس نے بھی تمہارا کوئی ذکر نہیں کیا ورنہ میں تمہارے لیے کوئی گفٹ لے آتی۔''

''میں نے اسی لئے نہیں بتایا تھا۔ کوئی ضرورت نہیں ان تکلفات میں پڑنے کی۔''

نورین نے زارا کو اس کے پیسے واپس کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کا اشارہ سمجھ کر بولی۔

''تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہمارے معاملات میں بولنے کی، اور یہ میں اپنی بیٹی کو دے رہی ہوں۔ چلو بیٹی! اب جلدی سے مجھے پانی پلا دو۔''

زارا اُٹھ کر چلی گئی تب وہ نورین کو دیکھ کر بولی۔

''گویا تمہارے تکلیف کے دن کٹ گئے......''

''ہاں۔!'' نورین نے گہری سانس کھینچی۔ ''وقت خواہ کیسا بھی ہو گزر ہی جاتا ہے۔ بس انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ میں نے آفاق کو پڑھایا لکھایا اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو سمجھو اسی روز میری ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ماشاء اللہ بڑا لائق ہے میرا بیٹا پھر اسے ہمیشہ یہ احساس بھی رہا ہے کہ اس کی ماں نے اس کے لئے کتنی محنت کی، کتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ جب ہی اب اسے ہر دم میرے آرام کا خیال رہتا ہے۔

جب میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی تو وہ دیکھتا تھا کہ میری بھاوجوں کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہے اور بھائی بھی غیروں جیسا سلوک کرتے تھے۔ تب اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی آفاق نے سب سے پہلے الگ گھر کا انتظام کیا اور ہم ماں بیٹا یہاں آ گئے۔ اس نے میری جاب بھی چھڑوا دی پھر جب میں تنہائی کا شکار ہونے لگی تو اس کی شادی کر دی۔ زارا سے ابھی تم ملی ہو اور ہاں اس گھر کی اصل رونق میرا پوتا تیمیر غالباً سو رہا ہے جبھی اس کی آواز نہیں آ رہی۔'' پوتے کا ذکر کرتے ہوئے نورین کے لہجے میں بڑی مٹھاس تھی۔ وہ بھی مسکرا دی پھر کہنے لگی۔

''اس کا مطلب ہے تمہارا اس وقت شادی نہ کرنے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔''

''بالکل۔ میں اگر اس وقت شادی کر لیتی تو آفاق کی شخصیت مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ٹوٹا ہوا، شکستہ انسان ہوتا اور مجھ سے متنفر بھی ہو جاتا تب اس وقت میں سکون سے ہونے کے بجائے اور زیادہ پریشان ہوتی۔ کچھ پانے کے لئے کھونا پڑتا ہے رباب! میری غلطی تھی جو میں صرف پانا چاہتی تھی۔ اور جب کھونے کی بات آتی تو

میں ہتھے سے اکھڑ جاتی تھی بہرحال دوسرے شوہر سے طلاق لینے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔تب میں نے اپنی ذات کی نفی کر دی اور صرف آفاق کے لئے سوچا۔'' نورین اچانک خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی یوں جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''کیا ہوا؟'' اس نے ٹوکا تو نورین سر جھٹک کر بولی۔

''اس وقت سے میں ہی بولے جا رہی ہوں۔تم بھی تو کچھ کہو بلکہ مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں بتاؤ۔شیراز کے دل اور گھر میں اس کی جگہ بنی یا نہیں؟''

''ہاں شیراز کے پاس تو بہت جگہ تھی لیکن میں نے خود ہی احسن کو امی ابو کے پاس چھوڑ دیا تھا۔''

اس نے پہلے مرحلے پر ہی شیراز کو بری کر دیا۔وہی بات کہ وہ خواہ کیسا بھی سہی بہرحال اس کا شوہر تھا۔جس کی رفاقت میں اس نے برسہا برس گزارے تھے۔

''اب تو ماشاء اللہ سب بچے جوان ہو گئے ہیں۔احسن کی جاب لاہور میں ہے۔وہ وہیں ہوتا ہے۔سنی شیراز کے ساتھ بزنس کر رہا ہے اور ہما لندن سے گریجویشن کر کے آئی تھی۔یہاں آتے ہی دونوں بچوں کے رشتے ہو گئے۔آج کل انہیں کی شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہوں، ان سے فارغ ہو لوں تو پھر انشاء اللہ احسن کی باری آئے گی۔''

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں یوں بتایا جیسے اس کی زندگی یونہی آرام واطمینان سے گزری ہو۔

''بس میرا مطلب ہے وہی بچے۔اور بچہ نہیں ہے؟'' نورین نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ بظاہر لاپروائی سے بولی۔

''نہیں مزید بچے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔تین تھے تو۔''

''بے شک تین کافی ہوتے ہیں پھر بھی تمہارے اور شیراز کے تعلق کو مضبوط کرنے کی ایک کڑی بھی ہونی چاہئے تھی۔''

''ہیں ناں، سنی اور ہما۔یقین کرو، انہیں ابھی تک معلوم نہیں ہے کہ انہیں جنم دینے والی ماں کوئی اور تھی۔اور اب اگر کوئی ان سے کہے گا بھی تو وہ دونوں یقین نہیں کریں گے۔بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے اپنے باپ سے بھی زیادہ۔''

اس نے بڑی محبت سے سنی اور ہما کا ذکر کیا پھر کہنے لگی۔

''اسی لئے میں احسن کو یہیں چھوڑ گئی تھی۔اگر وہ ساتھ ہوتا تو پھر شاید میں سنی اور ہما کو اتنی توجہ نہیں دے سکتی تھی۔فطری سی بات ہے اپنے بچے کے سامنے دوسرے بچے نہ چاہنے کے باوجود نظر انداز ہو جاتے ہیں۔اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بچے نظر انداز ہوں۔کیونکہ ان کا کوئی نہیں تھا۔جبکہ یہاں احسن کے ساتھ سب تھے۔امی، ابو، بھیا، بھابی، اور سب اس سے محبت کرنے والے۔کسی نے اسے میری کمی محسوس نہیں ہونے دی۔بس نورین جو گزری اچھی گزری آگے بھی اللہ بہتر کرنے والا ہے۔''

''انشاء اللہ۔'' نورین نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔''میں دیکھوں کھانا پک رہا ہے حلیم۔''

''تم نے ناحق زارا کا کام بڑھایا۔میں پھر کسی دن فرصت سے آ جاتی۔''

''فرصت سے بھی آ جانا۔ابھی تو چلو، میرا خیال ہے زارا کھانا لگا رہی ہے۔''

نورین لمبی سانس کھینچ کر کھانے کی خوشبو محسوس کرتی ہوئی بولی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر کھانے کے بعد نورین خود اسے گھر چھوڑ گئی تھی۔تب تک ہما شاپنگ سے نہیں لوٹی تھی، اور کیونکہ جویریہ اس کے ساتھ تھی اس لئے اسے تشویش نہیں تھی۔

☆☆☆☆

پھر شادی کی تیاریوں میں دن گزرتے پتا بھی نہیں چلا۔ہما رخصت ہو کر گئی تو جویریہ آ گئی لیکن وہ ہما کی جگہ نہیں تھی۔کیونکہ اس کے وجود سے اسے صرف اپنے علاوہ گھر میں کسی دوسرے فرد کی موجودگی کا احساس ملتا تھا اور بس۔حالانکہ وہ محبت کی دیوی تھی اور جویریہ سے بہت محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتی تھی لیکن ادھر عجیب بے حسی، سرد مہری اور نولفٹ والا انداز تھا۔جبکہ شیراز کا وہ بہت خیال رکھتی تھی۔جیسے ہی وہ آفس سے آتے۔ان کے لئے چائے لے آتی۔پھر کھانا اور دوسرے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے بھی دوڑتی نظر آتی۔جس پر شیراز اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔یوں بھی وہ ان کی سگی بھانجی تھی۔اور رباب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک اسی کے ساتھ وہ سرد مہری سے کیوں پیش آتی ہے۔

صبح شیراز اور سنی کے آفس جاتے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔دوپہر کے کھانے پر اس کے پکارنے پر نکلتی اور کھانا کھاتے ہی پھر کمرے کا رخ کرتی۔

''بیٹا! سارا دن ایک کمرے میں بند رہتی ہو۔تمہارا دل نہیں گھبراتا۔''

''پھر کیا کروں۔'' جویریہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

''کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔میرا بھی دل بہل جائے گا۔'' اس نے بڑے خلوص سے کہا۔

''تو میں آپ کا دل بہلایا کروں۔سوری آنٹی مجھے دل بہلانا نہیں آتا۔'' جویریہ نروٹھے پن کا مظاہرہ کرتی اٹھ کر جانے لگی کہ اس نے سخت لہجے میں اسے پکار لیا۔

''رکو جویریہ! تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''اپنا لہجہ درست کرو۔مجھ سے آج تک میرے بچوں نے اس لہجے میں بات نہیں کی۔''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تنبیہہ کی اور ابھی مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑی۔

''کون سے بچوں نے؟''

''جویریہ۔'' وہ قدرے سناٹے میں آ گئی۔''کیا کہنا چاہتی ہو تم۔''

''مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' وہ کندھے اچکاتی کمرے سے نکل گئی اور وہ کتنی دیر تک اس کے پیچھے نظریں جمائے

بیٹھی رہ گئی۔

اور تب اس کی سمجھ میں آیا کہ جویریہ اسے سرے سے سنی کی ماں ہی نہیں سمجھتی، اس لیے اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اور اس میں قصور جویریہ کا نہیں تھا۔ اس کے نزدیک وہ ابھی نادان تھی ورنہ سنی کی اس کے ساتھ حد درجہ وابستگی اور عقیدت دیکھ کر سمجھ جاتی کہ وہ اس کی ماں سے بھی بڑھ کر کسی مقام پر کھڑی تھی۔ بہر حال جویریہ کو نادان سمجھ کر جہاں اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا وہاں اس کی نادانی سے خائف بھی ہو گئی تھی کہ کہیں وہ سنی اور ہما سے یہ نہ کہہ دے کہ وہ ان کی ماں نہیں ہے گو کہ شیراز نے آتے ہی اول دن آپی کے گھر انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ ان کے بچوں کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کریں لیکن اب سنی کی بیوی بن کر جویریہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

ان ہی دنوں جب وہ لاشعوری طور پر جویریہ کی طرف سے ایسی ہی حماقت کی منتظر تھی کہ لاہور سے احسن کا فون آ گیا۔ وہ بڑی عاجزی سے اسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔

"مما! کچھ دنوں کے لیے آ جائیں۔ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ میں خود آپ کے لینے آ جاؤں؟"

"نہیں میں آ جاؤں گی۔" اس نے محض اسے روکنے کی خاطر فوراً ہامی بھری جس پر اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"کب؟"

"میں فون کر دوں گی تمہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

اور اسی رات اس نے شیراز سے اپنے لاہور جانے کی بات کی تو وہ چھوٹتے ہی پوچھنے لگے۔

"بچوں سے کیا کہو گی؟"

"یہی کہ لاہور جا رہی ہوں اپنے عزیزوں سے ملنے۔"

شاید اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھی جب ہی بڑے آرام سے جواب دیا پھر کہنے لگی۔

"ویسے بھی شیراز! بچے اب بڑے ہو چکے ہیں اور آج نہیں تو کل حقیقت جان ہی لیں گے۔"

"کب جانا ہے تمہیں؟" شیراز غالباً اس موضوع سے ہٹنا چاہتے تھے۔

"کل یا پرسوں۔" ان کے سوال میں آمادگی کا پہلو تھا جب ہی اس نے جلدی جانے کا پروگرام بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ سنی سے کہو، وہ کل تمہارا ٹکٹ لے آئے گا۔" انہوں نے اجازت دینے کے ساتھ سنی سے جھوٹ بولنے کا گناہ بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

احسن نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ کبھی اس سے دور نہیں ہوئی۔ اس کے چھوٹے سے گھر میں آ کر اسے بھی یہی لگ رہا تھا جیسے وہ شروع سے اپنے اس بچے کے ساتھ یہیں رہتی آ رہی ہو۔ کچھ بھی اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ اور احسن

اس کی آمد سے اتنا خوش تھا جیسے کل کائنات مل گئی ہو۔ رات دیر تک اس کے زانو پر سر رکھے اسے اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات سناتا رہا۔

اس نے محسوس کیا، اس کی باتوں میں شہناز کی بیٹی مریم کا بہت ذکر تھا۔ اور اس کا نام لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو رنگ اترتے تھے انہیں وہ بہت شوق اور دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ جان گئی ورنہ وہ اپنے طور پر بھیا کی بیٹی ماریہ کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ احسن کیونکہ بھیا کے بچوں کے ساتھ پروان چڑھا ہے اس لیے اس کی ماریہ سے اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گی۔ بہر حال اس وقت وہ صرف احسن کی باتیں سنتی رہی۔ کہیں ٹوکا نہیں۔

"آپ بور تو نہیں ہو رہیں مما۔"

بہت دیر بعد احسن نے اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھا تو وہ اس کی پیشانی سے بال ہٹاتی ہوئی بولی۔

"بالکل نہیں۔ البتہ مجھے یہ فکر ہو رہی ہے کہ صبح تم آفس کیسے جاؤ گے۔"

"کیوں۔؟"

"اتنی دیر سے سوؤ گے تو اُٹھو گے کب۔" اس نے سامنے کلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! ایک بج گیا۔" احسن فوراً اٹھ بیٹھا۔ "میں نے آپ کو بھی پریشان کیا۔ چلیں اب آپ سو جائیں۔"

"میری فکر نہیں کرو، تم جا کر سوؤ۔ اور ہاں صبح کتنے بجے اٹھتے ہو۔"

"بجے وجے کا مجھے نہیں پتا، جب آپ اٹھاتی ہیں۔ میں اٹھ جاتا ہوں۔" اس نے چونک کر دیکھا تو وہ مسکرا کر کندھے اچکاتا شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

اور صبح جب وہ نماز کے لیے اٹھی تو اس وقت اسے پکارنا شروع کر دیا جیسے برسوں پہلے اسے اسکول کے لئے اٹھاتی تھی۔

"احسن! اُٹھ جاؤ بیٹا! آفس نہیں جانا۔"

اس کی پہلی آواز پر ہی وہ اُٹھ گیا لیکن قصداً آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ غالباً خود کو یقین دلا رہا تھا کہ یہ اس کا گمان ہے نہ خواب بلکہ سچ مچ ماں اسے پکار رہی ہے۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا، اس کا دل چاہا وہ یہی پکارتی رہے۔

"احسن! میں ناشتا بنا رہی ہوں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

وہ کچن کی طرف جاتی ہوئی کہہ رہی تھی تب وہ فوراً بستر چھوڑ کر بھاگا آیا۔

"مما! آپ کوئی کام نہیں کریں گی۔"

"کیوں؟"

"بس نہیں۔ چلیں، وہاں جا کر آرام سے بیٹھیں۔ میں ناشتا لا رہا ہوں۔"

وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کچن سے باہر لانا چاہتا تھا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"فضول باتیں نہیں کرو۔ جاؤ تم اپنی تیاری کرو۔" پھر پلٹ کر چولہا جلاتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ "مہمان

ہوں میں۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اور یہ تم ابھی تک یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ چلو جاؤ۔"

"مما آپ۔"

"چلو۔" اس نے رعب سے اسے نکلنے کا اشارا کیا اور اس کے جاتے ہی مسکرائی تھی۔

وہ شیراز سے ایک ہفتے کا کہہ کر آئی تھی لیکن اب احسن کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جب تک احسن شادی کر کے بیوی کو یہاں نہیں لے آتا اسے یہیں رہنا چاہئے۔ آخر اس بچے کا بھی کچھ حق ہے اس پر۔ سنی اور ہما سے تو فارغ ہو چکی تھی۔ پھر گھر کی طرف سے بھی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہاں جویریہ تھی۔ جو اس کا نہیں لیکن شیراز اور سنی کا خیال تو رکھتی تھی۔ اس لیے وہ احسن کی شادی تک آرام سے یہاں رہ سکتی تھی۔ اس نے سوچا ضرور لیکن احسن سے ذکر نہیں کیا۔ اس سے پہلے وہ شیراز سے بات کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اجازت دے بھی سکتے تھے اور نہیں بھی۔

رات احسن کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اس نے اچانک اس کی شادی کی بات چھیڑ دی۔ اور جب مریم کا نام لیا تو وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولا۔

"مما! آپ کو بھی مریم پسند ہے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ تمہیں پسند ہے۔" وہ اس کے بھی کہنے پر یوں مسکرائی۔ جیسے چوری پکڑی گئی۔

"اچھی لڑکی ہے، مجھے بھی پسند ہے اور اب میں جاتے ہی شہناز سے بات کروں گی۔ اور جلدی شادی کرنے پر زور دوں گی کیونکہ تم جب تک اکیلے رہو گے۔ میں تمہاری طرف سے پریشان رہوں گی۔" اس نے مریم کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

پھر اگلے تین دن اس نے خاصی بے چینی سے گزارے۔ اسے احسن کی شادی کی بات کرنے کی جلدی تھی۔ اگر شیراز سے ایک ہفتے کا نہ کہہ آئی ہوتی تو پہلے ہی چلی جاتی۔ اور محض اس خیال سے رکی رہی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ احسن کے پاس اس کی جگہ نہیں تھی۔ اس شخص کی سوچ ایسی ہی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ اس لیے پورا ہفتہ گزار آئی۔ اور حقیقتاً ابھی احسن اسے آنے نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے پاس بہانا موجود تھا۔

"مجھے شہناز سے بات کرنی ہے۔ میں اب صبر نہیں کر سکتی۔"

اور یہاں آنے کے دوسرے ہی دن اس نے پہلا کام یہی کیا۔ امی اور بھابھی کو ساتھ لے کر شہناز کے گھر گئی تھی مریم کے لئے دامن پھیلایا پھر وہیں سے ہما کی خیریت معلوم کرنے آپی کے گھر چلی گئی۔ ہما کمزور لگ رہی تھی لیکن جب آپی نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے تب وہ تشویش سے نکل کر بہت خوش گھر واپس آئی تھی۔

پھر کتنا بہت سارا وقت گزر گیا۔ وہ جتنی جلدی احسن کی شادی کرنا چاہتی تھی، اسے اتنی ہی دیر ہو رہی تھی اور یہ دیر شہناز کی طرف سے تھی۔ جانے کیا پرابلم تھی اس کے ساتھ۔ اور ہما کی ڈلیوری میں دو مہینے رہ گئے تھے۔ اور وہ دھان پان سی لڑکی پتا نہیں ڈلیوری سے خوفزدہ تھی یا کوئی اور بات کہ دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی اس کی طرف سے تشویش ظاہر کی تب وہ اسے اپنے پاس لے آئی۔

"سچ بتاؤ آپی تمہیں کھانے کو نہیں دیتیں یا تم سے کام زیادہ کرواتی ہیں۔"

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ہما سے پوچھا تو جواب میں اس نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔

"اگر سچ مچ ایسا ہو ممی! تو آپ کیا کریں گی۔"

"میں۔"

"بتائیں ناں ممی۔"

"پہلے تم بتاؤ۔ کیا واقعی ایسا ہے؟۔" وہ ٹھٹک کر دیکھنے لگی تھی تب ہما ہنس پڑی۔

"نہیں ممی! ایسا کچھ نہیں ہے۔ پھوپھو تو خود پریشان ہیں کہ میں اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہوں اور فواد کتنے ڈاکٹر بدل چکے ہیں۔"

"میں سمجھ گئی تمہیں ممی کے ہاتھ کا کھانا نہیں ملا ہاں، اس لیے کمزور ہو گئی ہو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے، آپ جیسا پراٹھا وہاں کوئی نہیں بنا سکتا۔ اور جب میں کہتی ہوں تو سب حیران ہوتے ہیں کہ لندن میں رہنے والی ناشتے میں پراٹھا کھاتی ہے۔"

ہما محظوظ انداز میں بتا رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر بڑی نرم بڑی شفیق مسکراہٹ تھی۔

ہما کے آنے سے گھر میں کافی رونق ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے ہی سہی جویریہ بھی کمرے سے باہر نظر آنے لگی تھی۔ شام میں فواد بھی آ جاتا تو رات تک محفل جمی رہتی اور ان کے قہقہے اس کے بیڈروم تک سنائی دیتے تھے تو جہاں وہ ان کی خوشیوں کو نظر نہ لگنے کی دعا کرتی وہاں اسے احسن کی تنہائی کا خیال بھی آتا تھا۔ اس کی شادی ہو جاتی تو اس کی طرف سے بھی اطمینان ہو جاتا۔

☆☆☆☆

اگلا دن چھٹی کا تھا جبھی فواد اطمینان سے بیٹھا تھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ وہ ہما کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو اس کی حالت کے پیش نظر سب کو محفل برخاست کرنے کو کہا۔ پھر ہما کو ٹوکتے ہوئے بولی۔

"تمہیں اتنی دیر تک نہیں بیٹھنا چاہیے بیٹا۔"

"نو پرابلم آنٹی، اب تو یہ ہٹی کٹی ہو گئی ہے۔" فواد نے ہما کو شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولی۔

"ماشاءاللہ۔ نظر نہیں لگاؤ میری بیٹی کو۔"

"اسے میری نظر نہیں لگے گی۔ بس آپ یہ بتا دیں کہ اتنے سے دنوں میں آپ نے اسے کیا کھلا پلا دیا ہے جو یہ......" اس کے گھورنے پر فواد نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا پھر اٹھتا ہو بولا۔ "میں چلتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ آپ مجھے مار کر نکالیں۔"

"یہیں رک جاؤ یار۔ صبح ویسے ہی چھٹی ہے۔" سنی نے کہا تو وہ فوراً بولا۔

"جب ہی تو جا رہا ہوں۔"

"کیا مطلب۔"

"سنا ہے آنٹی صبح سویرے سب کو اُٹھا دیتی ہیں۔ چھٹی کے دن بھی رعایت نہیں دیتیں۔ کیوں آنٹی؟"
"بالکل۔ چھٹی کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ گیارہ گیارہ بجے تک سوتے رہو۔"
"گیارہ نہیں صرف ایک۔" فواد نے کہا تو وہ حیران ہو گئی۔
"ایک بجے تک سوتے ہو۔"
"ایک بجے تو میں انہیں اُٹھانا شروع کرتی ہوں ممی! تب بھی کہتے ہیں اتنی جلدی اُٹھ کر کیا کروں گا۔" ہما نے اسے مزید حیران کیا۔
"پھر تو آج تم یہیں سو جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں اتنی دیر تک کیسے سوتے ہو۔"
"نہیں آنٹی۔ مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔ چلتا ہوں۔ خدا حافظ اور شب بخیر۔"
فواد بہت عجلت میں سب کو ہاتھ ہلاتا باہر نکل گیا تو باقی سب کے ہنسنے پر وہ انہیں ٹوکتی ہوئی بولی۔
"تم سب کو جلدی اٹھنا ہے۔ چلو اب سونے کی بات کرو۔ تمہاری آوازوں سے شیراز بھی ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔ اٹھو بیٹا ہما!"
"جی ممی!" ہما اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔
وہ اپنے کمرے میں آئی تو شیراز سو رہے تھے، البتہ ٹیوب لائٹ کی روشنی سے ان کے چہرے پر قدرے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فوراً زیرو پاور کا نیلگوں بلب جلا کر ٹیوب لائٹ آف کر دی۔ اور احتیاط سے اپنی جگہ پر آ کر لیٹی تو کل کے بارے میں سوچنے لگی، اسے شہناز کے پاس جانا تھا اور اتفاق سے کل ہما کے چیک اپ کی ڈیٹ بھی تھی۔ پہلے ڈاکٹر اس کے بعد شہناز کے ہاں جانے کا پروگرام بناتی ہوئی سو گئی۔ اور جانے کتنی دیر ہوئی تھی اسے سوئے ہوئے ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ کہ اپنے دروازے پر دستک سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے اسے وہم لگا لیکن جب دستک دوبارہ ہوئی تو وہ فوراً اٹھ گئی۔ پہلا خیال ہما کا آیا تھا کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ لیکن جب دروازہ کھولا تو سامنے سنی تھا۔
"کیا بات ہے بیٹا؟" اس کی پریشانی اور گھبراہٹ فطری تھی۔
"وہ۔ ذرا ڈیڈی کو اٹھا دیں۔" سنی اس سے نظریں چرا کر شیراز کو دیکھتا ہوا بولا۔
"خیریت؟" وہ سہمی جا رہی تھی۔
"خیریت ہی ہے ممی! آپ ڈیڈی کو اٹھائیں تو۔"
"نہیں۔ پہلے مجھے بتاؤ کیا بات ہے، جویریہ کہاں ہے۔" وہ سنی کو دھکیل کر باہر نکلنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے کندھوں سے تھام کر کمرے کے اندر لے آیا اور صوفے پر بٹھاتا ہوا بولا۔
"ممی پلیز اس وقت آپ کو بہت حوصلے سے کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ ہما کو آپ نے سہارا دینا ہے۔ وہ فواد۔ یہاں سے جاتے ہوئے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کس حال میں ہے۔ میں ڈیڈی کو لے کر ابھی جا رہا ہوں۔ دعا کریں سیریس کیس نہ ہو اور ہاں ہما اور جویریہ کو ابھی اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میرے فون کا انتظار کیجئے گا۔ انشاء اللہ میں اچھی خبر سناؤں گا۔"
وہ سناٹے میں بیٹھی ایک ٹک سنی کو دیکھے جا رہی تھی۔ جو دھیرے دھیرے بولنے کے ساتھ اس کے کندھوں پر گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ پھر اپنی بات ختم کر کے وہ خود ہی پلٹا اور شیراز کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کھلی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی لیکن اس کا وجود حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز نے جیسے اسے جھنجوڑ دیا تھا۔
"الٰہی رحم۔" وہ خود کو سہارا دیتی اُٹھ کھڑی ہوئی اور وضو کر کے جائے نماز بچھالی پھر فجر کی نماز پڑھ کر ہی وہ کمرے سے نکلی تھی۔ مسلسل سجدے میں سر رکھنے اور شدت گریہ کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور پپوٹے سوج گئے تھے۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ایک کپ چائے بنا کر پی لے۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بہت نڈھال سی وہ برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر ہما اور جویریہ کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔
ابھی بھی اس کے ہونٹ مسلسل قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے ہل رہے تھے۔ البتہ انگلیوں کے درمیان تسبیح کا دانہ جیسے باقی دانوں کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اچانک فون کی بیل سے اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا اور وہ خوفزدہ سی ہو کر ٹیلی فون کو دیکھنے لگی گو کہ سنی نے کہا تھا کہ میں انشاء اللہ اچھی خبر سناؤں گا۔ اس کے باوجود اس نے فون نہیں اٹھایا۔ تب مسلسل بیل پر جویریہ اپنے کمرے سے جھنجلاتی ہوئی نکلی تھی۔
"ممی! آپ کو بیل سنائی نہیں دے رہی۔"
اسے بیٹھے دیکھ کر جویریہ نے اسی جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا اور بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا تو وہ سانس روک کر اسے دیکھنے لگی۔
"کون سنی...... یہ تم اتنی صبح کہاں چلے گئے؟"
"ممی! ہاں یہیں موجود ہیں۔"
"نہیں مجھے بتاؤ۔ کیا بات ہے۔"
اور چند لمحوں کے توقف سے جویریہ کی چیخوں نے در و دیوار ہلا دیئے ہما گھبرا کر بھاگی آئی اور اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے یہ روح فرسا خبر سنائی جائے لیکن چھپائی بھی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ اس کا شوہر تھا جس کی نشانی اس کے وجود سے ظاہر ہو رہی تھی۔
"کیا ہوا ممی۔؟" جویریہ کے رونے سے پریشان ہو کر وہ کتنی معصومیت سے اس سے پوچھ رہی تھی۔
"میری بچی!" اس نے ہما کو کھینچ کر اپنی آغوش میں چھپانے کی کوشش کی۔ اور ناکام ہو کر ڈھے گئی تھی۔
"کہتے ہیں بیٹیاں ماؤں جیسا نصیب لے کر پیدا ہوتی ہیں لیکن ہما میری بیٹی تو نہیں ہے۔ میں نے اسے جنم نہیں دیا پھر میرے نصیب کی سیاہی اس کی کوکھ پر کیسے منتقل ہو گئی۔"
وہ ہما کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی دکھ سے سوچ رہی تھی۔
ابھی تو نئی زندگی کی اولین بہاروں میں وہ پوری طرح کھلی بھی نہیں تھی کہ خزاں اس کی زد میں آ گئی۔

"امی۔ یہ اس بچی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟" اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر ہما کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

"ممی!" ہما نے اس کا ہاتھ اپنے بالوں سے نکال کر ہونٹوں سے لگالیا۔ "آپ ہم سے اتنی محبت کیوں کرتی ہیں؟"

"محبت کا دوسرا نام ماں ہے بیٹی۔ تمہیں ماں بن کر بھی احساس نہیں ہوا۔" وہ اس کے پہلو میں بچے پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔

"بڑا بدنصیب ہے میرا بچہ پیدا ہی محروم ہوا۔"

"نہیں بیٹا! ایسے نہیں کہتے۔ بچے تو اللہ کی طرف سے انعام ہوتے ہیں، تم اسے بدنصیب نہیں کہو۔ کون جانے یہ تمہارے لیے کتنا بختاور ہو۔"

وہ اپنے آنسو پونچھ کر اس کی دلجوئی کرنے لگی "فواد کی زندگی اتنی ہی تھی لیکن دیکھو وہ جاتے جاتے تمہاری دل بستگی کا سامان کر گیا ہے تاکہ تم اداس نہ ہو۔ اس کے ساتھ خوش رہو۔"

"ہاں ممی۔ اس کے لیے تو مجھے زندہ رہنا ہے۔" ہما نے آنکھوں میں اترتی نمی اس سے چھپانے کی خاطر پلکیں موند لیں۔

اور خواہ کتنے سانحے گزر جائیں۔ وقت ٹھہرتا ہے نہ روزمرہ کے کام رکتے ہیں۔

اس گھر کی وہی روٹین شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اداسیوں کے بادل چھٹنے میں کافی وقت لگا۔ جب ہما کا بیٹا یاسر تین ماہ کا ہو کر کھلکھلانے لگا تب اس کے ساتھ سب کے ہونٹوں پر اپنے آپ مسکراہٹ آجاتی۔ یہی دنیا ہے اور یہی زندگی کے رنگ کہ باپ کی جدائی سے جو زخم لگا تھا اس کی مسیحائی بیٹا کر رہا تھا۔ یوں بھی ہما کے بعد اب اس گھر میں بچہ آیا تھا اس لیے سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ شیراز بھی آفس سے آتے ہی پہلے اس کا پوچھتے تھے۔

"یاسر کہاں ہے۔ ہما بیٹا! یاسر کو لے کر آؤ۔"

"یاسر پہلے میرے پاس آئے گا۔" ادھر سے سنی پکارتا۔ اور جویریہ کا وہ بھتیجا تھا۔ وہ اس میں اپنے بھائی کو تلاش کرتی تھی۔

یونہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ جب اسے ہما کی طرف سے کچھ اطمینان ہوگیا کہ وہ اپنے غم سے سمجھوتہ کر کے زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے تب اس نے احسن کا گھر بسانے کا سوچا۔ ان پانچ مہینوں میں ایک بار احسن آیا تھا لیکن اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس وقت ہما کی حالت ایسی تھی کہ وہ ایک پل اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ تب احسن نے خود ہی اسے فون کیا اور اس کے معذرت کرنے پر بولا تھا۔

"مجھے یہاں آکر معلوم ہوا ماما، آپ کی بیٹی کے ساتھ بڑا سانحہ ہوا ہے۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں پھر آپ سے مل لوں گا۔ ابھی اسے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ اسے اکیلا نہیں چھوڑیں۔"

اور اب ہما نے خود کو سنبھال لیا تھا تو وہ احسن کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ صبح پہلے اسے فون کر کے معلوم

ے گی کہ اس کا کیا ارادہ ہے پھر شہناز کے پاس جائے گی۔

"کس سوچ میں ہو؟" شیراز جانے کب سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ اچانک ر کر کے اسے چونکا دیا۔ اور شیراز کیونکہ شروع سے احسن سے لاتعلق رہے تھے اس لیے اس کا کوئی معاملہ وہ ے ساتھ شیئر نہیں کرتی تھی۔ جانتی تھی کہ انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی ابھی بھی خوبصورتی سے بات بنا گئی۔

"میں ہما کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا؟"

"یہی کہ ابھی بہت کم عمر ہے اور آگے پہاڑ سی زندگی اس طرح تو نہیں گزرے گی۔" وہ بہت سنبھل کر بول تھی۔ "گو کہ فوری شادی ممکن نہیں ہے نہ ہی وہ اس پر تیار ہوگی۔ البتہ سال دو سال بعد سے سمجھایا جا سکتا ہے س کے لیے ہمیں ابھی سے سوچنا چاہیے۔"

"ہوں۔" شیراز پرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے۔ "تم سال دو سال کی بات کرتی ہو۔ میری ظر میں ابھی ایک اچھا پرپوزل ہے اور میں اس کے بارے میں تمہیں بتانا بھی چاہتا تھا۔"

"نہیں شیراز، ابھی نہیں۔" وہ ان کی پوری بات سنے بغیر بول پڑی۔ "فواد کوئی غیر نہیں آپ کی بہن کا تھا۔ اور ابھی تو آپ کی بہن کے آنسو بھی نہیں تھمے۔ ہما کو ابھی بھی وہ اپنی بہو کہتی ہیں۔ انہیں بہت دکھ ہوگا۔"

"تو کیا دو سال بعد انہیں دکھ نہیں ہوگا۔" ان کے کٹھور پن پر وہ حیران ہو کر بولی۔

"حقائق تسلیم کرنے میں وقت لگتا ہے شیراز۔ ابھی آپ کچھ نہیں سوچ سکتیں۔"

"میں تو سوچ سکتا ہوں اور میں اپنی بیٹی کی بہتری سوچوں گا۔ ضروری ہے کہ دو سال اسے یہاں بٹھا کر یہ اس دلایا جائے کہ وہ بیوہ ہے۔ جب اچھا رشتہ موجود ہے اور اسے خوشیاں مل سکتی ہیں تو ہم کیوں زبردستی ازے بند کر کے بیٹھے رہیں۔"

ان کی انتہائی درجے کی خودغرضی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی وہ ایک ماں کے کلیجے پر ہاتھ چکے تھے اور اب ایک اور ماں جو کوئی غیر نہیں ان کی اپنی سگی بہن تھی۔ اور اس شخص کو سمجھنا بہت مشکل تھا جب س نے خاموشی اختیار کر لی تو قدرے توقف سے وہ کہنے لگے۔

"ایسا کرو تم ہما سے بات کر لو۔ اسے بتاؤ کہ۔"

"نہیں۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "میں اتنی جلدی ہما سے بات نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، اسے بہت ہوگا، دن میں کتنی بار تو وہ فواد کو یاد کر کے روتی ہے۔ ایسے میں اس سے دوسری شادی کا کہنا۔ نہیں شیراز! مجھ اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ ماں ہوں میں اس کی۔ اسے مزید دکھی نہیں کر سکتی اور نہ دیکھ سکتی ہوں۔"

"ماں ہی تو نہیں ہو تم اس کی جب ہی تمہیں احساس نہیں ہے۔ میں اسے دکھ دینے کی نہیں خوشیاں دینے کی کر رہا ہوں۔"

اف انہوں نے ایک پل میں اس کی عمر بھر کی ریاضتوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ انتہائی دکھ اور تاسف سے وہ

انہیں دیکھنے لگی۔ جبکہ دل چاہ رہا تھا، وہ ان کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چیخ چیخ کر کہے۔

"یہ کہاں کا انصاف ہے شیراز احمد! پہلے تم نے مجھے صرف ان بچوں کی ماں بنانے کے لیے میرے پیٹ کی اولاد مجھ سے دور کر دی اور اب کہتے ہو، میں ان کی ماں نہیں ہوں۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہا رباب!" وہ اس کے دیکھنے کے انداز سے قدرے چڑ کر بولے۔ "تم عورتیں خواہ مخواہ جذباتی ہو جاتی ہو۔ جاؤ ابھی ہما سے بات کر کے آؤ میں جلدی اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"آئی ایم سوری۔ یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ اگر آپ کو اتنی جلدی ہے تو آپ خود اس سے بات کر لیں۔"

وہ اس سے زیادہ خود پر ضبط نہیں کر سکتی تھی اس لیے اپنی بات کہہ کر فوراً ان کے پاس سے اُٹھ کر کمرے سے نکلنے لگی کہ انہوں نے پکار لیا۔

"رکو رباب! یہیں ٹھہرو کیا سمجھتی ہو تم میں اپنی بیٹی سے بات نہیں کر سکتا۔ ابھی تمہارے سامنے بات ہوگی۔"

جانے کیسی ضد تھی، وہ پریشان ہوگئی۔

"خدا کے لیے شیراز۔"

"ہما۔!" اس کی عاجزی نظر انداز کر کے انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے بہت اونچی آواز میں پکارا۔ تو اس نے گھبرا کر الماری کھول لی اور خود کو جیسے اس کے اندر چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"جی ڈیڈی!" شیراز کی دوسری آواز پر ہما آئی تھی اور اس کے پیچھے سنی اندر آتا ہوا تشویش سے پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے ڈیڈی! آپ۔"

"یاسر کہاں ہے؟" انہوں نے سنی کی تشویش نظر انداز کر کے ہما سے پوچھا۔

"وہ جویریہ کے پاس ہے۔ لے آؤں؟"

"نہیں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے، بیٹھو، تم بھی بیٹھ جاؤ سنی۔"

"کوئی خاص بات ہے ڈیڈی؟" سنی بیٹھتا ہوا پوچھنے لگا۔

"ہاں!" پھر اسے مخاطب کر کے بولے۔ "رباب، بتاؤ انہیں میں کیا چاہتا ہوں۔"

"میرے خدا!" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پتا نہیں یہ شخص کس جنم کا بدلہ لے رہا تھا۔

وہ جلدی سے آنسو دوپٹے کے پلو میں جذب کر کے پلٹی اور ساری ہمتیں یکجا کر کے بولی۔

"جو آپ چاہتے ہیں، وہ ممکن نہیں ہے۔"

"یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے، صاف کہو کہ تم نہیں چاہتیں۔"

ان کے طنز آمیز تیز لہجے پر وہ ہونٹ بھینچ کر دونوں بچوں کی طرف سے رخ موڑ گئی۔ تو سنی باپ کو ٹوکتے ہوئے بولا۔

"ڈیڈی! آپ کیوں ممی کو پریشان کر رہے ہیں۔ جو بھی بات ہے، آپ خود کہہ دیں۔"

"میں ہما کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔" شیراز نے ایک دم دھماکہ کر دیا اور جانے کیسا دھماکا تھا کہ جس کی کوئی واز نہیں تھی۔ وہ اسی طرح رُخ موڑے منتظر کھڑی تھی۔ ابھی ہما روئے گی احتجاج کرے گی...... لیکن اس کے لس چند لمحوں کے توقف سے ہما کی پُرسکون آواز سنائی دی۔

"مجھ سے شادی کرنے والے تو بہت ہوں گے ڈیڈی! لیکن ایسا شاید کوئی نہیں ہوگا جو میرے ساتھ میرے بچے کو بھی قبول کرے۔"

رباب درز دیدہ نظروں سے شیراز کو دیکھتی ہوئی اپنی جگہ سن ہوگئی۔ شاید یوم حساب آگیا تھا۔

"ہما ٹھیک کہہ رہی ہے ڈیڈی۔ اگر آپ اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی ایسا شخص تلاش کریں جو صرف ں کا شوہر ہی نہیں بچے کا باپ بھی بن سکے۔"

سنی نے ہما کی تائید کرتے ہوئے کہا تو شیراز قدرے جھنجلا کر بولے۔

"بچے کا کیا مسئلہ ہے۔ بچہ ہمارے پاس رہے گا۔"

"نہیں۔ میں اپنے بچے کو ایک پل کے لیے بھی اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکتی۔ اس یقین کے باوجود کہ مجھ سے بہتر ممی اس کی پرورش کر سکتی ہیں۔" ہما کا لہجہ ہنوز پرسکون تھا۔

"لیکن بیٹا! یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ابھی آپ نے خود کہا تھا کہ یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اگر آپ میرے بچے کے لیے باپ تلاش ر سکیں تو ٹھیک ورنہ میری شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔"

ہما حتمی انداز میں کہتی اُٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے اس سے بولی تھی۔

"آپ تو ماں ہیں ممی! آپ سمجھائیں ڈیڈی کو۔"

اور وہ اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے بھی ہما کی طرف پلٹنے میں ناکام رہی تھی۔ پھر جب سنی بھی اُٹھ کر چلا گیا تب وہ بیڈ کے قریب جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔

"اسٹوپڈ، نان سنس۔" شیراز جھنجلا رہے تھے۔ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میں نے کہا بھی تھا اتنی جلدی نہیں کریں۔ آپ کو انتظار کرنا چاہیے۔"

"کس بات کا؟"

"وقت کا۔ کیونکہ ابھی ہما ناسمجھ ہے، نادان ہے۔ سمجھتی ہے بچے کے سہارے زندگی گزارے گی۔ اور یہ حقیقت اسے وقت سمجھائے گا کہ صرف بچے کا سہارا کافی نہیں ہوتا۔ تب ہماری بات ہی اس کی سمجھ میں آئے گی کہ بچے کو ہمارے پاس چھوڑ دینا بہتر ہے۔"

وہ کہیں پیچھے بھٹکتی ہوئی بول رہی تھی۔ شیراز نے اسے دیکھا تھا کہ فوراً نظریں چرا گئے۔

اور اس نے انصاف اوپر والے پر چھوڑا تھا۔ تو اس نے خوب انصاف کیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ کاش اس وقت وہ سوچ سکتی کہ والدین کی خطاؤں کا کفارہ اولاد کو ادا کرنا پڑتا ہے تو کبھی انصاف نہ مانگتی۔ یا پھر ہما اور

سنی کے لیے اس کے دل میں اتنی محبت اور مامتا نہ ہوتی تو آج اس انصاف پر وہ صرف خوش ہی نہیں شیراز کو دیکھ کر قہقہے لگاتی۔ اور طنز کے ساتھ چیلنج کرتی۔

''لاؤ تو کوئی ایسا شیراز احمد جو ہما کو اس کے بچے سمیت قبول کرے۔ گو کہ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے لیکن تمہیں تمہارے ہی جیسا داماد ملے گا۔ ہاہا۔'' لیکن وہ ماں تھی صرف ماں۔ جسے یقین تھا روز محشر اس کے نام سے ایک نہیں تین بچے پکارے جائیں گے اور تینوں اسی کے پاس آئیں گے۔

اور اس کے برعکس شیراز بوکھلائے ہوئے تھے۔ غالباً انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں وہ انہیں جتا نہ دے کہ جیسا انہوں نے اس کے ساتھ کیا، آج ان کی بیٹی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور یہ محض ان کے دل کا چور تھا جو وہ ہما کی شرط کے مطابق رشتہ ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں سے ان کا میل جول بڑھ گیا تھا۔ روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔ یا کوئی آ رہا ہے یا شیراز اسے ساتھ لے کر کسی کے ہاں جا رہے ہیں۔ وہ سچ مچ پریشان ہو گئی کیونکہ ان چکروں میں احسن کا معاملہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔

اس روز مجبوراً اسے ان کے سامنے احسن کی بات چھیڑنی پڑی۔ اس وقت وہ اسے شام کا پروگرام بتا رہے تھے کہ وہ معذرت کرتی ہوئی بولی۔

''سوری شیراز! آج مجھے شہناز کی طرف جانا ہے۔ ایک سال ہونے کو آ رہا ہے، ابھی احسن کی شادی طے نہیں ہو پائی۔''

''احسن!'' انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر سوچتے ہوئے انداز میں پوچھنے لگے۔ ''میں تو جب سے یہاں آیا ہوں احسن کو نہیں دیکھا۔ کہاں ہوتا ہے؟۔''

''لاہور۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''وہاں کیا کر رہا ہے؟۔''

''جاب! میں اس کے پاس گئی تو تھی۔ سنی اور ہما کی شادی کے بعد۔'' اس نے یاد دلایا۔

''اچھا ہاں۔ تم گئی تھیں تو ابھی تک شادی نہیں ہوئی اس کی۔'' پہلی بار احسن سے متعلق بات کو طول دے رہے تھے۔ وہ بڑے شوق سے بتانے لگی۔

''شہناز کی بیٹی مریم کے ساتھ اس کی نسبت طے کی تھی اور میں تو اس وقت شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن شہناز نہیں مانی۔ اصل میں مریم کا بی اے کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد یہاں ہما کے ساتھ ٹریجڈی ہو گئی پھر یاسر کی پیدائش نے مصروف کر دیا تھا۔ یوں اب تک وہ کنوارا پھر رہا ہے۔''

''اب کنوارا نہیں رہے گا۔ میرا مطلب ہے، ہم جلدی اس کی شادی کریں گے۔'' انہوں نے کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''اسے کہتے ہیں بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔'' وہ مزید گویا ہوئے۔

''میں ناحق ہما کے لیے اتنا پریشان رہا۔ رشتہ تو گھر میں موجود ہے ہما کی شرط کے مطابق احسن اس کے بچے

کا باپ بن سکتا ہے۔''

''جی!'' وہ بری طرح چکرا گئی تھی۔

''بس تم فوراً احسن کو یہاں بلاؤ۔ اور ہما سے کہو۔''

''بس کریں شیراز! مجھ میں اس سے زیادہ برداشت کی طاقت نہیں ہے۔'' وہ دبے دبے لہجے میں چیخ پڑی۔

''کیا غلط کہا میں نے۔'' ان کی پیشانی پر بے شمار لکیریں نمودار ہو گئیں۔

''ٹھیک بھی نہیں کہا۔ میں بتا چکی ہوں کہ احسن کی نسبت مریم سے طے ہو چکی ہے پھر آپ......''

''شادی تو نہیں ہوئی ناں اور شادی اس کی ہما کے ساتھ ہی ہوگی۔'' انہوں نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ ''کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ احسن اور مریم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''یہ سب فضول باتیں ہیں۔ شادی سے پہلے کی حماقتیں۔'' انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا پھر کہنے لگے۔ ''تم احسن سے بات کرو۔ مجھے یقین ہے، وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔''

''نہیں۔ اتنی خود غرض نہیں بن سکتی میں۔ مجھے اس کی خوشیاں چھیننے کا کوئی حق نہیں۔ ساری زندگی میں نے اس کے لیے کیا ہی کیا ہے۔''

اس نے پہلے عاجزی سے کہا پھر قدرے طنز سے بولی۔

''معاف کیجیے گا شیراز احمد! آپ نے اتنے یقین سے کیسے کہہ دیا کہ وہ یاسر کا باپ بن سکتا ہے۔ وہ مرد ہے اور اس کی سوچ دوسرے مردوں سے مختلف تو نہیں ہوگی۔''

''دیکھو رباب! تم خواہ مخواہ بات کو مت الجھاؤ نہ ہی مجھ سے بحث کرو۔ تم اگر ہما کو اپنی بیٹی سمجھتی ہو تو تمہیں احسن کو اس شادی پر آمادہ کرنا ہوگا ورنہ۔''

ان کے چبھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے پر وہ بری طرح سلگ گئی۔ ''ورنہ؟۔''

''میرے گھر میں تمہارے لیے بھی گنجائش نہیں رہے گی۔'' انہوں نے ایک پل میں فیصلہ سنا دیا تو وہ حواسوں میں نہیں رہی۔

''شیراز احمد! تم انتہائی خود غرض اور چالاک آدمی ہو۔ تم نے ہمیشہ میرے کلیجے پر ہاتھ ڈال کر میری مامتا کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں جانتی نہیں۔ بہت پہلے میں نے تمہارا اصلی چہرہ دیکھ لیا تھا۔ س کے باوجود تمہارے در پر پڑی رہی تھی صرف سنی اور ہما کے لیے۔ کیونکہ انہیں میری ضرورت تھی۔''

''شٹ اپ!'' اس نے ابھی آئینہ دکھانا شروع کیا تھا کہ وہ چیخ پڑے۔ اس سے پہلے وہ بھی چیخ کر بول رہی تھی اور ان کی آوازیں سن کر ہی ہما اور سنی دستک دیے بغیر اندر آ گئے تھے۔

''کیا ہوا امی؟۔'' سنی نے بڑھ کر اس کے کانپتے وجود کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تو وہ چیخ کر بولے۔

''ہٹ جاؤ سنی، چھوڑ دو اسے یہ تمہاری ماں نہیں ہے۔''

''اف۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا، تب بھی شیراز خاموش نہیں ہوئے۔

''اس نے تمہیں جنم نہیں دیا۔ تمہیں جنم دینے والی بہت پہلے ہما کی پیدائش پر ہی۔''

''ہم جانتے ہیں۔'' سنی اور ہما نے ایک ساتھ اتنے سکون سے کہا کہ وہ ایک دم ہاتھ نیچے گرا کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تب سنی اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر کہنے لگا۔

''جب ہم پاکستان آئے تھے اسی وقت پھوپھو نے ہمیں بتایا تھا اور ان سے بھی ہم نے یہی کہا تھا کہ ممی ہمارے لیے جنم دینے والی سے بڑھ کر ہیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' شیراز بری طرح تلملا رہے تھے۔

''تم اس عورت کو ماں سے بڑھ کر کہہ رہے ہو جس نے اپنی زندگی بنانے کے لیے اپنی اولاد کو چھوڑ دیا۔

''پلیز ڈیڈی۔'' سنی تاسف سے ٹوکتا ہوا بولا۔ ''آج ہما کو دیکھ کر بھی آپ کو احساس نہیں ہو رہا ہے کہ آپ نے ایک ماں کے ساتھ کتنا ظلم کیا تھا، عورت تو ہمیشہ سے مجبور اور بے بس رہی ہے۔ اگر ممی نے اپنے بچے کو چھوڑا تھا تو اس میں قصور ان کا نہیں آپ کا ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی آپ کے پاس بجز ظرف کے۔ اگر اس وقت آپ اپنا ظرف بڑا کر کے ممی کے ساتھ ان کے بچے کو بھی لے آتے تو شاید آج آپ کی بیٹی آپ کے سامنے سوالیہ نشان نہ بنتی۔ اور آج اتنے برسوں بعد آپ ممی کی وفاؤں پر شبہ کر رہے ہیں۔ کیوں؟۔''

''یہ تم اپنی ماں سے پوچھو۔'' شیراز کہتے ہوئے ان سب کی طرف سے رُخ موڑ گئے۔ تو وہ بے بسی کی تصویر بن گئی۔ شاید اس کی زندگی کا آخری امتحان تھا اور بہت سخت۔ ابھی کچھ دیر پہلے شیراز نے کہا تھا کہ اگر تم ہما کو اپنی بیٹی سمجھتی ہو تو تمہیں احسن کو ہما کے ساتھ شادی پر آمادہ کرنا ہوگا، گویا ہامی بھر کر اس کی وفائیں ثابت ہو سکتی تھیں۔

''نہیں۔'' اس نے اپنے آپ نفی میں سر ہلایا پھر شیراز کو مخاطب کر کے بولی۔ 'میں اولاد پر اپنا آپ قربان کر سکتی ہوں شیراز لیکن ایک بچے پر دوسرے بچے کی خوشیاں قربان نہیں کر سکتی۔ آپ کو اگر میری ماتا کی مزید آزمائش مطلوب ہے تو کچھ اور مانگیں۔''

''اور کیا ہے تمہارے پاس۔'' شیراز نے پلٹ کر اسے دیکھا تو ایک لمحہ کو وہ کانپ گئی پھر فوراً سر اونچا کر کے بولی۔ ''بہت کچھ۔ آپ مانگ کر تو دیکھیں، میں اگر نہ دے سکی تو۔'' ''میں دوں گا۔'' ''میں دوں گی۔''

سنی اور ہما بس اتنا سمجھ رہے تھے کہ ان کی ماں اس وقت کسی مشکل میں ہے اور وہ ہر صورت اسے مشکل سے نکالنا چاہتے تھے خواہ اس کے لیے انہیں اپنی جان کیوں نہ دینی پڑے۔ جب ہی بے تابی سے اس کی بات اچک لی۔ تو شیراز نے چونک کر باری باری ان دونوں کو دیکھا پھر ان کے درمیان کھڑی ماں کو جس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ اور بہت کوشش سے بھی وہ اپنے اندر اس سے کچھ مانگنے کا حوصلہ پیدا نہیں کر سکے۔ کیونکہ جان گئے تھے بچوں کی خاطر اس نے اپنی ہستی مٹا ڈالی، وہ اب اس پر جان وارنے کو تیار کھڑے تھے۔ جب ہی تو وہ سر اونچا کیے مسکرا رہی تھی۔

اور شیراز احمد کے اندر شکستگی کے ساتھ ندامت کا احساس بھی تھا لیکن سر اس کی عظمتوں کے اعتراف میں جھکا دیا تھا۔

تتلیوں نے رستے بدل لیے

اوپر والا بڑا بے نیاز ہے۔

واقعی جس نے سُنا اُسے اپنی سماعتوں پہ دھوکا ہوا۔ یقین کرنے والی بات بھی نہیں تھی کہ ابا میاں جو برسوں سے بیمار چلے آ رہے تھے ان کے بجائے اُوپر والے نے اچھی بھلی اماں کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

اب پتا نہیں یہ اس کی کون سی ادا تھی یا کیا مصلحت تھی کہ معصوم بچے تو ماں کی آغوش سے محروم ہوئے خود ابا میاں کی دنیا اندھیری ہو گئی۔ نیک خدمت گزار عورت، دکھ ہی دکھ کی ساتھی کیونکہ سکھ تو کبھی ملے ہی نہیں تھے اور مجال ہے جو اس عورت نے کبھی شکوہ کیا ہو۔ جس خاموشی سے سب جھیلا اسی خاموشی سے رختِ سفر باندھ گئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔ اور ابا میاں جو اپنی بیماریوں سے عاجز آ کر اکثر اپنے لیے سفرِ آخرت مانگتے تھے اس پر شریکِ سفر کو روانہ کر کے واپس گھر لوٹے تو دونوں بچے آٹھ سالہ مہرو اور پانچ سالہ اگو سہمے ہوئے ایک کونے میں بیٹھے تھے اور وہاں موجود خواتین یوں باتوں میں مصروف تھیں جیسے دوبارہ کبھی مل بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔

ابا میاں نے وہیں سے دونوں بچوں کو پکارا تو ان کی آواز سنتے ہی عورتوں کی چلتی ہوئی زبانیں رُک گئیں۔ کچھ دیر کے لیے ایک دم سناٹا چھا گیا۔ مہرؔ اگو کا ہاتھ پکڑے عورتوں کے درمیان میں سے گزرتی ہوئی ابا میاں کے پاس آئی تو انہوں نے چارپائی پر بیٹھ کر دونوں کو اپنے دائیں بائیں بٹھا لیا اور ان کے گرد بازوؤں کا گھیرا

ڈال کر رونے لگے۔ تب عورتوں کو مرنے والی پر رشک اور رونے والے پر رحم آیا۔ باری باری تعزیت کے ساتھ خدا کی مرضی کہتی ہوئی چلی گئیں۔

اور وقت ہر دکھ کا مداوا نہیں کر سکتا کچھ دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی شدت میں ہر نئے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ جیسے ابا میاں صبح آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی اماں کے نہ ہونے کو ہر گزرے دن سے زیادہ محسوس کرتے۔ بلکہ اب تو انہیں یوں لگتا تھا۔ جیسے اماں کے ہوتے انہیں کوئی دکھ تھا ہی نہیں زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ اب صبح کے آغاز کے ساتھ ہی کتنی فکریں۔ بچوں کو ناشتا کرانا، انہیں اسکول پہنچانا پھر کام پر جانا تو وہاں یہ فکر کہ بچے اسکول سے واپس آ کر اکیلے کیسے رہیں گے، انہیں کھانا کون دے گا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ابھی مہینہ ختم نہیں ہوا تھا کہ جیب خالی ہوگئی۔ اماں پتا نہیں کیسے ان کی تنخواہ میں پورا مہینہ کھینچ جاتی تھیں۔ اور اسی میں اُن کی دوا دارو بھی ہو جاتی تھی۔ جبکہ وہ سارا مہینہ بس حساب ہی کرتے رہ گئے۔ دوا کے پیسے نکل کے نہیں دیئے۔ ایک تو دمے کے مریض تھے دوسرے جوڑوں کا درد، دوا میں ناغہ ہوا تو مریض شدت اختیار کرنے لگا۔ اور اب تو وہ اوپر والے سے ابدی سکون بھی نہیں مانگ سکتے تھے کہ بچوں کے لیے بہر حال جینا تھا۔

وہ اس وقت صرف آٹھ سال کی تھی، نا سمجھ بچی، پھر بھی اسے ابا میاں پر بہت رحم آتا۔ بے چارے کتنی مشکل سے اس کے اور اکو کے لیے روٹی پکاتے تھے۔ شام میں تھکے ہارے آتے پھر بھی اس کی اور اکو کی پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹنے میں لگ جاتے۔ اس روز پہلی بار اسے خیال آیا کہ اگر وہ اور اکو کھیلتے ہوئے اتنی چیزیں نہ پھیلائیں تو ابا میاں کام سے آ کر آرام سے لیٹ سکتے ہیں۔ اور اگلے روز سے ہی اُس نے اپنے خیال پر عمل شروع کر دیا۔

''نہیں اکو! فرش پر تکیہ مت گھسیٹو، میلا ہو جائے گا تو کون دھوئے گا۔ کاغذ مت پھیلاؤ۔ ابا میاں کو جھاڑو لگانا پڑے گی پھر انہیں زیادہ کھانسی ہوتی ہے۔''

ایک دو دن سمجھا سمجھا کر اکو کو ٹوکتی رہی اس کے بعد چھوٹے موٹے کام خود کرنے لگی کیونکہ اکو ابھی بہت چھوٹا تھا یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ زیادہ تنگ آتا تو اماں اماں کر کے رونے لگتا پھر اسے چپ کرانا بہت مشکل ہوتا تھا۔

پھر ابھی ماں کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے کہ آس پڑوس کی خواتین نے ابا میاں کو...... گھر میں عورت کی ضرورت کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ اور اس ضرورت کو خود ابا میاں بہت اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اپنی بڑھتی ہوئی بیماریوں اور گرتی ہوئی صحت سے خائف تھے۔ بچوں کی خاطر بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹ رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ دوسری عورت کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔

لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب انہیں سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ ظاہر ہے آس پڑوس کے لوگ کب تک ساتھ دیتے۔ بچے بالکل اکیلے ہوگئے تھے اور انہی کی خاطر وہ عقد ثانی پر مجبور ہوئے۔

□

شمشاد بیگم بہت عام سی شکل وصورت کی مالک اور عمر کی بھی اچھی خاصی تھیں اس لحاظ کے برعکس وہ بہت چھچھوری نکلیں ابتدائی دنوں میں ہی ہر آئے گئے کے سامنے اس قسم کی باتیں کرتیں۔

''کیسی کھوٹی قسمت ہے میری، سارے خواب ٹوٹ گئے۔ بیمار بڈھا میرے پلے پڑا۔ اوپر سے دو بچے۔ اب بتاؤ بھلا میں ان بچوں کی اماں لگتی ہوں؟''

انہوں نے اماں کو نہیں دیکھا تھا ورنہ کبھی ایسی بات نہ کرتیں بہر حال محلے کی عورتوں کے ہاتھ ایک دلچسپ مشغلہ آ گیا تھا۔ اپنے گھروں کے کام نمٹا کر بڑی فراغت سے شمشاد بیگم کے پاس آ بیٹھتیں۔ اور مزے لینے کی خاطر بظاہر ہمدردی جتا کر کوئی نہ کوئی عورت چھیڑ دیتی۔

''شمشاد بیگم! تمہیں تو اچھا شوہر مل سکتا تھا۔''

بس شمشاد بیگم شروع ہو جاتیں۔ یوں جیسے سولہ سترہ سال کی لڑکی کے ارمانوں کا خون ہوا ہو۔ لمبی لمبی آہوں کے ساتھ اپنے خوابوں کا تذکرہ پھر تعبیر نہ ملنے کا دکھ اور اُن کے منہ پر تو عورتیں اُن کے دکھ پر آبدیدہ ہو جاتیں لیکن گھر جا کر خوب ہنستیں۔

یہ صحیح ہے کہ خواب کسی کی جاگیر نہیں ہیں نہ ان کے دیکھنے پر پابندی اور نہ ہی عمر کی کوئی حد مقرر ہے لیکن گزرتا ہوا وقت اپنے ساتھ بہت کچھ لے جاتا ہے سنہرے ماہ وسال کے ساتھ البیلے خواب بھی رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آنکھیں حقیقت دیکھنے لگتی ہیں۔ واجبی سی شکل وصورت اور ڈھلتی ہوئی عمر میں یونانی شہزادے کا تصور سراسر حماقت ہے اس لحاظ سے شمشاد بیگم احمق ترین خاتون تھیں۔ مزید ستم ظریفی آس پڑوس کی عورتیں صرف تفریح لینے کی غرض سے آجاتیں۔

کوئی اللہ کی بندی انہیں انہیں سمجھاتی کہ بی بی خواب دیکھنے کی عمر نکل گئی اب ان پر کڑھنے کے بجائے اپنے گھر کو دیکھو، معصوم بچے تمہاری توجہ کے طالب ہیں اور قسمت سے اس عمر میں شوہر مل گیا ہے تو اس کی بھی قدر کر لو۔ لیکن کسی اللہ کی بندی نے انہیں کوئی اچھی بات سمجھانے کی کوشش نہیں کی اس کے برعکس، ''تمہارے ساتھ بہت بُرا ہوا۔'' اور شمشاد بیگم نے کبھی اپنی عقل سے کام نہیں لیا۔ عورتوں کی باتوں میں آ کر سچ مچ زہریلی ناگن بن گئیں۔

بچوں کے ساتھ روایتی سوتیلی ماؤں سے بھی بُرا سلوک۔ بس نہیں چلتا تھا گھر سے ہی نکال دیں۔ اور شوہر کا بھی کوئی خیال نہیں۔ ان کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ وہ دوسروں کے ساتھ اچھا کیوں کریں اب بھلا اس میں بچوں اور ابا میاں کا کیا قصور انہیں زبردستی تو اٹھا کر نہیں لائے تھے۔

وہ کم عقل عورت یہ نہیں سوچتی تھی اور بے چارے ابا میاں کا جینا عذاب ہو گیا تھا اس وقت کو پچھتاتے جب اس عورت کو گھر میں لائے تھے سارا کچھ ہی الٹ ہو گیا تھا۔ بچوں کے لیے تو چلو کہا جا سکتا تھا کہ سوتیلی ماں تھی۔ لیکن وہ تو انہیں بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں ایسے ایسے القاب سے نوازتیں کہ وہ دنگ رہ جاتے پھر ہمہ وقت کم آمدنی اور اُن کی بیماری کا طعنہ اس کے بعد اپنی قسمت کو کوسنے بیٹھ جاتیں اور ابا میاں فطرتاً شریف انسان تھے ورنہ ایک بار تو ضرور انہیں ان کی اوقات یاد دلا دیتے بے چارے اپنی شرافت میں مارے جا رہے تھے۔ پھر بچوں کا خیال تھا جو سارا دن ان کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔ حالانکہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ان معصوموں کے

ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ بہرحال پہلے اگر بُری گزر رہی تھی تو اب اس سے بھی بُری جیسی تیسی زندگی تو گزارنی ہی تھی۔

اور صرف مہرو ہی نہیں، اکو بھی اس عورت کے آنے سے بہت جلدی سمجھ دار ہو گیا۔ حالانکہ ان کی عمروں میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن جس طرح شمشاد بیگم انہیں اپنے اشاروں پر چلاتیں اس سے وہ وقت سے پہلے ہی نا صرف سمجھ دار بلکہ اپنی عمر سے بڑے بڑے کام بھی کرنے لگے تھے۔ روٹی پکاتے ہوئے کتنی بار مہرو کا ہاتھ جلتا لیکن وہ اُف تک نہیں کرتی تھی۔ نہ اپنے زخموں کے نشان ابا میاں کو دکھاتی۔

وہ صابر ماں کی صابر بچی تھی سارے دکھ خاموشی سے جھیلنے والی اس کے باوجود جس روز شمشاد بیگم نے اس کا اسکول جانا بند کروایا تو بظاہر تو وہ خاموش رہی لیکن اس کے معصوم دل میں گرہ سی پڑ گئی، اور یہیں سے اس نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو شمار کرنا سیکھ لیا۔

اس کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ ایک تو لڑکی دوسرے شمشاد بیگم کے رعب میں دبی ہوئی، اگر اپنے ساتھ کی کوئی سہیلی ہوتی تو اس سے دکھ سکھ کہہ کر اس کے دل کا کچھ بوجھ تو ضرور ہلکا ہو جاتا۔ لیکن شمشاد بیگم نے کبھی اسے کسی سے بات ہی نہیں کرنے دی نتیجتاً اگلے پانچ چھ سالوں میں اس کے اندر ایسا الاؤ بھر گیا جو باہر نکلنے کی راہ ڈھونڈنے لگا لیکن فی الحال کوئی راستہ نہیں تھا۔ کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا اکو کے ساتھ خوب باتیں کرے لیکن وہ بُری صحبت کا شکار ہو کر اس سے بہت دور ہو گیا تھا۔ اتنی سی عمر میں سگریٹ نوشی اور آوارہ لڑکوں کے ساتھ گلی میں کھڑے ہو کر ہر آئے گئے خصوصاً لڑکیوں پر آوازیں کسنا۔

اپنے ماحول سے فرار کا شاید سب سے آسان راستہ یہی تھا، اور شمشاد بیگم اُسے مزید شہ دیتیں اُس کی غلط حرکتوں پر ہنستیں...... اس لیے اس کے اور ابا میاں کے ٹوکنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور ایسے بھائی سے وہ اپنے دکھ سکھ کیا کہتی جو مزید اس کے دکھوں میں اضافہ کر رہا تھا۔ الٹا اس کا مذاق بھی اُڑاتا۔

''یہ تو کیا ہر وقت رونی شکل بنائے رکھتی ہے۔'' بڑی بہن کا کوئی لحاظ نہیں تھا جیسے باہر لڑکوں کے ساتھ تو تڑاخ کرتا ویسے اس کے ساتھ۔

''اس کی شکل ہی ایسی ہے۔'' اس سے پہلے شمشاد بیگم بولتیں اور وہ فوراً ان کی تائید میں کہتا۔

''ہاں، پتا نہیں کس پر گئی ہے۔''

''ہائے ظالم۔ کیسا ماں جایا ہے تو۔'' وہ دکھ سے سوچتی۔ ''وہ وقت بھول گیا جب ایک ایک چیز کو روتا تھا اور یہ عورت تجھے دکھ دیتی تھی۔ آج اس کے ساتھ مل کر مجھ پر ہنستا ہے۔''

پتا نہیں کیا گھول کر پلایا تھا شمشاد بیگم نے اُسے کہ وہ انہی کے گن گاتا تھا۔ اُسے اور ابا میاں کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔

ان دنوں ابا میاں بالکل چارپائی سے جا لگے تھے اتنا وقت بھی پتا نہیں کیسے انہوں نے خود کو گھسیٹ لیا تھا۔ اور اب ان کی یہی آرزو تھی کہ اپنی زندگی میں اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ گو کہ ابھی اس کی عمر بھی کوئی چودہ پندرہ

سال تھی۔ لیکن ابا میاں کو اپنے بعد وہ بالکل بے آسرا نظر آ رہی تھی۔ اگر اکو ہی اس کا خیال کرنے والا ہوتا تب شاید انہیں اتنی فکر نہ ہوتی لیکن اب وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اُسے اپنے گھر کا کر دیں۔ اس رات وہ شمشاد بیگم سے کہہ رہے تھے۔

''میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، جانے کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ اس سے پہلے اگر مہرو کی شادی ہو جائے تو۔ سُو تم اس کے لیے کوئی اچھا بر دیکھو۔''

''اچھا بر'' شمشاد بیگم بے حد طنز سے کہنے لگیں۔ ''بڑے میاں! اس غریبی میں تو کوئی برا بھی نہیں ملے گا تمہاری لڑکی کو۔''

''ایسا نہ کہو شمشاد بیگم! کیا غریبوں کی لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ تم کوشش تو کرو۔''

ابا میاں کی اس قدر عاجزی پر اس کا دل تڑپ گیا۔ تکیے میں منہ چھپانا چاہتی تھی کہ شمشاد بیگم کی آواز آئی۔

''کوشش تو جب کروں، جب تمہارے پلے کچھ ہو۔ خالی لڑکی لے جانے کوئی نہیں آئے گا۔ لوگ ساتھ جہیز بھی مانگتے ہیں۔ بغیر جہیز کے تو ایسا ہی ملے گا جیسے مجھے ملا۔''

شمشاد بیگم کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں اور ابا میاں کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس عورت سے مزید کچھ کہنا فضول تھا۔ انہوں نے چارپائی پر اپنی معصوم بیٹی کو دیکھا پھر کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔

اور وہ سوئی کہاں تھی۔ آنکھوں پر بازو رکھے سانس روک کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ کچی عمر کی لڑکی، ابھی اپنی شادی کے ذکر پر دل نے نئے انداز سے انگڑائی لی تھی کہ شمشاد بیگم کی بات پر سہم کر رہ گئی اور گو کہ ابھی وہ زندگی کے اسرار و رموز سمجھتی تھی نہ زمانے کے چلن سے واقف لیکن اس عورت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور یہ بھی کہ شمشاد بیگم کبھی اس کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتیں۔

اُسے بہت دکھ ہو رہا تھا، کاش ابا میاں اس سے شادی نہ کرتے تو وہ اتنی تنہا نہ ہوتی اور کوئی نہیں تو اپنا سگا بھائی تو تھا۔ اس عورت نے کتنی چالاکی سے اُسے اپنی مٹھی میں کر لیا تھا کہ نہ اُسے بہن کا خیال تھا نہ ابا میاں کا یہی سب سوچتی وہ جانے کب نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔



صبح اٹھنے کے ساتھ ہی اس کے معمول کے کام شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے ناشتا بنا کر وہ ابا میاں کو دینے آنگن میں آئی تو اُجالا ہونے کے باعث شمشاد بیگم اپنا تکیہ اٹھا کر اندر جا رہی تھیں۔ روزانہ وہ یہی کرتی تھیں کمرے میں جا کر پھر سو جاتیں، اس کے بعد دن چڑھے اُٹھتی تھیں اکو بھی اپنی مرضی سے اٹھتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے جب تک یہ دونوں سوئے رہتے گھر میں خاموشی اور سکون رہتا تھا اور اسی وقت وہ ابا میاں سے کچھ باتیں بھی کر لیتی تھی۔ اس وقت اُن کے سامنے ناشتا رکھ کر وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ اور بہت خاموشی سے اُن کے چہرے پر رات کی باتوں کا عکس تلاش کرنے لگی۔ لیکن اُن کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا جس پر وہ ابھی حیران ہو رہی تھی کہ اچانک وہ اُسے دیکھ کر بولے۔

"بیٹی! تم بھی کھالو۔"

"میں کھالوں گی ابامیاں! ابھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"اچھا دیکھو میرا کوئی کپڑا دھلا ہو تو نکال دو۔" ابامیاں نے روٹی کا نوالہ چائے میں ڈبوتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر اندر آ گئی اور بہت احتیاط سے بکس میں سے کپڑے نکال کر واپس آئی تو ابامیاں چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالہ رکھتے ہوئے بولے۔

"جلدی سے ازار بند ڈال دو، مجھے ایک کام سے جانا ہے، تمہاری ماں کے اٹھنے سے پہلے نکل جاؤں۔"

"آپ کیسے جائیں گے ابا! آپ سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔" وہ کچھ رک کر بولی۔

"چل لوں گا بیٹی! چل لوں گا۔"

ابامیاں کہتے ہوئے نل پر جا کر ہاتھ دھونے لگے پھر آ کر اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر غسل خانے میں چلے گئے تو وہ ناشتے کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں آ گئی۔ ادھر وہیں سے اس نے ابامیاں کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اور اُسے عجیب عجیب سے وہم آنے لگے، دل چاہا اکو کو جھنجھوڑ کر اٹھائے کہ ابامیاں کے پیچھے جائے۔ پتا نہیں کہاں جا رہے ہیں ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتے۔ کہیں راستے میں گر نہ جائیں۔

پریشان ہو کر اکو کے کمرے میں آئی بھی لیکن اُسے اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ کیونکہ وہ اس قدر اکھڑ اور بدتمیز تھا کہ اس کی پریشانی سمجھنے کے بجائے اسے گالیاں دینے لگتا۔ سوئے ہوئے اکو پر اس نے تاسف بھری نظر ڈالی پھر بوجھل قدموں سے باہر آئی اور لکڑی کی سیڑھی پر بہت احتیاط سے چڑھتی ہوئی چھت پر آ کر ابامیاں کو دیکھنے لگی۔ وہ گلی کے نکڑ پر پہنچ چکے تھے۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے تب بھی وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ کتنی دیر گزر گئی یکا یک اُسے اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا تو چونک کر جیسے ہی گردن موڑی، برابر کی چھت پر وہ جو کوئی بھی تھا۔ بہت اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر کھل کر مسکرایا تو وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ ایک کمرے میں شمشاد بیگم سو رہی تھیں، دوسرے میں اکو اور وہ کچن میں یوں چھپ کر بیٹھ گئی جیسے ابھی بھی وہ دیکھ رہا ہو۔

دل پتے کی طرح لرز رہا تھا، دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اس نے پیشانی گھٹنوں پر ٹکائی اور کتنی دیر تک ایسے ہی بیٹھی رہی۔ جب شمشاد بیگم نے اندر سے پکار کر ناشتے کا پوچھا تب اس نے سر اونچا کیا اور جلدی سے چولہا جلا کر چائے گرم کرنے لگی۔

سارا دن وہ عجیب سی کیفیت میں گھری رہی کبھی ابامیاں کے لیے پریشان ہوتی۔ کبھی اس کا خیال آتا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا اور اس کے ڈھیلے ڈھالے انداز پر شمشاد بیگم کتنی بار اس پر چلائیں۔

شام میں ابامیاں آئے تو جہاں ان کی طرف اطمینان ہوا وہاں اُن کی حالت دیکھ کر وہ بہت پریشان ہو گئی۔ وہ آتے ہی چارپائی پر گر گئے اور ان کے سینے سے خرخر کی آواز آنے لگی۔

"ابامیاں! پانی پی لیں۔"

وہ پانی کا گلاس لے کر ان کے قریب آ کھڑی ہوئی تو انہوں نے لیٹے لیٹے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا کچھ پانی حلق میں ٹپکایا باقی پورا گلاس اپنے منہ پر ڈال لیا۔ تبھی شمشاد بیگم اندر سے نکل کر آئیں۔ اور کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں

"تمہیں اس حالت میں بھی چین نہیں ہے کہاں چلے گئے تھے۔"

"کام سے گیا تھا۔" ابامیاں جواب دیتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کرتے کے دامن سے چہرہ صاف کرنے لگے۔

"کون سے کام سے۔؟" شمشاد بیگم کا انداز بہت تیکھا تھا جیسے کسی بچے پر جرح کر رہی ہوں۔ اور اس سے ابامیاں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی تھی جب ہی وہاں سے چلی آئی۔



پھر اُسے معلوم ہوا ابامیاں نے کہیں ملازمت کر لی ہے۔ حالانکہ ان کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی غربت اور بیماری نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اور ریٹائرمنٹ بھی لے لی تھی کیونکہ کام پر جانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ گزر اوقات کے لیے بس ایک پنشن کا سہارا تھا یا پھر وہ تھوڑی بہت سلائی کڑھائی کر لیتی تھی۔ اب دوبارہ ملازمت گو کہ ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن صرف اس کی خاطر کہ کچھ پیسے جوڑ کر وہ اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ حقیقتاً انہیں اس کی بہت فکر تھی۔ اور اس روز شمشاد بیگم کی بات کہ بغیر جہیز کے اسے میرے جیسا ہی ملے گا، ان کے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔ جب ہی اپنی بیماری کی پروا کیے بغیر وہ کام پر جانے لگے، مہینہ ختم ہوا تو شمشاد بیگم سر پر کھڑی ہو گئیں۔

"لاؤ کتنی تنخواہ ملی ہے؟"

"جتنی بھی ملی ہو، تمہارے لیے نہیں ہے۔" ابامیاں کے کورے جواب پر وہ تلملا کر بولیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، مہرو کے لیے کر رہا ہوں اس کی شادی ہو جائے۔"

"اس کی شادی تک ہم بھوکے بیٹھے رہیں؟" شمشاد بیگم درمیان ہی میں بول پڑیں۔

"بھوکے کیوں، اللہ کا شکر ہے دال روٹی چل رہی ہے۔"

"تو کیا ساری زندگی اسی دال روٹی پر گزارا ہو گا نہیں بڑے میاں! بہت ہو گئی، سیدھی طرح پیسے نکالو۔"

شمشاد بیگم کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی ان پر جھپٹ پڑیں گی۔ اور پہلی بار اُس نے ابامیاں کو اچانک اتنا غصے میں آتے دیکھا۔

"دور ہٹ جاؤ شمشاد بیگم! بہت برداشت کر لیا ہے میں نے تمہیں۔"

"تم نے۔ ارے میرا حوصلہ ہے میں تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔" شمشاد بیگم ان سے زیادہ زور سے چلائیں اور واویلا مچانے لگیں۔ "قسمت خراب ہے میری، بیمار بڈھا پلے پڑا۔ ہائے ایک دن خوشی کا نصیب نہ

ہوا۔ کیا کیا سوچا تھا۔ میرا تو کوئی ارمان پورا نہ ہوا۔‘‘

’’بس خاموش ہو جاؤ۔‘‘ چلانے سے ابا میاں کی سانس اکھڑ گئی۔ سینہ پکڑ کر کھانسنے لگے، تو وہ جلدی سے پانی لے کر آ گئی اور گلاس ابا میاں کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

’’غصہ نہیں کریں ابا! پیسے دے دیں اماں کو۔‘‘

’’نہیں بیٹی! مجھے تیرے لیے جہیز جمع کرنا ہے نہیں تو۔‘‘

’’ہا۔ آ۔ ں۔‘‘ شمشاد بیگم کی لمبی ہاں میں ابا میاں کی آواز دب گئی اور وہ بے حد طنز سے بولیں۔

’’جہیز جمع کرنا ہے اس کے لیے ورنہ اسے بھی میرے جیسا ملے گا۔ واہ بڑے میاں خوب انصاف ہے تمہارا۔‘‘

’’بکواس بند کرو۔ شمشاد بیگم!۔‘‘ ابا میاں گلاس پھینک کر کھڑے ہو گئے۔ ’’شرم نہیں آتی ہے تمہیں معصوم بچی کا مقابلہ کرتی ہو۔ اور میں کیا زبردستی تمہیں بیاہ کر لایا تھا، جا کر پوچھو اپنے بھائی بھاوج سے خود کہلوایا تھا انہوں نے مجھے۔ الزام دینا ہے تو انہیں خو جا کر دو جنہوں نے تمہیں بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔ اور بہت ظلم ہوا ہے ناں تمہارے ساتھ تو جاؤ نکل جاؤ۔ مجھ بیمار بڈھے کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔‘‘

’’ہاں، اب کاہے کو تمہیں میری ضرورت ہوگی، بچے بڑے ہو گئے۔‘‘

اس بار شمشاد بیگم کی آواز میں طنطنہ نہیں تھا۔ کیونکہ اندر ہی اندر خائف ہو گئی تھیں، ابا میاں نے حقیقت جو بیان کر دی تھی۔ اور یہی سچ تھا کہ ایک تو معمولی شکل و صورت دوسرے عمر بھی زیادہ۔ اُن کے بھائی بھاوج نے خود ابا میاں سے کہلوایا تھا۔ دونوں سخت پریشان تھے۔ خصوصاً بھاوج سے اُن کی بنتی بھی نہیں تھی۔ اب اگر ابا میاں نے نکال دیا تو بھاوج تو ہرگز گھر میں نہیں گھسنے دیں گی اور وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے ڈھیلی پڑ گئیں۔ اور ابا میاں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

’’بچے تمہارے بغیر بھی بڑے ہو سکتے تھے۔ بلکہ تم نے تو اور آ کر انہیں تباہ کر دیا۔ پڑھنے سے انہیں اٹھا دیا۔ اکو ہے تو وہ۔‘‘

’’اب سارا الزام میرے سر رکھ دو۔‘‘

وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ تو ابا میاں کتنی دیر تاسف میں گھرے بیٹھے رہے پھر اس کی موجودگی کا احساس کر کے بولے۔

’’بیٹی! کچھ کھانا ہو تو لے آؤ۔‘‘

وہ چپ چاپ کچن میں چلی گئی۔ کھانا لا کر ان کے سامنے رکھا پھر چھت پر سے کپڑے اتارنے کا خیال آیا تو ابا میاں سے کہہ کر اوپر چلی آئی۔ اس جھگڑے نے اُسے بہت مضمحل کر دیا تھا۔

دھیرے دھیرے تار پر سے کپڑے اتار رہی تھی کہ ایک چھوٹا سا کنکر اس کی پیٹھ میں آن لگا۔ وہ سچ مچ ڈر گئی، پلٹ کر دیکھا تو برابر کی چھت پر وہ کھڑا اشارے سے اُسے قریب بلا رہا تھا اس کا دل خوفزدہ انداز میں دھڑکنے لگا

ور سہمی ہوئی نظروں سے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ تب وہ دیوار کے قریب آ کر دھیمی آواز میں پوچھنے لگا۔

’’سنو تم مہرو ہو ناں؟۔‘‘

’’اُف یہ تو نام بھی جانتا ہے۔‘‘ اس نے سوچا اور جلدی جلدی کپڑے سمیٹ کر جانے لگی کہ وہ عاجزی سے بولا۔

’’مہرو! رکو مہرو! میری بات سُنو۔‘‘ اس نے پہلے نیچے جھانک کر دیکھا پھر پلٹ کر اُسے دیکھا تو وہ اسی طرح آواز دبا کر بولا۔

’’دور نہیں۔ یہاں آؤ، تم نے مجھے پہچانا نہیں میں رشید ہوں۔‘‘

’’رشید۔‘‘ اس کی آنکھوں میں پہچان کی ہلکی سی چمک کے ساتھ حیرت سمٹ آئی اور بالکل غیر ارادی طور پر دو قدم اس کی طرف بڑھ کر رک گئی۔ تو وہ مسکرا کر بولا۔

’’پہچان لیا۔؟‘‘ اس کا سر آہستہ سے اثبات میں ہلا پھر وہ کہنے لگا۔ ’’میں نے اُسی روز تمہیں پہچان لیا تھا۔ اس کے بعد روزانہ یہاں آ کر تمہیں دیکھتا ہوں لیکن تم نظر ہی نہیں آتیں کسی کسی وقت آنگن میں تمہاری ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔‘‘

’’میں جاؤں۔‘‘ اُسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں پیچھے سے کوئی آ نہ جائے اس لیے جیسے ہی وہ خاموش ہوا فوراً بولی۔

’’پھر آؤ گی؟ میں تمہارا انتظار کروں گا۔‘‘ وہ کچھ نہیں بولی۔ پلٹ کر احتیاط سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آئی اور ابا میاں کو کھانے میں مصروف دیکھ کر کچھ مطمئن سی ہو کر دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی اور کپڑے تہ کرنے لگی۔ جبکہ دھیان اُس کی طرف تھا اور وہ حیران ہو رہی تھی کبھی اس بات پر کہ رشید نے اُسے پہچان لیا اور کبھی اس بات پر کہ وہ اسے کیوں نہیں پہچان سکی۔ گو کہ کل کی بات نہیں تھی۔

درمیان میں ماہ و سال تھے پھر بھی بچپن کا وہ وقت جب اماں زندہ تھیں اس نے رشید کے ساتھ کھیلتے گزارا تھا۔ اور جب اماں کا انتقال ہوا اس وقت بھی اس کا بچپن ہی تھا لیکن شمشاد بیگم نے آتے ہی نہ صرف اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا بلکہ کسی کو آنے بھی نہیں دیتی تھیں، یوں ماہ و سال کی گرد میں سارے چہرے دھندلا گئے اور اس وقت اپنے بچپن کے ایک ساتھی کو دیکھ کر اسے انجانی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ کاش وہ اس سے جی بھر کر باتیں کر سکتی۔

رات دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ صبح ابا میاں کے کام پر جاتے ہی وہ اوپر چلی جائے گی۔ شمشاد بیگم اور اکو تو یوں بھی دیر سے اٹھتے تھے تب تک وہ آرام سے رشید کے ساتھ باتیں کرے گی۔ اس سے اور سب کے بارے میں پوچھے گی۔ خصوصاً اس کی بہنیں ہاجرہ، صابرہ، اور اس کی اماں۔

پہلے تو سب کا بہت آنا جانا تھا اور اماں کے انتقال کے بعد بھی رشید کی اماں آتی تھیں لیکن پھر شمشاد بیگم کی چھچھوری باتوں کی وجہ سے انہوں نے آنا چھوڑ دیا اور اپنے بچوں کو بھی ادھر آنے سے منع کر دیا تھا۔

دو چار گھر ہی ایسے تھے جنہوں نے شمشاد بیگم کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی ورنہ تماش بین قسم کی عورتیں ابھی بھی فراغت سے آتی تھیں۔

بہر حال اس رات وہ نیند آنے تک رشید کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔ اور صبح ابا میاں کے جاتے ہی دروازہ اچھی طرح بند کر کے اوپر چھت پر آئی تو وہ پہلے سے موجود تھا اپنے معمول کے مطابق ایکسرسائز میں مصروف۔ اُسے دیکھا تو فوراً دیوار کے قریب چلا آیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

''مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی۔'' اور وہ جو رات اتنا کچھ سوچ کر سوئی تھی کہ اس سے یہ کہے گی وہ پوچھے گی ایک لفظ کیوں تک نہیں کہہ سکی بس ذرا سی پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

''کچھ بولو مہرو! کل بھی تم یونہی چپ چاپ چلی گئیں۔''

اُس کے لہجے میں جانے کس جذبے کی شدت تھی۔ آنکھیں الگ بولتی ہوئی لگ رہی تھیں، وہ بہت گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ دل کیوں اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا ہے اور اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بول سکی۔

''میں جاؤں؟''

''آئی کیوں تھیں؟'' اُس کی گھبراہٹ پر وہ شریر ہو کر بولا۔

اور اُس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو نیچے جھانک کر دیکھنے لگی۔ قدرے توقف سے وہ پکار کر پوچھنے لگا۔

''سنو، کیا بہت ڈرتی ہو اپنی اماں سے؟'' وہ کچھ نہیں بولی۔ تو خود ہی کہنے لگا۔ ''بہت ظالم عورت ہے۔ تمہیں کہیں نکلنے نہیں دیتی اور اکو کو کتنا بدتمیز بنا دیا ہے، اُس نے، تم سمجھاتی ہو اکو کو۔ سارا وقت آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا ہے۔''

''وہ میری نہیں سنتا۔ دو ایک بار میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ اتنی بدتمیزی پر اتر آیا...... کہ میں نے آئندہ کے لیے کان پکڑ لیے۔''

''اماں نے سر چڑھایا ہوا ہے اُسے۔''

''میں جانتا ہوں، اور تم دیکھ لینا ابھی اکو اس عورت کو سیدھا کرے گا۔ ابھی تو چھوٹا ہے ناں اس کی باتوں میں آ جاتا ہے۔'' وہ اس کی بات سمجھ کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ پھر ایک نظر اپنے آنگن میں ڈال کر بولی۔

''ابھی اماں اُٹھ جائیں گی، میں جاؤں؟''

''پھر آؤ گی ناں؟'' پھر وہی دل کو بے قابو کر دینے والا انداز۔ وہ جلدی سے ہاں کہہ کر نیچے اتر آئی۔

شاید وقت اُس پر کچھ مہربان ہو گیا تھا، کہ دکھ درد بٹانے کو ایک ساتھی مل گیا۔ روزانہ ابا میاں کے جاتے ہی وہ چھت پر چلی جاتی، جہاں وہ سارے دکھ بھول جاتی، زندگی میں بھی کشش نظر آنے لگی تھی اور وہ جو ہمہ وقت پژمردہ سی رہتی تھی تو اب ایسا نہیں تھا۔

دن بھر سارے کام بڑے آرام سے نمٹا لیتی، اور جب رات میں سونے کے لیے لیٹتی تو سارے دن کی تھکن کے باوجود فوراً اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ پلکیں موند کر کتنی دیر تک اُسے سوچتی، اُس کے تصور سے باتیں کرتی، اور جب نیند مہربان ہوتی تو خوابوں کی گلیوں میں بھی وہ ہر موڑ پر موجود ہوتا تھا۔ گو کہ ابھی وہ کچی عمر کی نادان لڑکی تھی پھر بھی اُس کی آنکھوں کی ساری تحریر پڑھ لیتی تھی۔

اس کے بعد سارا دن اپنے آپ سوچ کر مسکراتی رہتی اور شمشاد بیگم نے کیونکہ کبھی اُسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے ابھی تک بے خبر تھیں، ورنہ اُس کے بدلتے انداز دیکھ کر نہ صرف چونکتیں، ٹھٹھک جاتیں بلکہ کھوج لگانے کے بعد اس کی زندگی کو مزید جہنم بنا دیتیں۔ بہر حال اُن کی بے توجہی زندگی کے اس موڑ پر اس کے لیے غنیمت تھی، کہ ہر وقت کے جلنے کڑھنے سے نجات مل گئی تھی۔ اُس وقت وہ بڑی سادگی سے اُس سے کہہ رہی تھی۔

''پتا ہے رشید! تم نہیں تھے تو میں بہت اُداس اور پریشان رہتی تھی، اور ہر وقت اپنے مرنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ لیکن اب میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''میں تمہیں مرنے دوں گا بھی نہیں۔'' وہ ایک انگلی سے اُس کی ناک چھو کر پیار سے بولا۔ تو وہ ایسی ہی سادگی سے پوچھنے لگی۔

''اور اگر میں مر جاؤں تو؟''

''تو میں بھی مر جاؤں گا۔''

''ہائے نہیں۔'' اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا تو وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

''پگلی! ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''اب نہیں کروں گی۔''

''اچھا دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' وہ کرتے کی سائیڈ والی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ پھر سرخ سبز کانچ کی چوڑیاں اُس کے سامنے رکھیں تو وہ خوش ہو کر بولی۔

''میرے لیے۔'' پھر فوراً ہی خوشی کی جگہ اُداسی نے لے لی۔ ''میں کیا کروں گی ان کا۔''

''پہنو گی، لاؤ ہاتھ ادھر کرو میں پہنا دوں۔'' اُس کا ہاتھ تھامنے کے لیے اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں اماں دیکھ لیں گی، بہت ماریں گی، اور میرے ہاتھ بھی کاٹ دیں گی۔'' وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی، اور وہ بھی سمجھتا تھا اس لیے پہننے پر اصرار نہیں کیا۔

''اچھا لے تو لو۔ رکھ دینا کہیں چھپا کر۔'' اس نے چوڑیاں لے لیں، اور نیچے آ کر اپنے بکس میں کپڑوں کی تہوں میں چھپا کر رکھ دیں۔

❑❑❑

یونہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے، اُس روز پھر اُس نے سنا ابا میاں، شمشاد بیگم سے اُس کے لیے کوئی

اچھالڑکا دیکھنے کی بات کر رہے تھے، جواب میں شمشاد بیگم طنز سے بولیں۔

''لگتا ہے، بہت پیسے اکٹھے کر لیے ہیں تم نے۔''

''کیسی کم عقلی کی باتیں کرتی ہو شمشاد بیگم! معمولی نوکری ہے کہاں سے بہت پیسے اکٹھے کرلوں گا۔'' ابامیاں، اُن کے طنز کو محسوس کرنے کے باوجود نرمی سے بولے تاکہ کسی طرح انہیں رام کر سکیں۔

''معمولی نوکری، معمولی پیسے، لڑکا بھی معمولی ہی ملے گا۔ اچھے لڑکوں کو کوئی کمی تھوڑی ہوتی ہے۔'' اُن کے صاف جواب پر ابامیاں عاجزی سے بولے۔

''میری لڑکی میں کیا کمی ہے، ماشاء اللہ اچھی شکل وصورت، نیک، سگھڑ ہے۔''

''یہ سب کون دیکھتا ہے آج کل۔'' شمشاد بیگم کو جیسے موقع مل جاتا تھا۔ ہر لحاظ سے ابامیاں کو کمتر ثابت کرنے کا۔ اور ابامیاں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ واقعی اس عورت سے کوئی اچھی امید رکھنا فضول تھا۔ تب بھی دیر بعد وہ خود ہی کہنے لگیں۔

''میں نے آس پڑوس کی عورتوں سے کہہ رکھا ہے کوئی اچھا رشتہ ہوگا تو ضرور بتائیں گی۔'' اس بار ابامیاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید انہیں یقین تھا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہیں۔ اور یقین تو اُسے بھی تھا، پھر بھی وہ کچھ پریشان سی ہوگئی، اور اگلے روز رشید کے سامنے رو پڑی۔

''اماں میرا بیاہ کسی بڈھے کے ساتھ کردیں گی۔''

''یہ کس نے کہا تم سے؟'' وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

''اماں خود ابامیاں سے کہہ رہی تھیں کہ اُن کے پاس میرے بیاہ کے لیے پیسے نہیں...... اس لیے کوئی بڈھا ہی مجھ سے شادی کرے گا۔'' اُس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا، تو وہ کچھ دیر تک اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اُسے تسلی دینے کی خاطر بولا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا، تم روؤ نہیں۔'' اُس کے آنسو تھم گئے اور یونہی چپ چاپ اُسے دیکھنے لگی۔ تو قدرے توقف سے وہ پوچھنے لگا۔

''تمہاری اماں کو ابھی سے تمہاری شادی کی کیا فکر ہے۔؟''

''اماں کو نہیں، ابامیاں کو فکر ہے، اتنے بیمار جو رہتے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی تو کتنی دیر تک وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچتا رہا، پھر ایسے ہی پُرسوچ انداز میں بولا۔

''ٹھیک سوچتے ہیں تمہارے ابامیاں۔ یقیناً تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں گے۔''

''ہاں، اور اماں انہیں اور پریشان کرتی ہیں۔ جب بھی وہ میری شادی کی بات کرتے ہیں تو اماں کہتی ہیں اس غریبی میں کوئی اچھا بر نہیں ملے گا، اسی لیے تو ابامیاں پھر سے کام پر جانے لگے ہیں۔ وہ میرے لیے بہت سارے پیسے جمع کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بتاتے ہوئے بہت آزردہ ہو رہی تھی۔ تب وہ اُس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''پگلی! تم کیوں اتنی پریشان ہوتی ہو۔ میں ہوں ناں۔ آج ہی اپنی اماں کو تمہارے ابامیاں کے پاس بھیجوں گا۔'' وہ کچھ بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن ابامیاں کے پاس ابھی اتنے پیسے جمع نہیں ہوئے۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے صرف تمہاری پروا ہے، تم سے شادی کرنی ہے مجھے پیسوں سے نہیں۔''

وہ بہت سنجیدگی سے اُسے سمجھاتے ہوئے بولا، اور اُس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ صبح کی ہلکی ہلکی سنہری دھوپ میں اُس کے گالوں پر لالی اُتر آئی تھی۔

رشید نے سچ مچ اُسے جیسے نئی زندگی دے دی تھی، سارے خوف، سارے اندیشے دم توڑ گئے، اور اس روز وہ بہت مگن سی ہوگئی۔

شام میں جب رشید کی اماں آئیں اُس وقت ابامیاں کام سے نہیں لوٹے تھے، اور اتنے سالوں بعد وہ انہیں پہچان نہیں سکی، گو کہ اُن کی آمد کا پتا تھا پھر بھی کشش و پنج میں کھڑی تھی، تب ہی شمشاد بیگم طنزآمیز لہجے میں اُن سے بولیں۔

''اتنی مدت بعد راستہ کیسے بھول گئیں بڑی بی؟''

''تم نے بھی تو کبھی آ کر نہیں جھانکا، پھر کاہے کو گلہ کر رہی ہو۔'' انہوں نے کہا۔ پھر اُسے قریب بلا کر کہنے لگیں۔

''مجھے پہچانا نہیں مہرو! میں صابرہ کی اماں ہوں۔''

''خالہ......!'' وہ اُن سے لپٹ گئی۔ ''آپ تو آتی نہیں ہیں۔''

''آ تو گئی ہوں......'' انہوں نے اُس کی پیشانی چوم کر کہا پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ ''تمہارے ابامیاں کہاں ہیں؟''

''وہ تو ابھی کام سے نہیں آئے۔ آپ بیٹھیں ناں۔ آئیں اندر چلیں۔''

''نہیں بیٹھ جاتی ہوں۔'' وہ آرام سے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ اور وہ بھی ان کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی لیکن شمشاد بیگم نے ایسی خشمگیں نظروں سے گھورا کہ وہ سہم کر باورچی خانے میں چلی آئی اور تسلے میں دال نکال کر بظاہر وہ چننے میں مصروف ہوگئی۔ جب کہ سارا دھیان انہی کی طرف تھا، اور وہ ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں شمشاد بیگم کچھ اُلٹا سیدھا نہ بول دیں۔ دل ہی دل میں ابامیاں کے آنے کی دعا کرنے لگی۔ تبھی شمشاد بیگم وہیں سے اُسے مخاطب کر کے بولیں۔

''کہاں چلی گئیں مہرو! چائے کا پانی رکھا کہ نہیں۔''

اور وہ اسی انتظار میں تھی۔ فوراً دال کا تسلا ایک طرف رکھ کر کیتلی میں پانی ڈالنے لگی، تبھی باہر کا دروازہ کھلنے کے ساتھ ابامیاں کے کھانسنے کی آواز آئی تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور آرام سے چائے بنانے میں لگ گئی۔

اس دوران غالباً ابا میاں اور رشید کی اماں ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے میں لگے رہے، اصل بات اسی وقت شروع ہوئی، جب وہ چائے لے کر آئی اسے دیکھتے ہی رشید کی اماں کہنے لگیں۔

''میں مہرو کے لیے آئی ہوں۔ رشید، ماشاءاللہ کام سے لگ گیا ہے۔''

اس کے لیے وہاں رُکنا ممکن نہیں تھا۔ جلدی سے چائے کی ٹرے اُن کے سامنے رکھ کر دوبارہ کچن میں آ گئی اور بہت احتیاط سے جھانک کر ابا میاں کو دیکھا وہ جیسے شادی مرگ کی کیفیت میں تھے۔ اُس کی طرح انہیں بھی شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ سچ مچ خدا نے اُن کی سُن لی ہے۔ اُن پر مہربان ہو گیا ہے، اور اس خوشی میں پتا نہیں انہیں الفاظ نہیں مل رہے تھے، یا بولا نہیں جا رہا تھا۔ جبکہ رشید کی اماں اپنی آمد کا مقصد واضح بیان کر کے اب اُن کے جواب کی منتظر بیٹھی تھیں۔ اور شمشاد بیگم کے گویا سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ کسی طرح بھی اپنی ناگواری چھپا نہیں سکیں کہنے لگیں۔

''سوچ لو بڑی بی! ہمارے پاس مہرو کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' ابا میاں نے تڑپ کر شمشاد بیگم کو دیکھا، پھر اس خیال سے کہ کہیں رشید کی اماں اپنا سوال واپس نہ لے لیں فوراً کہنے لگے۔

''کیوں نہیں۔ مہرو کو دینے کے لیے میرے پاس یہ مکان ہے۔ میں اس کے نام لکھ دوں گا۔'' شمشاد بیگم بری طرح تلملا گئیں لیکن مصلحتاً اس وقت خاموشی اختیار کر لی۔ جبکہ رشید کی اماں کہنے لگیں۔

''نہیں بھائی صاحب! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس مہرو کو مجھے دے دیں۔''

''مہرو آپ ہی کی ہے۔'' ابا میاں نے ہامی بھر لی رشید کی اماں کچھ دیر اور بیٹھ کر چلی گئیں اور شمشاد بیگم تو ان کے جانے ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ طوفان مچایا کہ خدا کی پناہ۔

''ایک مہرو ہی تمہاری اولاد ہے باقی کسی کا کچھ حق نہیں کماتے بھی اسی کے لیے ہو، مکان بھی اسے لکھ دو گے تو ہم کہاں جائیں گے۔ ارے میرا نہیں تو کچھ اکو کا خیال کرو۔ وہ تو تمہاری اولاد ہے، اُسے کیوں دربدر کرتے ہو۔''

شمشاد بیگم کو چپ کرانا بہت مشکل تھا۔ ابا میاں نے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''خدا کے لیے شمشاد بیگم! مت شور مچاؤ۔ سنا نہیں تم نے رشید کی اماں کو کسی چیز کا لالچ نہیں۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں میاں صاحب دیکھنا عین وقت پر کھڑی ہو جائیں گی کہ مکان لکھ کر دو۔ تم نے یہ بات منہ سے نکالی کیوں۔''

''تمہاری وجہ سے، کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی، کہ ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں۔''

''تو غلط تو نہیں کہا۔''

''پھر میں نے بھی غلط نہیں کہا۔ مجھے مہرو کی شادی کرنی ہے ہر قیمت پر۔ میں اپنی بچی کو تمہارے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ارے شمشاد بیگم! تم کوئی ڈھنگ کی عورت ہوتیں تو میرے بچوں کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتیں۔ تب تو میں بھی تمہارا خیال کرتا۔'' ابا میاں بھی جب بولنے پر آتے تو اگلا پچھلا سارا حساب برابر کر دیتے

تھے۔

''اب کیا خیال کروں تمہارا، تم تو ابھی بھی یہ چاہتی ہو کہ مہرو کا ہاتھ کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں تھما دوں، کبھی تم نے اس کے لیے اچھا نہیں سوچا۔ تم اس کی ماں نہیں ہو تو کیا، ایک عورت تو ہو، پھر اتنی سفاک کیوں ہو، اکو کو بھی بگاڑ کر رکھ دیا۔ پتا نہیں کس جنم کا بدلہ لیا ہے تم نے مجھ سے، اور میرے بچوں سے۔''

''واہ میاں! اچھا صلہ دے رہے ہو، خدا سمجھے گا تم سے۔''

شمشاد بیگم پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئیں۔ حقیقتاً مزید سننے کا حوصلہ نہ تھا۔ کیونکہ ابا میاں کی کوئی بات جھٹلا نہیں سکتی تھیں۔ اور اس رات جہاں ابا میاں اطمینان سے سوئے، وہاں وہ ستارے کی کہکشاؤں پہ سفر کرتی رہی تھی۔

موسم کافی بدل گیا تھا، خصوصاً رات میں کچھ خنکی بڑھ جاتی تھی۔ اس لیے سب کمرے میں سونے لگے تھے، وہ کچھ دیر بے خبر سوئے اکو کو دیکھتی رہی، پھر بنا کوئی آہٹ کیے کمرے سے نکل آئی۔ چاندنی میں بھیگی رات نصف سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ وہ آنگن میں کھڑی ہو کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ دل چاہ رہا تھا اسی وقت سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی جائے اور پھر وہاں سے رشید کو پکارے۔ لیکن اُس کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہر سو پھیلی خاموشی اور سناٹے میں اپنی دھڑکنوں کی آواز ہی پراسراری لگ رہی تھی۔ معاً ابا میاں کے کھانسنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔



اگلے دن رشید کے سامنے وہ بہت لجائی ہوئی تھی، رخساروں پر جھکی پلکیں اُٹھ کے نہیں دے رہی تھیں، اور وہ ہونٹوں میں شوخ مسکراہٹ دبائے شوق سے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس کے چہرے پر آئی لٹ کو ہلکے سے جھٹکا دے کر بولا۔

''اب تو نہیں روؤ گی ناں۔ بولو۔''

''نہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''پتا ہے۔ میری اماں تو کل تمہیں دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ کہہ رہی تھیں۔ مہرو بڑی ہو کر کتنی پیاری ہو گئی ہے۔ اور پتا ہے کیا کہہ رہی تھیں۔۔؟''

وہ اُس کی طرف جھک کر بولا۔ تو اُس نے ذرا سی پلکیں اٹھائیں۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں شوخی دیکھ کر فوراً جھکا لیں، اور کچھ منہ پھلا کر بولی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔''

''اور کیسے دیکھوں۔''

''مجھے نہیں پتا......'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس کی طرف سے رخ موڑ گئی، تو وہ جلدی سے بولا۔

''اچھا...... لو میں آنکھیں بند کیے لیتا ہوں۔'' اس نے ذرا سی گردن موڑی، اور اُسے آنکھیں بند کیے دیکھ کر ہنستے ہوئے نیچے اُتر آئی۔ اور روزانہ کی طرح کچن میں بیٹھ کر شمشاد بیگم کے اُٹھنے کے انتظار کرنے لگی۔ وہ پہلے

وہیں سے پکار کر ناشتے کا پوچھتی تھیں۔اس کے بعد کمرے سے نکل کر منہ ہاتھ دھوتیں۔اتنے میں وہ چائے گرم کر دیتی تھی۔لیکن اُس وقت نہ تو انہوں نے پکارا نہ منہ ہاتھ دھویا۔اُٹھتے ہی دندناتی ہوئی اُس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔اور وہ جو گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے فرش پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے کسی خوبصورت خیال میں گم تھی۔ان کی اس طرح آمد پر بری طرح چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔تو وہ آنکھیں نکال کر بولیں۔

''کیوں ری کٹنی! یہ تو رشید کو کب سے جانتی ہے؟۔''

''جی۔!'' غیر متوقع سوال نے اسے بوکھلا دیا۔اور وہ مزید تیز ہو کر بولیں۔

''میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش مت کر، سچ سچ بتا، یہ بیٹھے بٹھائے رشید کی اماں کو تیرا خیال کیسے آ گیا۔پہلے تو کبھی جھانکا نہیں بڑھیا نے۔''

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رونے لگی تو شمشاد بیگم بجائے نرم پڑنے کے اُسے بالوں سے پکڑ کر کچن سے باہر گھسیٹ لائیں۔اور پیر سے چپل اتارتے ہوئے بولیں۔

''یہ گن ہیں تیرے، نامراد، معاشقے لڑاتی ہے۔''

''خدا کے لیے اماں! مت مارو مجھے، میں نے کچھ نہیں کیا۔''

وہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولی۔تبھی شور سُن کر اکو اٹھ کر آ گیا۔اور بہن کو پٹتے دیکھ کر بھی آرام سے پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا اماں؟''

''ارے اب ہونے کو رہ کیا گیا ہے۔منہ کالا کیا ہے اس نے اپنا اور ہمارا بھی۔''

شمشاد بیگم اسے پیر سے ٹھوکر مار کر ہانپتے ہوئے بیٹھیں، اور پھر اکو کی ہمدردی سمیٹنے کی خاطر دوپٹے میں منہ چھپا کر روتے ہوئے بولیں۔

''ارے لوگ تو مجھے جوتے ماریں گے کہ سوتیلی ماں تھی، جب ہی خیال نہیں رکھا، ابھی بھی مجھے ظالم سمجھتے ہیں، کہ لڑکی کو بند کر کے رکھا ہوا ہے، ارے بند رکھنے پر بھی یہ حال ہے اس کا، کھلا چھوڑ دیتی تو پتا نہیں کتنوں کو۔''

''کیا کیا ہے اس نے۔'' اکو تنک کر پوچھنے لگا۔گو کہ ابھی اس کی عمر بھی کوئی بارہ تیرہ سال تھی، لیکن آوارہ صحبت کے باعث وہ ایسی باتیں خوب سمجھنے لگا تھا۔بلکہ سمجھتا ہی صرف ایسی باتیں تھا۔

''اسی سے پوچھ۔رشید کے ساتھ اس کا کیا چکر ہے۔''

شمشاد بیگم نے کہا اور اس سے پہلے کہ اکو اُس سے کچھ کہتا۔وہ بھاگ کر کمرے میں بند ہو گئی۔پھر سارا دن وقفے وقفے سے کبھی شمشاد بیگم اور کبھی اکو اس کا دروازہ پیٹتے رہے، لیکن اُس نے نہیں کھولا۔

شام میں جب ابا میاں کی آواز سنائی دی تب وہ کمرے سے نکلی۔مسلسل رونے اور بھوک پیاس سے نڈھال ابا میاں تک آتے آتے وہ اُن کے قدموں میں گر گئی۔

''مہرو!'' ابا میاں پریشان ہو گئے، اُس کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھے اور اس کا سر اونچا کرتے ہوئے پوچھنے

لگے۔''کیا ہوا بیٹی؟''

''ابا میاں! میں مر جاؤں گی۔'' اُس کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ کر نکلے۔

''مریں تمہارے دشمن۔اُٹھو، آؤ یہاں اوپر بیٹھو۔'' ابا میاں نے اُسے سہارا دے کر اوپر بٹھایا۔پھر کندھے سے رومال اتار کر اُس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولے۔''میں جانتا ہوں شمشاد بیگم نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا۔کل سے اس عورت کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں، لیکن بیٹی! تم صبر کر لو، تھوڑے دنوں کی بات ہے۔''

اور اُس نے ابا میاں کی بات مان لی، جہاں اتنے برس وہاں کچھ وقت اور سہی۔اور وقت جانے کیوں ٹھہر گیا۔گزر کے نہیں دے رہا تھا۔گزرتا بھی کیسے راہ میں شمشاد بیگم جو دیوار بن کر کھڑی ہوگئی تھیں۔انہیں سو فیصد یقین تھا کہ رشید کی اماں کی آمد ایسے نہیں ہوئی۔اس سے پہلے ضرور اس کا کوئی چکر ہوگا۔اور اسی چکر کی کھوج میں وہ صبح اس کے ساتھ ہی اٹھنے لگیں۔کیونکہ سارا دن تو وہ اسے اپنے سامنے گھر کے کام کاج میں مصروف دیکھتی تھیں۔بس وہی وقت تھا جب اُن کے خیال میں رشید ادھر آتا ہوگا، اور یہ سچ تو تھا، لیکن کوئی اُن سے پوچھے کہ معصوم محبت کی راہ میں حائل ہو کر انہیں کیا مل رہا تھا۔کیوں اس لڑکی کو سدا تپتی دھوپ میں جھلسانا چاہتی تھیں۔

بہرحال صبح کی روپہلی کرنوں میں جو کچھ وقت رشید کی سنگت میں اپنے سارے دکھ بھول جاتی تھی۔اب پھر ایک دم تنہا ہوگئی تھی، بڑی بے قرار، بڑی مضمحل، کیونکہ جانتی تھی کہ وہ کتنی دیر اُس کا انتظار کرتا ہوگا۔اور ایسے میں یہ خیال اسے بہت سہارا دیتا تھا کہ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔



اور کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ ابا میاں پھر چارپائی سے جا لگے۔پہلے بھی وہ کام کرنے کے قابل تو نہیں تھے، لیکن صرف اُس کی خاطر کہ کسی طرح اُسے اپنے گھر کا کر دیں، جانے کیسے خود میں اتنی ہمت پیدا کر لی تھی، اور اب وہ بالکل مجبور ہو گئے تھے، ان چند مہینوں میں جو کچھ جمع کر سکے تھے، چاہتے تھے کہ اس میں اُس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔اور جب شمشاد بیگم کے سامنے بات چھیڑتے تو وہ کہتیں۔

''میاں! اس کی فکر چھوڑو، یہ تو اپنے گھر کی ہو ہی جائے گی، پہلے اپنا خیال کرو، دوا دارو کرو گے تو اچھے بھلے ہو جاؤ گے، پھر آرام سے شادی کرنا۔''

شمشاد بیگم کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔لیکن ابا میاں کو جیسے یقین تھا کہ اب دوا دارو سے انہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔اس لیے خود پر ایک پیسہ خرچ کرنے کو تیار نہیں ہو رہے تھے، بس اُسی کی فکر تھی، اور بے جا بھی نہیں تھی۔لڑکی ذات جانے اُن کے بعد شمشاد بیگم اس کا کیا حشر کریں۔

اُس روز رشید کی اماں آئیں تو دبے لفظوں میں ابا میاں نے اُن کے سامنے اپنا خدشہ بیان کر دیا۔وہ سمجھدار عورت تھیں، بظاہر ابا میاں کو تسلی دی، لیکن دل سے قائل ہو گئی تھیں۔اور انہیں فوراً شادی پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔بس یہ تھا کہ ایک جگہ اُن کی بیٹی ہاجرہ کی بات چل رہی تھی، اس لیے چاہتی تھیں کہ بات پکی ہو جائے تو پھر دو

بچوں سے ایک ساتھ نمٹ جائیں گی اور ابامیاں سے انہوں نے یہی کہا۔ ساتھ ہی اطمینان بھی دلایا کہ زیادہ دیر نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے، اس اتوار یا اگلے اتوار صابرہ کی بات طے ہوجائے، پھر انشاء اللہ اگلے مہینے کی کوئی سی تاریخ شادی کے لیے رکھ لی جائے گی۔

اور ایک مہینہ زیادہ تو نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے اوپر والا پھر بے نیازی دکھا گیا۔ کیا تھا جو ابامیاں کی حیات میں چند دن کا اضافہ کردیتا، لیکن نہیں، شاید وہ اپنا قانون نہیں بدلتا، ازل سے ابامیاں کی حیات میں جتنے دن لکھے تھے اس سے زیادہ ایک سانس نہیں۔ ابھی کل ہی تو رشید کی اماں شادی کی تاریخ رکھ گئی تھیں، صرف سات دن بعد کی اور ابامیاں یوں اطمینان کی نیند سوئے کہ پھر اُٹھے ہی نہیں۔ شاید اُس کی طرف سے مطمئن ہوگئے تھے۔

شمشاد بیگم کے بین کی آواز میں اُس کی سسکیاں دب کر رہ گئیں۔ کوئی بھی تو اپنا نہیں تھا۔ اکو بھی نہیں۔ وہ کس کے کندھے پر سر رکھتی تبھی رشید کی اماں نے اُسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے سے بھینچ لیا، اور اُس دھان پان سی لڑکی سے یہ پہاڑ ایسا دکھ سہا نہیں جا رہا تھا۔



تین دن محلے بھر کی عورتیں باقاعدگی سے آتی رہیں۔ اس کے بعد گھر ایک دم ویران ہوگیا۔ زندگی میں انسان کی قدر نہیں ہوتی۔ شمشاد بیگم کو اب پتا چلا کہ وہ بیمار بڈھا اُن کے لیے کتنا بڑا سہارا تھا۔ انہی کے دم سے وہ یہاں کی سیاہ سفید کی مالک تھیں، ابھی بھی اُن کی ملکیت کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اکو تھی میں اور مہرو کسی گنتی شمار میں نہیں تھی، لیکن دل کا چور آدمی کو چین نہیں لینے دیتا، انہیں بھی تھا...... کہ کہیں رشید کی اماں شادی کے تقاضے کے ساتھ مکان کا تقاضا نہ کردیں۔ کیونکہ ابامیاں ان کے سامنے کہہ چکے تھے۔

پھر اسی خدشے کے تحت انہوں نے ایک عورت کو رشید کی اماں کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے طور پر معلوم کرے اُن لوگوں کا شادی کا کیا پروگرام ہے۔

اور جب اُس عورت نے آکر بتایا کہ اُن لوگوں کا ارادہ مقررہ تاریخ پر نہایت سادگی سے نکاح کرکے مہرو کو لے جانے کا ہے تو شمشاد بیگم کو ایک طرح سے اپنی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی، گویا جب تک مہرو قبضے میں تھی۔ وہ محفوظ تھیں اس کے بعد اُن کا کچھ بس نہیں چل سکتا تھا۔

یہی سوچتی ہوئی وہ رات میں مہرو کے پاس آبیٹھیں پہلے اُسے گلے لگا کر خوب روئیں، پھر تسلی دی کہ اُس کے ابامیاں نہیں رہے، وہ تو ہیں۔ وہ ہرگز اُسے اور اکو کو ابامیاں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد کھانا لے کر آئیں، اور زبردستی اصرار کرکے اُسے کھلانے لگیں۔

"تین دن سے مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ پتا نہیں تم نے اور اکو نے کچھ کھایا بھی کہ نہیں۔ کھالو میری جان! ابھی اکو کو بہت مشکل سے کھلا کر آئی ہوں۔" ساتھ ساتھ بہت لگاوٹ سے بولے بھی جارہی تھیں اور اکو کے نام پر وہ پوچھنے لگی۔

"اکو کہاں ہے۔"

"زبردستی لٹا کر آئی ہوں۔ سوئے گا تو طبیعت ہلکی ہوگی، تم کھانا کھاؤ۔" پھر قدرے توقف سے آہ بھر کر بولیں۔

"ہا۔ہائے، ہمارے بھی کیا نصیب ہیں۔ کچھ دن بعد اس گھر میں خوشی کی ڈھولک بجنے والی تھی، اللہ میاں کو بھی رحم نہ آیا۔ کتنا ارمان تھا تمہارے ابا کو تمہاری شادی کا۔ ہائے ایک خوشی دیکھ لیتے۔ اپنے ہاتھوں تمہیں رخصت کرتے۔"

اُس کے آنسو جو مشکل سے رُکے تھے، پھر روانی سے بہہ نکلے۔ ہاتھ کا نوالہ گر گیا، اور جو منہ میں تھا۔ وہ حلق میں اٹک گیا۔ شمشاد بیگم نے جلدی سے پانی کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اور اُس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بولیں۔

"بس کرو۔ مت روؤ۔ ان کی روح کو تکلیف ہوگی۔" پھر گلاس نیچے رکھ کر کہنے لگیں۔ "مرنے والے کی آرزو میں پوری کروں گی۔ رشید کی اماں آئیں تو پوچھوں گی اُن سے کہ اب کیا ارادہ ہے اُن کا؟"

"ابھی نہیں اماں، ابھی نہیں۔" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

"ہاں ابھی اتنی جلدی تو نہیں ہوسکتی۔ جمعہ کی تاریخ تھی، اور جمعے تک تمہارے ابا کو آٹھ دن بھی نہیں ہوں گے۔ میں اُن سے یہی کہوں گی کہ چالیسویں تک رُک جائیں، ٹھیک ہے ناں۔"

پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے آخر میں انہوں نے اُس سے پوچھا لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے سکی، سر جھکا روئی رومال میں لپیٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اُسے سنا کر اپنے آپ سے کہنے لگیں۔

"پتا نہیں میری کوئی مانے گا بھی کہ نہیں، مجھے تو سب دشمن سمجھتے ہوں گے۔"

"نہیں اماں! ابامیاں کے بعد آپ ہی تو ہیں۔ جو آپ کہیں گی۔"

اُن کے رویے سے پسیج کر وہ اسی قدر کہہ سکی، اور شمشاد بیگم کے دل سے جیسے بھاری بوجھ سرک گیا۔ اس کا اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھیں، اب کوئی مائی کا لعل اُن کی مرضی کے بغیر اُسے نہیں لے جاسکتا تھا۔ اور اُن کی مرضی پتا نہیں کیا تھی۔ بہرحال جمعہ سے دو روز پہلے رشید کی اماں آئیں۔ خاص اسی مقصد کے لیے، رشید بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اور گو کہ بات پہلے سے طے تھی، پھر بھی وہ رُک رُک کر کہنے لگیں۔

"یہ موقع تو نہیں ہے شمشاد بیگم! لیکن کیا کریں، مجبوری ہے، پھر مرنے والے کی یہی آرزو تھی کہ مہرو جلد سے جلدی اپنے گھر کی ہوجائے، اچھا ہے اُن کی روح خوش ہوجائے گی۔"

شمشاد بیگم اُن کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھیں، پھر بھی آہ بھر کر بولیں۔

"ہاں، میں نے بھی یہی سوچا ہے کہ چالیسویں کے بعد مہرو کو رخصت کردوں گی۔" رشید کی ماں نے کچھ بوکھلا کر بیٹے کو دیکھا، پھر اُس کے اشارے پر کہنے لگیں۔

"نہیں شمشاد بیگم! جو تاریخ مقرر ہے اسی پر نکاح ہوجائے تو اچھا ہے۔ اور ہم کوئی دھوم دھڑکا تو کریں گے

نہیں، بہت سادگی سے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں بڑی بی!" شمشاد بیگم ٹوکتے ہوئے بولیں۔ "جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اس کے باپ کو مرے ہوئے، اور آپ شادی کی بات کررہی ہیں کچھ خدا کا خوف کریں۔ ابھی تو ہماری لڑکی کے آنسو نہیں تھمے غم سے نڈھال پڑی ہے۔"

"ہم اُس کے دکھ کو سمجھتے ہیں۔"

"خاک سمجھتے ہیں۔ اگر سمجھتے تو اتنی جلدی یہ بات نہ چھیڑتے۔"

"پھر کیا کریں۔"

"انتظار اگر کرسکتے ہیں تو ورنہ کوئی زبردستی نہیں ہے۔"

اس حتمی اور صاف جواب پر ماں بیٹا ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ اگر مہرو کی سگی ماں اس طرح بات کرتی تو یہ ماں بیٹا اپنی توہین سمجھتے ہوئے اٹھ کر چل دیتے لیکن شمشاد بیگم سے اچھی طرح واقف تھے، اور رشید کو تو یقین تھا کہ وہ رکاوٹ ضرور ڈالیں گی۔ اس لیے ساتھ آیا تھا۔ کچھ دیر اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد شمشاد بیگم سے کہنے لگا۔

"آپ مہرو کو بلائیں۔ میں اُس سے بات کرتا ہوں۔"

"کیوں میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ یا تم سمجھتے ہو، میں اُس کی مرضی کے خلاف کچھ بول رہی ہوں۔"

شمشاد بیگم تنک کر بولیں۔ پھر فوراً اونچی آواز میں مہرو کو پکارا تو رشید جو اُن کی بات کا جواب دینے جارہا تھا۔ ہونٹ بھینچ کر اس سمت دیکھنے لگا۔ جدھر سے وہ آرہی تھی۔ پہلے ہی دھان پان سی تھی، اب تو بالکل ہی مرجھا گئی تھی۔ شدتِ گریہ سے سوجی ہوئی آنکھیں پپڑی زدہ ہونٹ، غم واندوہ کی تصویر بنی وہ شمشاد بیگم کے قریب سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ تو وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولیں۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا میری کون مانے گا۔ لو اب تم خود بتاؤ انہیں، پرسوں تمہاری ڈولی جانے کی بات کررہے ہیں۔ میں نے چالیسویں کے بعد کا کہا تو مان نہیں رہے۔"

اور وہ کیا کہتی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گود میں گرنے لگے، تو شمشاد بیگم اُس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر خود بھی رونے لگیں، پھر اسی طرح روتے ہوئے بولیں۔

"قیامت ٹوٹی ہے ہم پر، میرا سہاگ اُجڑا۔ بچے یتیم ہوگئے۔ کسی کو احساس ہی نہیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔"

"تمہارا احساس کرکے ہی آئی ہوں شمشاد بیگم! لڑکی کے فرض سے نمٹ کر آرام سے ہو جاؤ گی۔" رشید کی اماں اُن کی مکاری پر اندر ہی اندر جز بز ہوتی مصلحت کا دامن تھام کر بولیں۔

"ٹھیک کہا بڑی بی، لیکن یہ بھی تو سوچو، دنیا کیا کہے گی، باپ کو مرے ابھی آٹھ دن نہیں ہوئے۔"

اور رشید کی اماں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب اس عورت سے کس طرح بات کریں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہرگز نہیں مانے گی، اور جس طرح مہرو کو ساتھ لگائے بیٹھی تھی، اس سے سمجھ گئیں کہ بظاہر ہمدردی جتا کر نادان لڑکی پر گرفت کر چکی ہے، کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے آپ کچھ سوچتی رہیں۔ پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے شمشاد بیگم! جیسے تمہاری مرضی ہم پھر چالیسویں کے بعد تاریخ رکھ لیں گے۔"

پھر انہوں نے رشید کو چلنے کا اشارہ کیا تو وہ بہت بے دلی سے کھڑا ہوا، اور ایک نظر روتی ہوئی مہرو پر ڈال کر ماں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ تب شمشاد بیگم اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

"بیٹی! اگر میں نے کچھ غلط کہا ہو تو ابھی بتادو۔ کیونکہ میری عقل تو کام نہیں کررہی۔ کہیں رشید کی اماں ناراض ہی نہ ہوگئی ہوں۔"

اور مہرو کیا جانے اس عورت کے دل میں کیا ہے بظاہر جو دیکھا سُنا وہی ٹھیک تھا۔ جب ہی فوراً بولی۔

"نہیں اماں! آپ نے کچھ غلط نہیں کہا۔ رشید کی اماں کو خود خیال کرنا چاہیے تھا۔ ابھی ابا میاں۔"

اس کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں پھر آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ تو شمشاد بیگم دل ہی دل میں بہت مطمئن ہوکر اسے تسلی دینے لگیں۔

غم تازہ ہو تو پھر واقعی کوئی دوسری بات اچھی نہیں لگتی۔ اُسے رشید کا خیال آتا ضرور تھا۔ لیکن پھر اُس پر ابا میاں کا دکھ حاوی ہو جاتا۔ کیونکہ رشید کے ساتھ ہی اُسے پہلا خیال یہی آتا کہ اگر ابا میاں کچھ دن اور زندہ رہتے تو...... اور یوں اُس کا خیال پس منظر میں چلا جاتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اُسے رشید سے محبت نہیں رہی تھی۔ بس کچھ وقت کی بات یعنی دکھ کی شدت میں کمی آنے کی دیر تھی پھر تو وہی اُس کے لیے سب کچھ تھا۔

اُس رات سوتے میں اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی جانے پیاس کی شدت یا گھٹن کے باعث۔ ابا میاں کے بعد تینوں ایک ہی کمرے میں سونے لگے تھے، اور اس وقت رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ دروازہ کھڑکی بند، گھپ اندھیرا، کچھ دیر تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی، کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ گہری خاموشی میں انو اور شمشاد بیگم کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، اور اپنے سینے میں اُسے چبھن کا احساس ہوا، تب بہت احتیاط سے اُٹھ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا، اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اندر کی گھٹن سے کسی حد تک نجات ملی، تب پیاس بجھانے کا خیال آیا۔ پہلے اُس نے سوچا شمشاد بیگم کو اُٹھا دے کیونکہ آنگن میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن وہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ تب ڈرتے ڈرتے وہ آنگن میں آئی اور مٹکے میں سے پانی نکال رہی تھی کہ ہشت کی آواز پر گلاس اُس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ بہت خوفزدہ ہوکر بھاگنے کو تھی کہ چھت پر سے رشید نے بہت دھیمی آواز میں پکار کر کہا۔

"مہرو! اوپر دیکھو، میں ہوں۔" اس نے ایسی ہی خوف زدہ نظروں سے دیکھا تو وہ اوپر آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ اور وہ پریشان ہوگئی، کبھی کمرے کی طرف دیکھتی، کبھی اُسے، جبکہ اندر دل مچلنے لگا تھا۔ تب بہت ہمت کرکے وہ سیڑھیاں چڑھ آئی اور جیسے ہی دیوار کے قریب پہنچی اُس نے اس تیزی سے اُس کا ہاتھ تھاما جیسے اُس کے پلٹ

جانے کا خدشہ ہو، پھر آپ ہی آپ شکوہ لبوں تک آ گیا۔

"بہت ظالم ہو تم مہرو! تمھیں میرا کوئی خیال نہیں، کتنا انتظار کرتا ہوں میں تمہارا صبح اور ساری ساری رات یہیں کھڑا رہتا ہوں۔"

"میں نہیں آ سکتی۔ وہ اماں......"

"مجھے پتا ہے وہ تمہاری پہرے دار بنی ہوئی ہے۔" وہ جل کر بولا۔ پھر ایک دم خود پر قابو پا کر نرمی سے کہنے لگا۔ "تم بہت بے وقوف ہو مہرو۔ مجھے ہر وقت تمہاری طرف سے دھڑ کا لگا رہتا ہے۔ یہ جو شمشاد بیگم تمہاری بڑی ہمدرد بنی ہوئی ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ بڑی مکار عورت ہے دیکھا نہیں ہماری شادی کو کیسے ٹال دیا۔"

"وہ تو ابا میاں۔"

"کوئی اُسے تمہارے ابا میاں کا غم نہیں محض ڈھونگ رچا رہی ہے، اس کا مقصد صرف ہمارے راستے میں رکاوٹ ڈالنا ہے اور دیکھنا مہینے بھر بھی وہ تمہاری شادی کرنے پر تیار نہیں ہوگی۔ لیکن مہرو اُس وقت تم میرا ساتھ دینا، پھر میں خود سب سنبھال لوں گا۔ بولو ساتھ دو گی ناں۔" وہ سراسیمہ کھڑی اُس کی بات سن اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر میں اُس نے ہاتھ دبا کر پوچھا تو وہ ذرا سا چونک کر بولی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے، تم پتا نہیں کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"ڈرو مت، سمجھنے کی کوشش کرو، اور سنو اگر کسی وقت بھی شمشاد بیگم سے کوئی خطرہ محسوس کرو، تو بے دھڑک میرے گھر چلی آنا۔" اب پتا نہیں وہ ٹھیک طرح سے اُسے سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ یا وہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ بہر حال اُس کا مقصد اُسے ہوشیار، خبردار کرنا تھا۔ اور وہ پریشان ہو گئی۔

"مجھے جانے دو کہیں اماں کی آنکھ نہ کھل جائے۔"

"پھر آؤ گی ناں۔ ضرور آنا میں روز انتظار کروں گا۔"

اس کی آس میں اصرار شامل ہو گیا تو اس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا، پھر اُس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر نیچے چلی آئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو کچھ دیر تک بغور شمشاد بیگم اور اکو کو دیکھتی رہی۔ پھر اطمینان ہونے کے بعد اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔



پھر اگلے تین چار روز اسے رشید کے پاس جانے کا بالکل موقع نہیں ملا۔ کیونکہ شمشاد بیگم کے کوئی عزیز کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے تھے، تعزیت کے لیے ادھر آئے تو شمشاد بیگم نے انہیں یہیں روک لیا۔ اور ایک تو رات میں دیر تک شمشاد بیگم ان کے ساتھ باتیں کرتی رہتیں۔ دوسرے اُن کا بہنوئی برآمدے میں سوتا تھا، جس کی وجہ سے اگر وہ کسی ضرورت کے تحت بھی اٹھنا چاہتی تو نہیں اُٹھ سکتی تھی۔

اپنے ہی گھر میں وہ بس ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

پانچویں روز غالباً اُس کی طرف سے مایوس ہو کر رشید خود چلا آیا۔ اور جب اُس نے گھر میں شمشاد بیگم کے

تین چار مہمانوں کو دیکھا تو جہاں اُس کی مجبوری سمجھ گیا، وہاں اُسے سخت ناگوار بھی گزرا۔ کیونکہ یہاں اُس کی ہونے والی بیوی تھی۔ اور شمشاد بیگم اُس کی سگی ماں نہیں تھی۔ جس کے رشتہ داروں سے اس کا دور کا بھی رشتہ نہیں نکلتا تھا۔ ایک طرح سے بالکل غیر اور اجنبی لوگ اور اُس کی غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی کہ مہرو اُن کے درمیان رہے۔

باتوں باتوں میں جب اُس نے شمشاد بیگم کو جتایا کہ گھر میں جوان لڑکی کی موجودگی میں اس طرح لوگوں کا آنا جانا مناسب نہیں ہے، تو وہ تنک کر بولیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا، اب کیا تم میرے رشتے داروں کے آنے جانے پر پابندی لگاؤ گے، اور تم ہوتے کون ہو میرے گھر کے معاملے میں دخل دینے والے۔"

"اس گھر میں جب تک مہرو ہے، میں ضرور دخل دوں گا۔ اس کے بعد جو آپ کا دل چاہے کریں۔" وہ مصلحتاً بھی خاموش نہیں رہ سکا، اور برابر سے جواب دیا تو وہ طنز سے بولیں۔

"ارے واہ میاں! تم تو ابھی سے مہرو پر حق جتانے لگے۔"

"حق رکھتا ہوں، جب ہی جتا رہا ہوں۔ آپ براہ مہربانی اپنے رشتہ داروں کو چلتا کریں، یا پھر مجھے اجازت دیں۔ ابھی چار گواہ لا کر اپنی امانت لے جاؤں۔"

اُس کے مضبوط لہجے پر شمشاد بیگم ذرا ٹھٹکیں پھر فوراً پینترا بدلتے ہوئے بولیں۔

"اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، ذرا صبر نہیں تم میں۔"

"بات صبر کی نہیں عزت و غیرت کی ہے۔" اُس نے کہا تو شمشاد بیگم خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگیں پھر کتنی دیر بعد اُس سے بولیں۔

"ٹھیک ہے میرے رشتہ دار یہاں نہیں رہیں گے۔ اور تم اماں کو میرے پاس بھیجو، میں اس کے ساتھ اگلے جمعہ کی تاریخ پکی کر لیتی ہوں۔ لے جاؤ اپنی امانت اور سُن لو اس کے بعد تم اس گھر کے کسی معاملے میں دخل نہیں دو گے۔"

وہ فوراً کچھ نہیں بول سکا، کیونکہ درمیانی دن شمار کرنے لگا تھا۔ ایک تو کل جمعہ تھا، اس کے بعد اگلا جمعہ، درمیان میں کوئی زیادہ دن نہیں تھے، وہ مطمئن ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا، پھر جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگا۔

"میں مہرو سے مل لوں۔"

"نہیں......" شمشاد بیگم جس انداز سے مسکرائیں، وہ قدرے جھینپ گیا۔ اور جلدی سے اماں کو بھیجنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ تو اس کے پیچھے شمشاد بیگم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

پھر انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے جانے کیا کہا کہ وہ اُسی وقت چلے گئے، اور اُن کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد رشید کی اماں آ گئیں، جن کے ساتھ شمشاد بیگم نے باقاعدہ بات چیت کے بعد اگلے جمعہ کی تاریخ پکی کر دی، اور پھر اُن کے جانے کے بعد مہرو کو بلا کر کہنے لگیں۔

"میں نے اگلے جمعہ کو تمہارا نکاح پکا کر دیا ہے لیکن میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے، اور اس طرح تین کپڑوں میں تمہیں رخصت کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ لوگ تو یہی کہیں گے ناں کہ سوتیلی ماں تھی۔ جب ہی کچھ جوڑ کر نہیں رکھا۔ کہاں سے جوڑتی، یہاں تو دو وقت کی روٹی پوری نہیں ہوتی۔ اب تم بتاؤ کیا کروں؟"

اور وہ کیا بتا سکتی تھی، خاموش کھڑی رہی، تو قدرے توقف سے آہ بھر کر بولیں۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تاریخ دے بیٹھی ہوں۔ اب انتظار کہاں سے کروں۔ ارے ہاں میں اپنے بھائی بھاوج کے پاس جاتی ہوں، شاید کچھ قرض دے دیں۔"

انہیں جیسے اچانک بھائی بھاوج کا خیال آیا تو فوراً جانے کے لیے کھڑی بھی ہو گئیں تو وہ عاجزی سے بولی۔

"نہیں اماں! آپ کسی سے قرض نہ لیں۔ سب لوگ ہمارے حالات جانتے ہیں، کوئی آپ کو کچھ نہیں دے گا۔"

"میں کب کسی کے کہنے سُننے کی پروا کرتی ہوں۔ مجھے صرف تیرا خیال ہے، کچھ لے کر جائے گی تو سسرال میں بھی قدر ہو گی۔ اچھا خیر دروازہ اچھی طرح بند کر لے میں بھی آتی ہوں۔"

وہ اُسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اندر سے برقع اٹھا لائیں، اور سر پر جماتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ وہ اُن کے پیچھے دروازہ بند کرنے آئی تو اسی وقت اکو آ گیا۔

"یہ اماں کہاں جا رہی ہیں؟"

"اپنے بھائی کے گھر۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں......" وہ قصداً لاعلمی کا اظہار کر کے کچن میں آئی تو اکو دونوں کمروں میں جھانکنے کے بعد اُس کے پاس آ کر پوچھنے لگا۔

"خالہ، خالو کہاں گئے؟"

"وہ سب بھی چلے گئے۔ شکر ہے۔" اُس نے اُکتا کر بتانے کے ساتھ شکر کیا، تو اکو تیز ہو کر بولا۔

"کیوں تجھے اُن سے کیا تکلیف تھی۔ آنے دے اماں کو بتاتا ہوں۔"

"تیرا تو کام ہی یہی ہے۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے اُس نے تجھے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے تسلے میں آٹا نکال کر گوندھنے لگی۔

پھر اُس رات وہ اکو اور شمشاد بیگم کے سونے کا انتظار کرتی رہی۔ اور شمشاد بیگم کو جانے کس چیز کی تلاش تھی۔ اپنا بکس کھول کر جو بیٹھیں تو اُٹھنے کا نام نہیں، ایک ایک کپڑا نکال کر اور کھنگال کر دیکھ رہی تھیں۔ وہ بظاہر آنکھوں پر بازو رکھے سوتی بن گئی۔ لیکن بازو کی جھری میں سے مسلسل اُن کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اُن کے انداز میں کوئی جھنجلاہٹ نہیں تھی بلکہ چہرے پر خاصا اطمینان تھا۔ کتنی دیر بعد بالآخر اُس نے اُکتا کر کروٹ بدل لی اور پھر اُسے نیند آ گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، کیونکہ پہلا خیال یہی آیا تھا کہ رشید انتظار کر رہا ہوگا۔ پھر اکو اور شمشاد بیگم کی طرف سے اطمینان کر کے وہ دبے پاؤں باہر نکل آئی تو واقعی چھت پر وہ دیوار کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنی نیند کو کوستی ہوئی اوپر آ گئی۔ اور اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑی۔

"معاف کر دو رشید! مجھے نیند آ گئی تھی۔ اصل میں اماں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔" اُس نے مسکرا کر اُسے اندیشے سے نکالا، پھر کہنے لگا "میری فکر مت کیا کرو، اور یوں بھی اب تو کچھ دنوں کی بات ہے، خیر یہ بتاؤ خوش ہو ناں۔"

"پتا نہیں۔" وہ اپنے احساسات کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی، کچھ اُلجھ کر کہنے لگی۔ "پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے، عجیب عجیب سے خواب آتے ہیں۔ ابھی بھی ایسا ڈراؤنا خواب تھا، میری آنکھ کھل گئی۔"

"پگلی ہو تم۔ اُلٹا سیدھا سوچتی ہو گی، جبھی ایسے خواب نظر آتے ہیں۔" وہ پیار بھری سرزنش کے ساتھ بولا۔ پھر پوچھنے لگا۔

"کیا تمہاری اماں نے تم سے کچھ کہا۔؟"

"نہیں......بس یہی بتایا ہے کہ اگلے جمعہ کو......" وہ جھجک گئی۔ تو وہ ذرا سا ہنسا پھر اُس کا ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

"ہاں اگلے جمعہ کو ہمارے بیچ یہ دیوار نہیں رہے گی۔"

"میں جاؤں؟" اُس کی پُرشوق نظروں سے گھبرا کر وہ یہی کہہ سکی۔

"ارے، ابھی تو آئی ہو۔"

"اماں اُٹھ جائیں گی۔"

"ایک تو تمہاری اماں۔ خیر چھوڑو، میں تمہیں اصل بات بتانا بھول گیا۔"

"کیا......؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کل میں اماں کو لے کر شہر جا رہا ہوں۔" اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر فوراً ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

"دیکھو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دو تین دن میں واپس آ جائیں گے۔"

"کیوں جا رہے ہو؟"

"وہ اماں کو صابرہ کے جہیز اور تمہارے لیے کپڑے اور پتا نہیں کیا کیا خریدنا ہے تم فکر نہیں کرنا۔ میں کوشش کروں گا پرسوں ہی واپس آ جاؤں۔" وہ جانے کا مقصد بتا کر جلدی واپسی کا یقین دلانے کے ساتھ تسلی بھی دینے لگا۔ اور جب تک وہ اطمینان سے نہیں ہو گئی اُسے نیچے نہیں جانے دیا۔

□

اگلے روز رشید کی اماں خود آ کر شمشاد بیگم کو بتا گئیں کہ وہ شادیوں کی خریداری کے سلسلے میں دو تین روز کے لیے شہر جا رہی تھیں اور اُن کا مقصد کچھ جتانا نہیں بلکہ ایک طرح سے خبردار کرنا تھا کیونکہ شمشاد بیگم کی فطرت سے واقف تھیں کہ وہ اُن کے شہر جانے کو کوئی غلط رنگ دے کر کچھ بھی کر سکتی ہیں اس لیے اپنے طور پر خبردار کیا کہ دو تین روز میں واپس آ جائیں گی اور شمشاد بیگم نے کوئی غلط رنگ تو نہیں دیا نہ ہی ان کے سامنے کچھ بولی تھیں، لیکن اُن کے جانے کے بعد شروع ہو گئیں۔

''مجھ پر رعب جمانے آئی تھی۔ بڑی بی، شہر سے خریداری کرنے جا رہی ہے۔ ارے میں کیا کم ہوں اس سے اس سے اچھا جہیز دوں گی مہرو کو، دیکھتی رہ جائے گی۔ بڑھیا سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو وغیرہ وغیرہ!''

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ پھر یہ جانتی تھی کہ یہ محض باتیں ہیں ورنہ حقیقتاً۔ شمشاد بیگم کے پاس کچھ بھی نہیں۔ لیکن اگلے روز اس وقت وہ حیران ہو گئی جب شمشاد بیگم اس سے کہنے لگیں۔

''چل مہرو! ہم بھی شہر سے چیزیں لے آتے ہیں۔'' وہ یوں کھڑی تھی جیسے اُس نے کچھ غلط سنا ہو، پھر شمشاد بیگم کو برقع اٹھاتے دیکھ کر ایک دم بول پڑی۔

''لیکن اماں! ہم کیسے جائیں گے۔''

''جیسے تیری ساس گئی ہے۔ اور دیکھنا اُس سے اچھے کپڑے دلاؤں گی تجھے۔'' شمشاد بیگم کا شاہانہ انداز اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ رُک کر بولی۔

''کہاں سے دلائیں گی، ابا میاں نے جو پیسے جوڑے تھے وہ تو انہی پر خرچ ہو گئے۔''

''ارے میرا بھائی سلامت رہے، بہت پیسے دیے ہیں اُس نے مجھے۔ اچھا چل جلدی کر نہیں تو بس نکل جائے گی۔'' آخر میں شمشاد بیگم نے عجلت کا مظاہرہ کیا لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکی۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

''چل نا کھڑی کیوں ہے۔'' شمشاد بیگم کے ٹوکنے پر وہ چونک کر بولی۔

''وہ اماں! آپ اکو کو ساتھ لے جائیں۔''

''شادی تیری ہو رہی ہے یا اکو کی؟'' وہ تیز ہو کر بولیں پھر ایک دم نرم پڑ کر کہنے لگیں۔ ''بے وقوف ہے تو، یہاں تجھے اکیلا کیسے چھوڑ دوں، پھر تو اپنی مرضی کے کپڑے خریدے گی تو مجھے خوشی ہو گی، اور جوتے بھی تو تیرے ناپ کے لینے ہیں۔ چل چادر اوڑھ کر آ۔'' وہ شش و پنج کی کیفیت میں چادر اٹھا کر آئی تو پھر کہنے لگی۔

''ان کا کیا پتا، تین دن کا کہہ کر گئے ہیں۔ چھ دن لگا دیں، اور شادی میں بھی اتنے ہی دن ہیں پھر ہم کیا کریں گے۔'' شمشاد بیگم بولنے کے ساتھ ساتھ برقع سر پر جماتی ہوئی آگے آگے چل پڑیں یوں ناچار اُن کے پیچھے آتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

''اکو کہاں ہے؟''

''اسے میں نے بتا دیا ہے۔ ہم شام تک واپس آ جائیں گے۔'' شمشاد بیگم نے اسے ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچا اور

دروازے میں تالا ڈال دیا۔



شمشاد بیگم اُسے لے کر جہاں اتریں وہ شہر نہیں تھا گو کہ اُس سے پہلے کبھی شہر نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اتنا جانتی تھی کہ شہر میں کھیت نہیں ہوتے، اور سڑکیں بھی پکی ہوتی ہیں۔ جبکہ یہ اسی کے گاؤں جیسا کوئی گاؤں تھا۔ کچی سڑک پر بس اُنہیں اتار کر آگے روانہ ہوئی تو پیچھے دھول اڑنے لگی تھی۔ اُس نے کچھ حیرت سے جاتی ہوئی بس کو دیکھا پھر شمشاد بیگم سے پوچھنے لگی۔

''اماں! یہ ہم کہاں!'' بات ابھی اُس کے ہونٹوں میں تھی کہ شمشاد بیگم کہنے لگیں۔

''یہاں میرا ایک رشتے کا بھائی رہتا ہے۔ بہت بیمار ہے بے چارا ذرا دیر کو اُس کے پاس سے ہو لوں۔ پھر کہاں گھر سے نکلنا ہو گا، آ چلو، یہیں قریب ہی اُس کا گھر ہے!''

''لیکن اماں! بس تو چلی گئی۔''

''دوسری آ جائے گی!'' شمشاد بیگم کا اطمینان قابل دید تھا۔ جبکہ وہ اندر ہی اندر سہمی جا رہی تھی اور ایسی ہی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی پگڈنڈی کے اختتام پر بائیں طرف مڑتے ہی کچے مکانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو شمشاد بیگم اُس کا ہاتھ پکڑ کر پہلے ہی دروازے میں داخل ہو گئیں۔ قدرے کشادہ آنگن جس کی دیوار کے ساتھ نیم کا گھنا پیڑ تھا۔ اور اُس کی چھاؤں میں بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر اس کے قدم وہیں جم گئے۔ ابھی پرسوں ہی تو رشید کے کہنے پر شمشاد بیگم نے انہیں اپنے گھر سے رخصت کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے یہاں کیوں لائی ہیں۔

''لے آئی چھوکری کو!'' وہیں سے کسی نے خوش ہو کر کہا۔ تو شمشاد بیگم اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

''نظر نہیں آ رہی کیا؟''

''راضی ہو جائے گی؟''

''ارے اس کا تو باپ بھی راضی ہو گا۔ بس اب جلدی سے قاضی کو بلاؤ۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔'' وہ ان مکالموں سے کچھ بھی نہیں سمجھی تھی لیکن چھٹی حس اچانک کسی خطرے کا الارم بجانے لگی تھی، بہت احتیاط سے اُس نے اپنے پیچھے دیکھا، دروازہ کھلا تھا۔ لیکن وہ ہرگز اتنی بہادر نہیں تھی کہ بھاگ کر دہلیز پار کر جاتی، جب خود کو بہت مجبور اور بے بس پایا تو ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی، تب شمشاد بیگم پھر اس کے قریب آئیں اور اُس کی دونوں کلائیاں تھام کر ایک جھٹکے سے نیچے گراتے ہوئے بولیں۔

''روتی کیوں ہے، چل اندر۔!''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' آنسو روکنے کی کوشش میں الفاظ اُس کے گلے میں اٹک اٹک گئے۔

''اپنے گھر میں آئی ہے، ڈر کا ہے کا۔'' شمشاد بیگم اُسے کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں لے گئیں اور ایک

چارپائی پر زبردستی بٹھاتے ہوئے بولیں۔ ''یہاں بیٹھ۔اب یہی تیرا گھر ہے۔''

''اماں۔!''

''میں تیری ماں نہ تو میری میری بیٹی! سمجھی اور خبردار جو کسی بات کو نا کہی۔گلا دبا دوں گی تیرا۔!''

انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شمشاد بیگم کمرے سے نکل گئیں اور ان کا یہ روپ نیا نہیں تھا۔بچپن سے وہ انہیں اسی روپ میں دیکھتی آرہی تھی پھر پتا نہیں کیسے ان چند دنوں کی مہربانی سے گھائل ہوگئی تھی۔اور اُسے گھائل ہونا ہی تھا۔زمانے کے چلن سے یکسر ناواقف نادان معصوم اور بے وقوفی کی حد تک سیدھی جو تھی، حالانکہ رشید نے کہا بھی تھا ہوشیار خبردار، اور وہ کتنی بھی ہوشیار بنتی شمشاد بیگم کا مقابلہ کہاں کرسکتی تھی۔بہرحال شمشاد بیگم کے کمرے سے جاتے ہی وہ دوبارہ ہاتھوں میں چہرہ چھپانا چاہتی تھی کہ نظر دوسری چارپائی پر بیٹھے بچوں پر پڑی۔بڑی لڑکی کی عمر یہی کوئی گیارہ سال ہوگی۔اس کے بعد پانچ سال کا لڑکا تھا پھر تین سال کی معصوم سی بچی۔تینوں اُسے ہی دیکھ رہے تھے،وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''کون ہو تم۔؟''

''تم کون ہو؟'' جواب میں بڑی لڑکی نے اُس سے پوچھا۔تبھی شمشاد بیگم کی بہن اندر آتے ہوئے بولیں۔

''یہ تمہاری ماں ہے!''

''ماں، میں۔!'' وہ سچ مچ زلزلوں کی زد میں آ گئی۔ذہن میں جھکڑ چلنے لگے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ ایک ایک کو دیکھنے لگی، پھر اُس نے شمشاد بیگم کی بہت منتیں کیں، خدا کا واسطہ دیا۔ان کے پاؤں پکڑ کر...... گڑگڑاتی رہی۔لیکن اُس عورت پر کچھ اثر نہیں ہوا۔جیسا کہ ابا میاں نے کہا کرتی تھی کہ اسے میرے جیسا ہی ملے گا تو اُس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔سچ مچ ابا میاں کی روح تڑپ تڑپ گئی ہوگی۔کاش اوپر والا انہیں کچھ دن مہلت دے دیتا۔لیکن وہ بڑا بے نیاز ہے۔

''خبردار تو نے ناں کہی۔یہیں دفن کردوں گی!'' پردے کے اس طرف قاضی اُس کی ہاں سننے کا منتظر تھا۔ اِدھر شمشاد بیگم اُس کے کان میں بول رہی تھیں۔اور ایک ذرا سی ہاں نے اُسے تین بچوں کی ماں بنا دیا۔شمشاد بیگم کی اپنی کوئی اولاد ہوتی تو شاید دل میں تھوڑا درد ضرور اُٹھتا اب تو بڑے آرام سے اُسے سولی پر چڑھا کر خوش ہو رہی تھیں۔

''ارے میں نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں رشید کے ساتھ بیاہتی اسے تو میں کہاں جاتی، بڑا چالاک چھوکرا ہے، چار دن میں مجھے نکال باہر کرتا۔اور وہ بیمار بڈھا خود تو مر رہا تھا۔مجھے بے آسرا کرنے میں اُس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔مکان لکھ کے دے دیتا اس......لڑکی کے نام، وہ تو اللہ کو رحم آ گیا جو اس سے پہلے ہی اُسے اُٹھا لیا۔''

برآمدے میں شمشاد بیگم اپنی کامیابی پر بہت جوش میں بول رہی تھیں اور اندر وہ گم صم بیٹھی ایک تسلسل سے بہتے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں میں جمع کر رہی تھی۔جانے سے پہلے شمشاد بیگم کھڑے کھڑے اُس کے پاس آئیں۔

''میں جا رہی ہوں مہرو! اکرا انتظار کر رہا ہوگا۔اور یہ تو رونا بند کرے گی کہ نہیں۔چل اُٹھ اُدھر جا اپنے بڈھے کے پاس۔''

وہ اسی طرح بیٹھی رہی تو شمشاد بیگم نے اُسے کلائی سے پکڑ کر اُٹھایا اور کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے کر آئیں۔

''لے پانذیرا اپنی ووہٹی توں سنبھال۔'' وہ سر جھکائے کھڑی تھی، شمشاد بیگم کی بات کے جواب میں دوسری طرف سے اُسے ابا میاں سے زیادہ کمزور اور بیمار آواز سنائی دی۔

''ہائے شمشاد بیگم! کیا ظلم کیتا ای۔اجے تے اے آپ بال اے، مینڈے بالاں کوں کیا سنبھلے گی۔(ابھی تو یہ خود بچی ہے میرے بچوں کو کیا سنبھالے گی۔)''

''بالاں کوں تے کوں وی سنبھلے سی۔'' (بچوں کو تجھے بھی سنبھالے گی۔) شمشاد بیگم کہتے ہوئے باہر نکلیں تو اس نے بے اختیار پکارا۔

''اماں!'' کسی درد بھری پکار تھی، اپنی ماں ہوتی تو کلیجہ پھٹ جاتا۔اور وہ کیسی اَن سنی کر کے نکل گئی۔تب اُس کی نظریں دروازے سے پلٹ کر اُس شخص پر ٹھہریں تو سچ مچ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں، بچپن میں شمشاد بیگم کے منہ سے سنتی تھی۔کیسی کھوٹی قسمت ہے میری، سارے خواب ٹوٹ گئے۔بیمار بڈھا میرے پلے پڑا وغیرہ وغیرہ۔ اور خواب کیسے ٹوٹتے ہیں یہ اُسے ابھی پتا چلا۔ابھی جب سارے خوابوں کی کرچیاں روح کو چھید رہی تھیں۔اور چبھن آنکھوں تک میں اُتر آئی تھی۔

اگر شمشاد بیگم نے اُس سے اپنا بدلہ لیا تب بھی بہت برا کیا تھا۔کہ وہ تو بہت نادان اور معصوم سی لڑکی تھی، حالات کی ستائی ہوئی۔اگر رشید نے اُس کے دل میں آرزوؤں کے پھول نہ کھلائے ہوتے تو زندگی کا یہ روپ نیا نہیں تھا۔وہ بڑے آرام سے قبول کرلیتی۔لیکن اب تو اندر ایک آگ سی لگی تھی جس میں لگتا تھا وہ اپنے ساتھ سب کو جلا کر خاک کردے گی، بہت بہت ظلم کیا شمشاد بیگم نے صرف اُس کے ارمانوں کا خون نہیں کیا۔بلکہ اُس معصوم لڑکی کو بھی مار ڈالا۔

وہ جو چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے پیروں تلے پھولوں کا فرش بچھا ہو، بولتی تھی تو مقابل کو پوری جان سے متوجہ ہو کر سننا پڑتا۔ایسی نرم دھیمی آواز اور چہرے پر تسخیر کر لینے والی معصومیت تھی۔آن کی آن میں سب کچھ ختم ہوگیا۔اور اُس کی جگہ ایک دوسری شمشاد بیگم نے جنم لے لیا۔انتہائی تنفر کے ساتھ وہی سوچ، اُس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تو اب کسی کا اچھا نہیں ہوگا۔

دوسرے کمرے میں تین سال کی بچی جانے کس بات پر رونے لگی تھی۔اور وہ جو ابھی تک گم صم سی کھڑی سامنے چارپائی پر لیٹے نحیف و نزار وجود کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ایک دم چونک کر پلٹی اور درمیانی دروازے کو زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے بچوں کے سر پر جا کھڑی ہوئی، ایک تو شدت گریہ دوسرے اب غصے کے

باعث آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں، مزید چیخ کر بولی۔

''یہ کیا شور مچا رکھا ہے، چپ کراؤ اسے۔!'' بچی سہم کر چپ ہو گئی۔ اور بڑی بہن کی گود میں منہ چھپانے لگی تو اُس کی نگاہوں میں وہ وقت آن سمایا جب اسی طرح اکواس کی آغوش میں چھپنے کی کوشش کرتا تھا۔ تب وہ روہانسی ہو کر شمشاد بیگم سے کہتی تھی، اسے بھوک لگی ہے۔ اور جواب میں شمشاد بیگم اکو کو اس کی آغوش سے کھینچ کر پرے دھکیلتیں پھر اُسے روٹی پکانے کو کہتیں۔

اپنا وقت یاد کر کے وہ اور بپھر گئی اور بڑی والی کے منہ پر تھپڑ مار کر بولی۔

''یہ تم مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ آنکھیں نکال دوں گی اگر آئندہ ایسے دیکھا تو۔!'' تبھی بیمار بوڑھا ہانپتا ہوا پیچھے سے آ کر بولا۔

''اری نیک بخت! کیوں ناراض ہو رہی ہے بچوں پر۔ یہ بے چارے تو پہلے ہی۔''

باقی بات اُس کی کھانسی کی نذر ہو گئی سا اور اسی طرح کھانستا ہوا وہ دوبارہ جا کر اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ تب بڑی لڑکی فوراً آ کھڑی ہوئی اور پانی لے کر باپ کے پاس چلی گئی۔ وہ چپ چاپ کھڑی درمیانی دروازے سے دیکھتی رہی۔ پانی پی کر نذیر نے جانے بیٹی سے کیا کہا وہ سر ہلاتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ تب کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے پیچھے آئی اور کچن کے دروازے میں رُک کر پوچھنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو۔؟''

''روٹی پکاؤں گی، ابا کہہ رہے ہیں، باجی کو روٹی کھلا دو۔'' لڑکی چولہے میں لکڑیاں رکھتے ہوئے بولی تو اُس نے چونک کر پوچھا۔

''کون باجی؟۔''

''تم۔ تم باجی ہو ناں!'' لڑکی نے ماچس جلانے سے پہلے اُسے دیکھا لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہاں سے ہٹ کر آنگن میں رکھی چارپائی پر آ بیٹھی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اور ایسا ہی اندھیرا اُس کے من میں اُترا تھا۔ وہ یونہی ٹانگیں نیچے لٹکائے آڑی چارپائی پر لیٹ گئی اور بہت اونچائی پر اُڑتے پرندوں کو اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے دیکھنے لگی۔

وقفے وقفے سے اُس کی آنکھوں میں پانی جمع ہوتا تو کچھ دیر کو منظر دھندلا جاتا۔ پھر کناروں سے پانی چھلکتے ہی دھند چھٹ جاتی۔ اُسے پتا بھی نہیں چلا کہ آنکھوں سے چھلکتے پانی نے اندر دہکتے الاؤ کو کسی حد تک سرد کر دیا۔ کاش کچھ دیر اور وہ لڑکی نہ آتی تو اُس کے اندر معصوم مہر و پھر سے زندہ ہو جاتی۔ لیکن اُس سے پہلے ہی وہ آ کر کہنے لگی۔

''باجی! روٹی پک گئی ہے کھا لو۔!'' اُس نے پہلے یونہی لیٹے لیٹے سر اونچا کر کے اُسے دیکھا پھر اُٹھ کر...... بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اپنے باپ کو کھلاؤ اور بہن بھائی کو!''

''پہلے تم کھا لو باجی! تمہیں بھوک لگی ہوگی!'' اور بھوک کے نام پر بھوک کا احساس ہوا۔ دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا احسان کرتے ہوئے بولی۔

''لے آؤ۔!'' لڑکی نے ایک پلیٹ میں روٹی دوسری میں سالن لا کر اُس کے سامنے رکھ دیا تو روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے اُس نے یونہی پوچھ لیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''صفیہ اور چھوٹی کا نام ننھی ہے۔!''

''اور بھائی کا؟''

''رشید!'' اُس کا منہ کی طرف جاتا نوالہ درمیان ہی میں رہ گیا۔ اور وہ صفیہ کو یوں دیکھنے لگی جیسے اُس نے جان بوجھ کر اُس کے کسی زخم کو چھوا ہو، تیکھی تیز نظریں، صفیہ کچھ سہم کر پیچھے ہٹ گئی اور ایسی ہی سہمی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا باجی۔؟'' وہ ذرا سا چونکی پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔

پیٹ کو روٹی ملی تو ذہن سوچنے کے قابل ہو گیا اور گو کہ اب آنگن میں سونے کا موسم نہیں تھا۔ لیکن وہ جو کھانے کے بعد وہاں لیٹی تو اُٹھنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ دو تین بار صفیہ نے آ کر کہا وہ اندر چل کر سوئے یہاں سردی لگے گی پھر نذیر نے بھی کمزور سی آواز میں کتنی بار پکارا لیکن وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر گئی۔ تب شاید نذیر ہی کے کہنے پر صفیہ نے ایک تکیہ اور کھیس لا کر اس کے پاس رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر تک اندر سے بچوں کی آوازیں آتی رہیں پھر ایک دم سناٹا چھا گیا، غالباً سب سو گئے تھے، اور وہ دور آسمان پر نظریں جمائے یکسوئی سے سوچنے لگی۔

''یہاں سے نکلنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس میں بیٹھوں گی اور جب اپنا گاؤں آئے گا تو اُتر جاؤں گی۔'' اس کے بعد اپنے گھر کے ساتھ ہی شمشاد بیگم کا خیال آیا تو اس نے فوراً سر جھٹک کر سوچا۔ رشید نے کہا تھا۔

''جب کبھی شمشاد بیگم کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرو تو بے دھڑک میرے گھر چلی آنا۔ پھر میں سب سنبھال لوں گا۔''

''ہاں میں رشید کے گھر جاؤں گی۔ وہ سب سنبھال لے گا۔''

وہ ناداں خود کو اطمینان دلانے لگی، غالباً نہیں جانتی تھی کہ جو بیڑیاں شمشاد بیگم اُس کے پاؤں میں ڈال گئی ہے، انہیں توڑنا رشید کے بس سے باہر ہے۔ بہرحال خود کو اطمینان دلانے کے بعد...... صبح یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر کے وہ بڑے آرام سے ہو گئی۔



صبح جب سورج کی کرنیں براہِ راست اُس کے چہرے پر پڑیں تب اُس کی آنکھ کھلی۔ اٹھنا چاہا لیکن اُٹھ نہیں سکی۔ اوس میں بھیگی رات میں کھلے آسمان تلے سونے کا نتیجہ تھا کہ بخار کے ساتھ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اُٹھ پائی اور تکیہ بغل میں دبا کر اندر جا کر پھر سو گئی، بالکل اُسی طرح جیسے شمشاد بیگم کرتی تھیں۔ پھر

دن چڑھے صفیہ نے اُسے اٹھایا تو وہ اس پر بگڑ گئی۔

"کس نے کہا، مجھے اُٹھاؤ"

"کسی نے نہیں، میں نے خود اٹھایا ہے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں بخار ہو رہا ہے باجی! تھوڑی سی چائے پی لو، پھر سو جانا!"

اُس نے چائے کا پیالہ سامنے کرتے ہوئے کہا تو وہ قدرے سٹپٹا سی گئی گو کہ اپنے رویے پر نادم نہیں ہوئی لیکن تنفر دم توڑ گیا۔ اُٹھ کر بیٹھی اور چائے کا پیالہ اُس کے ہاتھ سے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ ساتھ ہی رات جو سوچتی رہی تھی وہی باتیں ذہن میں دہرانے لگی۔

"بس میں بیٹھوں گی، اپنے گاؤں اُتر جاؤں گی۔ پھر رشید سب سنبھال لے گا۔"

"رشید!" دوسرے کمرے سے نذیر علی اپنے بچے کو پکار رہے تھے، وہ اپنی جگہ یوں اُچھلی جیسے اُس کے من کا چور پکڑا گیا ہو۔

"جاؤ رشید! ابا بلا رہے ہیں!" صفیہ نے کہا۔ تب وہ کچھ اطمینان سے ہو گئی۔ اور چائے ختم کر کے پیالہ اُسے تھمایا ہی تھا کہ دو تین عورتیں کمرے میں داخل ہوئیں جنہیں صفیہ نے سلام کرنے کے ساتھ بیٹھنے کو کہا اور پیالہ رکھنے کچن میں چلی گئی۔

"کہاں ہے نذیر علی کی ووہٹی۔" ایک عورت نے بیٹھتے ہی اُس سے پوچھا۔ لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور باری باری تینوں کی شکلیں دیکھنے لگی، تب دوسری عورت ہنس کر بولی۔

"نظر نہیں آ رہی تجھے، یہی تو ہے نذیر علی کی ووہٹی۔"

"ہا، ہائے اتنی سی چھوکری۔ کیا ظلم کیتا ظالماں نے۔" تیسری سینے پر ہاتھ مار کر تاسف کا اظہار کرنے لگی۔

"دیکھ تاں، کیا کمی اے، ایسی سوہنی شہزادی۔ نذیر علی دے دھیاں ورگی، ہائے چھوکری بڑا ظلم ہویا تیرے ناں۔!"

وہ تینوں اس کے ساتھ ہمدردی جتانے لگیں۔ اور اچانک اُس کا دماغ گھوم گیا۔ ایسی ہی عورتیں سارا دن شمشاد بیگم کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھتی تھیں اور اُسے زہر لگتی تھیں وہ عورتیں، دل چاہتا تھا ایک ایک کو دھکے دے کر نکال دے۔ لیکن بہت مجبور، بہت بے بس تھی۔ اور ابھی گو کہ اُسے اپنے اختیارات کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چارپائی سے اُتر کر کھڑی ہوئی اور چیخ کر بولی۔

"میرے نال اچھا ہویا برا۔ تساں سب نکل جاؤ۔ چلو اُٹھو۔"

"ہائیں چھوکری اساں تیرے نال!"

"کوئی ضرورت نی میرے نال ہمدردی کرن دی چلو نکلو۔"

وہ اور تیز ہو کر چیخی اور انہیں نکال کر یوں اطمینان سے ہو گئی جیسے برسوں سے سینے میں بھرا غبار چھٹ گیا ہو۔

پھر ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، صفیہ اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی، لیکن اُسے چپ کرانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ سامنے بیٹھی چھوٹی ننھی کا عالم یہ تھا کہ اُس کے ڈر سے آواز نہیں نکال رہی تھی اور آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔ رشید درمیانی دروازے میں کھڑا حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اور اُدھر سے نذیر علی کمزور سی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"مہرو! کیوں رو رہی ہے، ارے مجھے بھی تو پتا چلے۔" اور وہ اسی طرح روتی رہی۔ جب آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے ہچکیاں تھم گئیں تب بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی رہی۔ اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی، یوں جیسے تیز برستی بارش یکلخت تھم جائے، تو ہر شے پر حیرت انگیز خاموشی چھا جاتی ہے۔ ہوا، درخت پھول پتے...... حتیٰ کہ بادل سب کسی اشارے کے منتظر نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی سماں تھا۔ تبھی اُدھر سے نذیر علی نے پکار کر پوچھا۔

"صفیہ! مہرو سو گئی کیا؟" اس سے پہلے کہ صفیہ کوئی جواب دیتی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی نذیر علی کے پاس آ کر رُک گئی۔ وہ اُسے دیکھ کر اُٹھ بیٹھے پھر کہنے لگے۔

"کیوں رو رو کر خود کو ہلکان کرتی ہے۔ ارے شکر کر شمشاد بیگم تجھے یہاں بیاہ گئی اگر کسی کے ہاتھ بیچ دیتی تب تو کیا کر لیتی...... اب مت رونا، میرے بچے پریشان ہوتے ہیں، جا، جا کر روٹی کھا اور بچوں کو بھی کھلا۔"

وہ نذیر علی سے کچھ نہیں بولی لیکن باورچی خانے میں آ کر زور زور سے برتن پٹخنے لگی۔ عجیب بے بسی تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ وہ شمشاد بیگم نہیں بننا چاہتی تھی۔ لیکن جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا۔ اُسے قبول کرنا بھی مشکل تھا۔

روزانہ رات میں یہ سوچ کر سوتی کہ صبح یہاں سے نکل جائے گی، لیکن صبح ہونے کے ساتھ ہی آپ ہی آپ گھر کے بکھیڑوں میں اُلجھ جاتی۔ شاید اس لیے کہ اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔



پھر کتنے ہی بہت سارے دن گزر گئے۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن بڑھتا گیا۔ کچھ متضاد کیفیات میں گھری ہوئی تھی، یعنی بات بے بات بچوں کو دھنک کر رکھ دیتی اور اس کے بعد خود بھی رونے بیٹھ جاتی۔ کبھی نذیر علی کو کوستی اور کبھی ان کی خدمت گار بن جاتی۔ اُس وقت جانے کس بات پر تلملائی ہوئی تھی باورچی خانے میں برتن پٹخنے کے ساتھ نذیر علی کے پورے خاندان کو کوس رہی تھی، تبھی صفیہ آ کر بولی۔

"باجی! تمہارا بھائی آیا ہے۔"

"میرا کون بھائی ہے؟۔"

وہ اسی روانی میں بول گئی، پھر صفیہ کے پیچھے اکو کو دیکھ کر اُس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اور اکو ہنستے ہوئے بولا۔

"ارے واہ مہرو! تیری تو بڑی زبان چلنے لگی ہے۔ اماں ٹھیک کہہ رہی تھی، یہاں تو مزے میں ہے!"

''تو کیسے آیا، کس کے ساتھ؟'' اکو خاموش ہوا تو اُس نے فوراً پوچھا جواب میں وہ شاہانہ انداز میں بولا۔

''اکیلا آیا ہوں، اماں روز کہتی ہے جا کر بہن کی خیر خبر لے آ۔ آج چلا آیا۔''

''بیٹھ جا، میں تیرے لیے چائے بناتی ہوں۔'' دوہ پڑی اُس کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی، پھر چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر اونچی آواز میں صفیہ کو پکار کر کہنے لگی۔

''اے صفیہ! رشید سے کہہ سامنے کی دکان سے بسکٹ لے آئے۔''

''یہ رشید کون ہے؟'' اکو کے معنی خیز انداز پر وہ نظریں چُرا کر بولی۔

''نذیر علی کا بیٹا ہے!''

''نام بدل دے اس کا!'' وہ جانتی تھی اکو کتنا بدلحاظ ہے، اور اب وہ بھی اُس سے دبنے والی نہیں تھی، اس کے مشورے پر تنک کر بولی۔

''کیوں؟''

''تیرے فائدے کو کہہ رہا ہوں۔''

''ارے تو کیا جانے میرا فائدہ، نقصان، چل اُٹھ اندر جا کر نذیر علی سے مل، میں چائے وہیں لے آؤں گی!''

وہ کہتے ہوئے برتنوں کے ٹوکرے میں سے چائے کے مگ نکالنے لگی، اکو اُٹھ کر اندر چلا گیا۔

پھر چائے پیتے ہی اکو جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے بہت کہا کہ ایک دو دن اُس کے پاس رک جائے لیکن وہ پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ تب وہ نذیر علی کے پاس بیٹھ کر منت سے بولی۔

''میرے بھائی کو اپنی زمین پر لگا دیں، ہر وقت آوارہ پھرتا ہے۔''

اور نذیر علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اُن کے پاس تھوڑی بہت کاشتکاری کی زمین تھی اور کیونکہ وہ خود کام کرنے کے قابل نہیں تھے، اس لیے زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی یوں ہر فصل کی کٹائی کے بعد ٹھیکیدار انہیں طے شدہ رقم دے دیتا تھا۔ اور ظاہر ہے زمین ٹھیکے پر دینے کے بعد نذیر علی کا کچھ اختیار نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے اکو کے لیے ہامی نہیں بھری، جس سے اُس کا مزاج مزید بگڑ گیا۔ یعنی وہ اس کے بھائی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے پھر وہ کیوں سارا وقت اُن کے بچوں کی چاکری کرے، یہ محض اُس کی سوچ تھی، ایک بہانا چاہیے تھا۔ ورنہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اکو ہرگز یہاں کام پر نہیں لگے گا۔

بہرحال کچھ دن وہ اسی بات کو بنیاد بنا کر سارے کاموں سے بے نیاز ہو گئی۔ اور جیسے ابا میاں کو برداشت کرتے کرتے اچانک کسی دن جلال آتا تو سارے اگلے پچھلے حساب برابر کر دیتے تھے اسی طرح نذیر علی نے بھی اُس روز اُسے خوب لتاڑا۔

''میں کیا تیرے ہاتھ جوڑنے گیا تھا۔ ارے تیری ماں خود تجھے میرے در پر چھوڑ کر گئی ہے اور تو اکڑتی یوں ہے جیسے دو چار مربعے لکھوا کر لائی ہو، ابھی چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کروں تو ساری اکڑ نکل جائے گی۔''

وہ خاموشی سے اُٹھی اور صفیہ کے ہاتھ سے سوئی دھاگے لے کر لحاف میں ڈورے ڈالنے بیٹھ گئی غالباً نذیر علی کو اسی بات پر غصہ آیا تھا کہ جو کام اُن کی بیٹی سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اُسے کرنے کی کوشش میں بار بار اُس کی انگلیاں زخمی ہو رہی تھیں۔ اور وہ دیکھ بھی رہی تھی پھر بھی بڑے آرام سے بیٹھی تھی۔ اور اب وہ لحاف میں ڈورے تو ڈالنے لگی، لیکن ساتھ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے بھی لگی، جس پر صفیہ کہنے لگی۔

''باجی! مجھے سکھا دو، میں سی دوں گی!''

''بس رہنے دو، میں خود ہی کر لوں گی!''

اُس نے بہت بُری طرح جھڑک دیا تو صفیہ ننھی کو گود میں لے کر پیچھے ہٹ گئی، اور اُسے بولنا سکھانے لگی، ساڑھے تین سال کی بچی ابھی تک بولتی نہیں تھی۔ بس ایک لفظ ''یہ'' اگر کسی چیز کی طرف اشارہ کر کے کہتی تو اس کا مطلب ہوتا یہ کیا ہے۔ اس وقت اُس کا اشارہ لحاف کی طرف تھا۔ صفیہ اُسے بتانے لگی۔

''رضائی۔ ابا کی۔ بولو ابا۔ ابا۔ ننھی بولو۔ ابا!''

''یہ کبھی نہیں بولے گی، ایسے ہی گونگی رہے گی۔'' وہ صفیہ کی ابا ابا کی گردان سے چڑ کر بولی تو صفیہ نے خاموش ہو کر اُسے دیکھا پھر ننھی کو لے کر اندر چلی گئی۔

اچھا ہوا دن میں لحاف بن گیا تھا۔ کیونکہ رات چانک سردی کی شدت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ساتھ ہی نذیر علی کی کھانسی بھی بڑھ گئی، جیسے ابا میاں سردی کے دنوں میں رات رات بھر کھانستے تھے، اور سانس لیتے ہوئے اُن کے سینے اور حلق سے عجیب سی آواز نکلتی تھی، تب وہ انگیٹھی گرم کر کے اُن کی چارپائی کے پاس رکھ دیتی تھی۔ ابھی جب وہ کچن کا آخری کام نمٹا کر اندر آئی تو جانے اُسے نذیر علی کی حالت پر رحم آیا یا کہیں ابا میاں کا خیال تھا کہ وہ الٹے پیروں واپس کچن میں آ گئی، اور انگیٹھی تو کہیں نہیں تھی، اُس نے چولہے میں کوئلے ڈال کر ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی، پھر کپڑے دھونے والا تسلا اٹھانے کے لئے آنگن میں آئی تو دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہو رہی تھی۔ گو کہ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن سردی کے باعث ہر سو خاموشی چھائی تھی۔ اُس نے دروازے کے پاس آ کر پوچھا۔

''کون ہے؟'' جواب میں پھر دستک ہونے لگی۔ بڑا محتاط انداز تھا۔

''منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟'' اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کنڈی گرائی اور دروازہ کھولتے ہی ٹھٹھک گئی۔ سامنے ہجر و فراق کی تصویر بنا رشید کھڑا تھا۔ ایک ٹک اُسے دیکھے گیا۔ کتنے پل بیت گئے۔ اندر نذیر علی کو کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ اس طلسم سے نکل کر پوچھنے لگی۔

''کیسے آئے؟''

''شکر ہے مہرو، تم نے یہ نہیں کہا کہ کیوں آئے۔ بڑی مشکل سے تمہارا پتا معلوم ہوا'' سردی سے اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ کوئی گرم کپڑا بھی اُس کے تن پر نہیں تھا۔ وہ سامنے سے ہٹتے ہوئے بولی۔

''بہت سردی ہے، اندر آ جاؤ۔''

''کون کون ہے؟'' وہ اندر آنے سے ہچکچایا۔

''کوئی بھی ہو، تم آ جاؤ۔!'' اتنی دیدہ دلیری، وہ حیران ہو گیا۔ اُس کے خیال میں تو وہ اُسے دیکھ کر سہم جائے گی، اور ہاتھ جوڑ کر منت کرے گی کہ واپس چلے جاؤ۔ لیکن وہ بڑے آرام سے باورچی خانے میں لے آئی۔ پیڑی کھینچ کر اُسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر تسلے میں گرم کوئلے رکھتے ہوئے بولی۔

''نذیر علی کے پاس کوئلے رکھ دوں، پھر تمہیں چائے پلاتی ہوں۔''

وہ خاموشی سے اُس کی کارروائی دیکھنے کے ساتھ کوئلوں پر ہاتھ سینکنے لگا۔ تبھی صفیہ آ کر بولی۔

''باجی! ابا کو بہت کھانسی ہو رہی ہے۔''

''سن رہی ہوں اُن کی کھوں کھوں، انہی کے واسطے انتظام کر رہی ہوں۔'' وہ تڑخ کر بولی، تو صفیہ جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگی۔

''یہ کون ہے باجی۔؟''

''میری خالہ کا بیٹا ہے، تجھے کیا ہر بات پوچھنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ چل جا کر سو۔!''

وہ اُسے ڈانٹتی ہوئی کوئلوں کا تسلا اُٹھا کر کھڑی ہوئی اور رشید سے ابھی آئی کہہ کر اندر چلی گئی، کچھ دیر بعد واپس آئی اور بیٹھتے ہی چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا پھر برتنوں کے ٹوکرے میں سے پیالے نکالنے میں لگ گئی، وہ اُس قصداً مصروفیت کو خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اور جیسے ہی پیالے نکال کر وہ پلٹی کہنے لگا۔

''مہرو! یہ سب کیا ہو گیا ہے، تمہاری اماں نے اتنا بڑا دھوکا دیا۔ کس بات کا بدلہ لیا اُس نے کیوں تمہیں یہاں لا کر بیاہ دیا؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ جبکہ آنکھوں میں اچانک نمی اُتر آئی تھی جسے اُس سے چھپانے کی خاطر چولہے میں لکڑیاں ٹھیک کرنے میں لگ گئی تو وہ ایک دم اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''میں تمہیں نہیں رہنے دوں گا مہرو، میرے ساتھ چلو۔!''

''کیا کہہ رہے ہو!'' اُس کا پورا وجود سن ہونے لگا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں، یہاں تمہارا کوئی نہیں، بڈھا نذیر علی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ آج مر جائے تو بتاؤ تمہارا کیا ہوگا، نکل چلو میرے ساتھ، ہم شہر میں جا کر اپنا گھر بسائیں گے۔''

اب جب کہ وہ اس چار دیواری سے مانوس ہونے لگی تھی، وہ اسے راہ دکھا رہا تھا۔ وہ گم صم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھے گئی۔

''تم ابھی نادان ہو، ناسمجھ ہو مہرو! چاہو بھی تو...... نذیر علی کے بعد اُس کے بچوں کی نگرانی پر نہیں بیٹھ سکتیں اس لیے کہ ابھی خود تمہیں محافظ کی ضرورت ہے، سمجھ رہی ہو ناں۔!''

اور سب سمجھ کر اُس کے آنسو روانی سے چھلک گئے، گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر بولی۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے!''

''کس بات سے؟۔''

''پتا نہیں، بس تم چلے جاؤ۔''

''چلا جاتا ہوں، لیکن سن مہرو، میں پھر آؤں گا۔'' وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا، پھر جاتے جاتے رُک کر بولا۔

''دروازہ بند کر لو۔''

وہ اسی طرح بیٹھی رہی نہ اُسے جاتے ہوئے دیکھا کتنی دیر بعد گھٹنوں سے سر اُٹھایا تو چولہے پر رکھی پتیلی میں پانی خشک ہو چکا تھا۔ اُس نے جلدی میں پتیلی نیچے اُتاری تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جل گئیں۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دونوں ہاتھ جھٹکتے ہوئے اندر چلی آئی۔ اِدھر بچے اُدھر نذیر علی بے خبر سو رہے تھے۔

وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی، خاموشی میں صرف نذیر علی کے سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اندھیرے میں انہیں دیکھنے کی کوشش کرتی رہی، پھر اِدھر پلکوں کے در بند کیے اُدھر کتنے دریچے آپ ہی آپ وا ہو گئے۔ جب اُس کی بے آب و گیاہ زندگی میں کچھ وقت کو بہاروں کے قافلے اُترے تھے کیسے وہ اپنے دکھ بھول جاتی تھی۔ وہ چند لمحے جو رشید کی سنگت میں گزرتے، وہ بقیہ تمام دن پر حاوی ہو جاتے تھے، اور کتنی عجیب بات تھی کہ اُس وقت بھی جب بہت مایوس ہو کر وہ سوچنے لگی تھی کہ اُس کی زندگی میں کبھی کوئی اچھا دن نہیں آئے گا تو اچانک رشید نے آ کر اُسے مایوسیوں سے نکال لیا تھا۔ اور ابھی بھی وہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی کہ ایک بار پھر وہ آ گیا۔ اور آنے والے دنوں کا جو نقشہ اُس کے سامنے وہ کھینچ گیا تھا۔ اُس میں کہیں مبالغہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے گو کہ اُس نے اس نہج پر نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب بہت کوشش سے بھی وہ اپنی سوچوں کو کسی اور سمت نہیں موڑ پا رہی تھی۔ پوری رات اُس کی سوتے جاگتے گزری۔

صبح کے قریب کہیں جا کر بے خبری کی نیند آئی۔ جبھی پورا دن چڑھنے کے بعد آنکھ کھلی پھر بھی بہت سستی سے اُٹھ کر بیٹھی اور نذیر علی کی چارپائی خالی دیکھ کر اُس کی ساری سستی یکلخت دور ہو گئی۔ فوراً کمرے سے نکلی تو سماعتوں سے صفیہ کی آواز ٹکرائی۔ وہ ننھی کو سکھا رہی تھی۔

''بولو، ابا۔ ابا۔!''

''کہاں ہیں تمہارے ابا؟'' اُس نے پورے آنگن میں نظر دوڑانے کے ساتھ صفیہ سے پوچھا۔

''ابا ٹھیکیدار کے پاس گئے ہیں کہہ رہے تھے دوپہر تک واپس آ جائیں گے۔'' وہ صفیہ کے جواب سے مطمئن ہو گئی پھر ننھی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

''اسے ابا کے بجائے کچھ اور کہنا سکھاؤ، یہ ابا کبھی نہیں بولے گی۔''

''کیوں باجی؟۔'' صفیہ نے سادگی سے پوچھا اور جواب میں وہ انتہائی سنگ دلی کا مظاہرہ کر گئی۔

''جب تک اس کی زبان پر ابا چڑھے تب تک تمہارا ابا نہیں رہے گا۔''

''اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو باجی۔'' مارے دکھ کے صفیہ کی آواز بھر آ گئی۔ ''اللہ میرے ابا کو لمبی عمر دے۔!''

"لمبی عمر، ہونہہ۔!" وہ نخوت سے سر جھٹک کر منہ دھونے نل پر چلی گئی۔



"پتا ہے مہرو! جب میں شہر سے آیا اور اکو نے مجھے بتایا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے تو میں سچ مچ پاگل ہو گیا تھا۔ کلہاڑی اُٹھا کر شمشاد بیگم کا خون کرنے جا رہا تھا۔ لیکن میری لماں نے مجھے بہت واسطے دیے۔ سمجھایا کہ اُس کا خون کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اُلٹا میں پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ اور میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ صرف تمہاری خاطر میں نے شمشاد بیگم کو چھوڑ دیا، ورنہ ابھی بھی میرا دل چاہتا ہے۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں، بہت مکار عورت ہے۔ موقع کی تلاش میں تھی۔ حالانکہ مجھے شروع سے خدشہ تھا کہ وہ آسانی سے ہماری شادی پر آمادہ نہیں ہوگی، پھر آخر میں پتا نہیں کیسے میں نے اُس کا اعتبار کر لیا۔"

وہ اُسے اپنی کیفیات بتانے کے بعد اُس وقت کو کوسنے لگا جب وہ اپنی ماں کے ساتھ خریداری کے سلسلے میں شہر گیا تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ کیسے وقت کو واپس موڑ دے، اور اُس کے پچھتاووں پر وہ کہنے لگی۔

"نہیں رشید! اگر تم شہر نہ جاتے تب بھی اماں کو میری شادی تمہارے ساتھ نہیں کرنی تھی، اس لیے کہ انہیں تم سے خطرہ تھا۔ اُن کا خیال تھا شادی کے بعد تم انہیں گھر سے نکال دو گے۔"

"بس وہ ایسا ہی سمجھتی تھیں، مجھے بھی جب پتا چلا جب وہ یہاں اپنی بہن سے باتیں کر رہی تھیں۔" اُس نے بہت تاسف سے شمشاد بیگم کے خدشات دہرائے تو وہ اپنے غصے کو دبا کر بولا۔

"دفع کرو، اُس نے جو کرنا تھا کر لیا۔ تم بتاؤ میرے ساتھ چل رہی ہو ناں۔"

"ابھی۔!" وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"ہاں مہرو ابھی، میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔ اتنا عرصہ میں نے پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے گزارا ہے، اب مجھے مایوس مت کرنا، تمہیں میری محبت کا واسطہ۔"

وہ اس کی بے تابی و بے قراری پر پریشان ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ گو کہ پہلی بار وہ جن تلخ حقائق کی نشاندہی کر گیا تھا۔ تب ہی وہ یہ گھر چھوڑنے کے لیے خود کو آمادہ کر چکی تھی اور اُسے کسی کا ڈر بھی نہیں تھا بلکہ بڑے آرام سے سوچا کہ بیمار نذیر علی اُس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ ابھی بھی کوئی خدشہ کوئی دھڑکا نہیں پھر پتا نہیں کیا چیز راہ میں حائل تھی، اور اُسے شش و پنج میں دیکھ کر وہ اُسے جھنجھوڑنے لگا۔

"یہاں تمہارا کوئی نہیں مہرو! تم اکیلی رہ جاؤ گی، اور زمانہ بہت خراب ہے، چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں۔"

صفیہ کے آنے سے وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور صفیہ اُس سے بولی۔

"باجی! تمہیں ابا بلا رہے ہیں۔"

"آتی ہوں۔" اُس نے بیک وقت دونوں سے کہا اور اُٹھ کر اندر آئی تو نذیر علی اُسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔

"کون آیا ہے مہرو؟۔"

"میری خالہ کا بیٹا ہے۔" صفیہ سے اُس نے دھڑلے سے کہا تھا اُن سے کہتے ہوئے جانے کیوں نظریں چرا

گئی۔

"کیا کہتا ہے؟۔"

"کچھ نہیں، یونہی خبر لینے آیا ہے۔"

"تو نیک بخت اُسے وہاں کہاں بٹھا رکھا ہے۔ اِدھر میرے پاس لے کر آ۔ چائے پانی کا پوچھ اُس سے کہاں سے آیا ہے۔؟"

وہ خاصی جز بز ہو رہی تھی۔ اُن کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ اور جا کر اُسے اپنے ساتھ لے آئی۔

"تم یہاں بیٹھو، میں چائے لے کر آتی ہوں۔" وہ اُس کی اُلجھی ہوئی نظریں محسوس کر رہی تھی۔ جبھی جلدی سے کہہ کر باورچی خانے میں چلی آئی، عجیب سی بے بسی اور کچھ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ چائے بنا کر صفیہ کو پکارا اور اُسے اندر لے جانے کا کہہ کر خود آ کر ننھی کے پاس لیٹ گئی۔

اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ لیٹتے ہی اُسے فوراً نیند آ گئی ہو۔ شاید کبھی اپنی ماں کی آغوش میں ایسا ہوا ہو اور اب جانے کیسے بس ایک پل کو اُس نے پلکیں موندی تھیں، دوسرے پل نیند نے اُسے غافل کر دیا۔ پھر رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اپنی گردن کو شکنجے میں محسوس کر کے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً اُس کے ہاتھ اپنی گردن کی طرف گئے۔ لیکن ننھی کے بازو کو چھوتے ہی وہ اطمینان سے ہو کر دوبارہ سو گئی اور غالباً یہ نیند کا عالم تھا ورنہ وہ اس بچی کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔

صبح جب وہ اُٹھی تو اس وقت ننھی اُس کے پہلو میں موجود نہیں تھی۔ لیکن اُس کے وجود کا احساس اُس کی نس نس میں سما گیا تھا۔ اور کیونکہ فوری طور پر یہ خیال نہیں آیا کہ رات ننھی اُس کے پاس سوئی تھی۔ اس لیے وہ اس نئے انوکھے احساس کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی، عجیب سرمستی کا عالم تھا۔ جیسے پہلے بچے کو جنم دے کر عورت اپنی تکمیل کے احساس پر مدہوش سی ہو جاتی ہے، وہ ایسی ہی کیفیت میں تھی لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بستر چھوڑ کر برآمدے میں آئی تو روزانہ کی طرح صفیہ ننھی کو گود میں لیے بول چال سکھانے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ یکسر نظر انداز کر کے نل کی طرف جانے لگی کہ معاً صفیہ کی آواز نے قدم روک لیے۔

"بولو، لماں۔ اماں۔ بولو ننھی لماں!" بہت دھیرے دھیرے اُس نے گردن موڑ کر دیکھا تو ننھی اُس کی طرف اشارا کر کے بولی۔

"یہ۔" صفیہ نے اُسے دیکھا پھر ننھی سے کہنے لگی۔

"یہ باجی ہے، اچھا بولو باجی۔"

"کیوں مغز کھپاتی ہو، یہ کبھی نہیں بولے گی۔" وہ خواہ مخواہ بگڑ گئی۔

"بولے گی باجی! سب کہتے ہیں جب بولنے پر آئے گی تو خوب بولے گی۔"

"اچھا جاؤ چائے گرم کرو۔" وہ کہتی ہوئی نل پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی، پھر آ کر ننھی کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اور رشید کو سوچتے ہوئے اُسے خود پر حیرت ہوئی کہ رات وہ اتنی جلدی کیسے سو گئی کہ رشید کے جانے کا

پتا ہی نہیں چلا۔اور کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گیا۔اس کی ناراضگی کے خیال سے وہ پریشان ہو گئی۔تبھی صفیہ چائے کے ساتھ کٹھی میں تلی روٹی اُس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''لو باجی! ناشتا کرلو۔'' وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔پھر چائے کا پیالہ اٹھاتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

''سنو، رات رشید کس وقت گیا تھا؟''

''کون؟ اچھا وہ تمہاری خالہ کا بیٹا وہ تو باجی بہت دیر تک ابا سے باتیں کرتا رہا۔پھر ابا نے اُس سے کہا بھی کہ اِدھر سو جاؤ لیکن وہ چلا گیا۔'' صفیہ نے تفصیل سے جواب دیا تو وہ پھر اُسی انداز میں پوچھنے لگی۔

''کچھ کہہ رہا تھا رشید، میرا مطلب ہے میں تو سو گئی تھی اُس نے مجھے اٹھانے کو تو نہیں کہا تھا۔''

''نہیں باجی! میں نے کہا تو اس نے منع کر دیا کہہ رہا تھا پھر آ جاؤں گا۔''

''کب؟'' اُس نے بے اختیار پوچھا پھر ایکدم بات بدل گئی۔''تمہارے ابا کہاں گئے ہیں اور وہ چھوٹا بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''ابا! حکیم کے پاس دوا لینے گئے ہیں۔رشید ضد کر رہا تھا اُسے بھی ساتھ لے گئے۔'' صفیہ کے جواب کو اُس نے سرسری انداز میں سنا۔اور برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

□

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔اور یہ اُس کے لیے ایک نئی آزمائش تھی کہ اُس روز کے بعد سے رشید نہیں آیا۔وہ انتہائی مضطرب، بے چین جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے سے آنگن اور آنگن سے کمرے تک چکراتی رہی۔ہر آہٹ پر چونکتی اور جہاں دروازے پر دستک ہوتی خود بھاگ کر کھولتی، پوری پوری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔اور سارا دن بیچارے بچوں کی شامت آئی رہتی۔سارا غصہ انہی پر نکلتا اور نذیر علی سے بات کرتے ہوئے بھی اچانک ہتھے سے اکھڑ جاتی۔پھر بعد میں اپنے رویے پر پشیمان ہونے کے ساتھ رونے بھی لگتی۔

اُس وقت انتہائی بے بسی کے عالم میں بیٹھی خود کو کوس رہی تھی کہ اکو آ گیا۔اور کچھ بھی سہی اُس کا ماں جایا تھا۔وہ بے اختیار اُس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

''خیر تو ہے، کیا ہوا ہے؟'' اکو نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پہلے آرام سے پوچھا پھر اپنا انداز دکھایا۔''بول کسی نے کچھ کہا تجھے، زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''کسی نے کچھ نہیں کہا۔'' وہ اُس کے لوفرانہ انداز پر چڑ کر بولی۔

''پھر رو کیوں رہی ہے؟۔''

''میری مرضی، تجھے کیا؟۔''

''مجھے کیا!'' وہ ایک دم سے لاپرواہ بن گیا، پھر پوچھنے لگا۔

''بیٹھوں یا چلا جاؤں؟''

''تیری مرضی!'' وہ اس کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ چلا نہ جائے وہیں سے صفیہ کو پکار کر بولی۔

''صفیہ! جلدی سے مہمان کے لیے روٹی لے آ۔''

''واہ مہرو! کیا ٹھاٹ ہیں تیرے، تو نے تو اماں کو بھی مات دے دی۔'' وہ اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ اُسے تیز نظروں سے گھورنے لگی...... وہ بھی ہنس کر بولا۔

''مطلب تو تو مجھے سمجھا مہرو! کہ تم عورتیں ظلم کر کے مظلوم کیسے بنی رہتی ہو۔شمشاد بیگم ابھی تک اپنی بھاوج کو کوستی ہے۔جس نے بیمار بڈھے سے بیاہ کر اُس پر ظلم کیا تھا۔پھر ایسا ہی ظلم شمشاد بیگم نے تمہارے ساتھ کیا اور تم ان بچوں کے ساتھ کرو گی۔ہے ناں۔یعنی اپنا اپنا بدلہ تو لے لیا تم لوگوں نے پھر رونا کس بات کا۔بدلہ لے کر بھی تمہارے کلیجوں میں ٹھنڈ نہیں پڑتی اری مہرو! کچھ خدا کا خوف کر لے نہ اپنی عاقبت خراب کر۔''

یہ اکو کیسی باتیں کر رہا تھا اُس پر سچ مچ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔زمانے بھر کا لوفر آوارہ گرد، بدتمیز و بدلحاظ پھر اُس سے پورے تین سال چھوٹا وہ کیسے اُس کا دادا بنا بیٹھا تھا۔

''تیرے ساتھ جو برا ہوا، اس کا بدلہ نذیر علی کے بچوں سے مت لے بدلہ لینے سے کبھی کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑتی، اور آگ بھڑکتی ہے پھر ساری زندگی کے آنسو بھی اسے نہیں بجھا سکتے۔''

وہ ابھی کچھ اور کہتا کہ صفیہ کے آنے پر خاموش ہو گیا۔صفیہ روٹی اور سالن ٹرے میں رکھ کر لائی تھی۔اُ کے سامنے رکھ کر واپس جانے لگی کہ وہ روک کر پوچھنے لگا۔

''سنو، رشید اور ننھی نے کھانا کھا لیا؟''

''نہیں، میرے ساتھ کھائیں گے۔''

''تمہارے ساتھ تو روزانہ کھاتے ہیں، آج میرے ساتھ کھا لیں، جاؤ لے آؤ انہیں۔''

اس نے کہا تو صفیہ اُسے دیکھنے لگی، اور وہ تو گم صم بیٹھی تھی تب اکو خود ہی جا کر دونوں بچوں کو اٹھا لایا۔اور ا سامنے بٹھا کر باری باری دونوں کے منہ میں نوالے دینے لگا۔ساتھ ساتھ بولتا بھی جا رہا تھا۔

''دیکھو، پہلے کون کھائے گا۔جو جیتے گا اُسے انعام ملے گا، ارے واہ ننھی جیت گئی۔''

بچوں کے ساتھ اکو بھی بچہ بنا ہوا تھا۔وہ کچھ دیر تک گم صم انداز میں دیکھتی رہی پھر ننھی کی معصوم کھلکھلاہٹ پر وہ جیسے سناٹے سے نکل آئی۔اور کچھ دیر رُک کر اکو کو ٹوکتے ہوئے بولی۔

''انہیں ہی کھلا رہے ہو، خود بھی کھاؤ۔'' اور جیسے اُسے دکھانے کی خاطر اکو نے ایک نوالہ اپنے منہ میں رکھ اس کے بعد وہ بار بار ٹوکتی رہی لیکن وہ دونوں بچوں کو کھلا کر فارغ ہو گیا۔تب وہ فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

''ابھی پانی مت پینا میں تمہارے لیے اور کھانا لاتی ہوں۔''

''نہیں بس، میں نے کھا لیا۔''

"کہاں کھایا، میں دیکھ نہیں رہی تھی، اپنے نوالے تم نے ان کے منہ میں دے دیے۔" وہ کہہ کر جانے لگی کہ اکو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور بہت ٹھہر کر بولا۔

"ایک بات سن مہرو، صرف اپنے منہ میں نوالے ڈالنے والے کا پیٹ بے شک بھر جائے، طلب نہیں مٹتی اور جو اپنا نوالہ دوسرے کے منہ میں دیتے ہیں۔ انہیں پھر طلب نہیں رہتی۔" وہ اُس کی بات نہیں سمجھی تو اُلجھ کر بولی۔

"پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"تجھے سمجھنے میں دیر لگے گی اور میں چلتا ہوں۔"

وہ کھیڑیوں میں پاؤں ڈالتا ہوا کھڑا ہوا تو پہلی بار اُس نے غور کیا کہ وہ قد میں اُس سے کتنا اونچا ہو گیا تھا۔ بے اختیار اُس کا بازو تھام کر بولی۔

"اکو! تو تو مجھ سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔ دیکھ بھائی اب کچھ کام کر لے پھر میں تیری شادی کروں گی!"

"اچھا!" وہ ہنس پڑا۔ "کس کے ساتھ؟"

"جس کے ساتھ تو کہے گا!"

"وعدہ۔!"

"پکا وعدہ لیکن پہلے تُو کوئی کام کر۔!"

"ہاں کام تو کرنا ہے ورنہ اُسے کھلاؤں گا کہاں سے۔"

اب تک کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو وہ اُس سے نہ صرف خوش ہو کر بات کر رہا تھا بلکہ اُس کی بات مان بھی رہا تھا۔ اور اُس کی اس تبدیلی پر وہ بہت خوش تھی۔ اُس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک مسرور سی بیٹھی رہی۔ اور جب صفیہ نے کھانا لا کر اُس کے سامنے رکھا تو وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ جبکہ سماعتوں میں اکو کی آواز گونجنے لگی۔

"واہ مہرو! کیا ٹھاٹ ہیں تیرے۔ تو نے تو اماں کو بھی مات دے دی۔"

اور اگر اُسے شمشاد بیگم بننا ہوتا تو وہ یوں اکیلی نہ ہوتی ہر وقت تماش بین عورتوں کے جمگھٹے میں اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا رونا رو کر دل کا بوجھ ہلکا کر چکی ہوتی۔ اس روز سے وہ اپنی شعوری کوشش سے شمشاد بیگم کی نفی کر رہی تھی۔ اور لاشعوری طور پر جو اُس سے سرزد ہوتا تھا اُس پر بھی بعد میں پشیمان ہونے کے ساتھ وہ روتی بھی تھی۔

"کیا بات ہے باجی؟" صفیہ اُس کے دیکھنے سے گھبرا کر بولی۔

"آں، کچھ نہیں، بیٹھو، کھانا کھاؤ۔" اُس نے اپنے خیال سے چونکتے ہوئے کہا۔

"تم کھا لو باجی! میں بعد میں کھاؤں گی۔"

"کیوں؟۔"

"روٹی کم پڑ گئی ہے۔ ابھی اور پکاؤں گی۔" صفیہ نے وجہ بتائی تو وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"پھر یہ روٹی تم کھا لو، مجھے ابھی بھوک نہیں۔" اکو کی بات آپ ہی آپ سمجھ میں آ گئی۔ جو اپنا نوالہ دوسرے

کے منہ میں دیتے ہیں انہیں پھر طلب نہیں رہتی۔ اور اُس کی طلب شدید تھی۔ صرف روٹی نہیں اور بھی بہت کچھ چاہیے تھا۔

اس رات ابھی سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی، مخصوص دستک کی آواز پر اُس کا دل بڑی زور سے دھڑکا، بہت احتیاط سے نذیر علی کو دیکھا، وہ بے خبر سو رہے تھے، تب اسی انداز میں وہ اُٹھ کر بچوں کے کمرے میں آئی تو صفیہ جاگ رہی تھی، اُسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"باجی! باہر کا دروازہ بج رہا ہے۔ شاید کوئی آیا ہے۔"

"تمہارے کان بج رہے ہیں۔ اس وقت کون آئے گا۔" اس نے ناگواری سے ٹوکا اور پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے لگی کہ صفیہ اپنے بستر میں اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کوئی ہے باجی! تم دیکھو تو۔" تبھی دستک پھر سنائی دی تو صفیہ نے انگلی سے یوں اشارا کیا جیسے کہہ رہی ہو دیکھا کوئی ہے ناں اور وہ قصداً انجان بن کر بولی۔

"اس وقت کون ہوگا۔"

"اس وقت تو باجی تمہاری خالہ کا بیٹا ہی آتا ہے۔"

اُف یہ صفیہ کتنی خبر رکھنے لگی تھی۔ وہ نظریں چرا کر جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔ پورا آنگن چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ سرد موسم کی ٹھنڈی چاندنی اس کے باوجود دروازے تک آتے آتے وہ جانے کیوں پسینے میں نہا گئی۔ بہت آہستہ سے کنڈی گرائی تو دوسری طرف جیسے وہ انتظار میں تھا۔ فوراً دروازہ دھکیل کر سامنے آ گیا۔

"سو گئی تھیں کیا؟"

"نہیں۔ ہاں نیند میں سے جاگی ہوں۔" اُس کے کھوئے ہوئے انداز پر وہ یہی سمجھا واقعی نیند میں سے اُٹھ کر آ رہی ہے۔ ایک قدم دہلیز کے اندر رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نذیر علی سو گئے؟"

"ہاں، کبھی سوتے ہیں، کبھی جاگتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے دروازہ چھوڑ کر آگے آگے چل پڑی، اُس کا رُخ کمرے کی طرف تھا۔ اور ابھی برآمدے تک آئی تھی کہ اُس نے پیچھے سے بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر اُس کا رُخ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

"اندر کہاں جا رہی ہو مہرو؟ یہیں میری بات سنو۔" اُس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا پھر اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑا کر کچن میں آ گئی۔ اور وہ پیڑی کھینچ کر بیٹھا تو کچھ دیر تک خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا پھر پوچھنے لگا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو مہرو۔" اُس نے اپنی ہی سوچوں میں گم بس یونہی ذرا سا نفی میں سر ہلا دیا تو وہ اپنے اتنے دن نہ آنے کے سبب بتاتا ہوا کہنے لگا۔

"میں شہر چلا گیا تھا۔ ملتان، اتنے دن وہاں کام تلاش کرتا رہا، ملا نہیں لیکن مل جائے گا۔ البتہ رہنے کے لیے

ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے، بس مہرو اب ہم وہیں جا کر رہیں گے، تو چلے گی ناں میرے ساتھ۔"

محبت کی آگ میں سلگتا ہوا لہجہ اور ایسی...... بے قراری تھی کہ وہ گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر رونے لگی۔

"نہیں مہرو! رو نہیں، ارے اب تو تیرے دکھ کے دن ختم ہو گئے، میں تجھے بہت خوشیاں دوں گا۔ اور پتا ہے مہرو، میں نے اماں کو بھی بتا دیا ہے۔ پہلے تو ناراض ہوئیں پھر کہنے لگیں، مجھے لے چلو مہرو کے پاس میں خود اُسے لے کر آؤں گی، میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں، دو چار دن میں اماں آئیں گی، بس تم تیار رہنا۔ ہم یہاں سے سیدھا ملتان جائیں گے!"

وہ بہت دھیرے دھیرے اُسے بہلا رہا تھا۔ اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں میں دیکھا تو دکھ سے بولا۔

"تو روتی ہے مہرو! تو میرے دل میں بہت درد ہوتا ہے۔ اور میں نے قسم کھائی ہے، پہلے تجھے یہاں سے نکال کر لے جاؤں پھر تیرے ایک ایک آنسو کا حساب لوں گا شمشاد بیگم سے۔"

تبھی اندر ننھی شاید نیند میں رونے لگی تو وہ ایکدم اُس کے سحر سے نکل کر اُٹھنے کو تھی کہ وہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"رونے دے کم بخت کو، تو کیوں جاتی ہے۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ لیکن دھیان ننھی کی طرف تھا اور یہ کہ صفیہ اُسے چپ کرا لے گی، لیکن صفیہ شاید سو گئی تھی کچی عمر کی نیند بھلا کہاں ٹوٹتی ہے۔ ننھی چپ نہیں ہو رہی تھی تب وہ جھنجھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو سارے محلے کو اٹھا کر چھوڑے گی، میں چلتا ہوں، دو چار دن میں آؤں گا اماں کو لے کر۔"

اُس نے بے دھیانی میں اُس کی بات سنی اور اُس کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے اندر آئی تو ننھی اپنے بستر میں بیٹھی حلق پھاڑ کر رو رہی تھی اور اُس کے قریب صفیہ بے خبر سو رہی تھی۔

"مر گئی کم بخت۔" وہ صفیہ کی بے خبری پر بڑبڑائی اور بہت جارحانہ انداز میں لپک کر اُسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی کہ ننھی کی آواز پر ٹھٹک گئی۔

"اماں، لماں۔!" پتا نہیں ننھی نے واقعی اُسے پکارا تھا یا وہ اس سے بے پروا رو رہی تھی۔ بہر حال ٹھٹک کر اُس کے ہونٹوں کو دیکھنے لگی، اور جو ہاتھ صفیہ کو...... جھنجھوڑنے کے لیے بڑھے تھے، وہ بالکل غیر ارادی طور پر ننھی کو بانہوں میں لے کر جھلانے لگے، روتی ہوئی بچی چپ ہو گئی تو سارے عالم پر جیسے سکوت طاری ہو گیا، کچھ دیر بعد اُس نے ننھی کا چہرہ اپنے سامنے کیا اور اس ڈر سے کہ کہیں کوئی سن نہ لے، آواز دبا کر بولی۔

"بولو اماں۔"

اپنے کہنے کے مطابق تیسرے دن رشید اپنی اماں کو لے کر آ گیا۔ وہ اس وقت ایک چھوٹے بکس میں جانے کیا کچھ بھرنے میں مصروف تھی۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" رشید کی آواز پر اُس نے چونک کر دیکھا۔ اور بکس بند کر کے اُٹھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"ملتان کی!" پھر فوراً اُس کی اماں کے گلے لگ گئی۔

"کیا حال ہے مہرو تیرا۔ ارے تو تو اتنی کمزور ہو گئی ہے۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔ "خیر اب ملتان جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ہاں خالہ! سنا ہے ملتان کا پانی اچھا ہے۔ آپ بیٹھیں تو۔!"

اس نے کہتے ہوئے انہیں کندھوں سے تھام کر چارپائی پر بٹھایا پھر اُس سے کہنے لگی۔ "تم رشید! ادھر دوسرے کمرے میں چلے جاؤ ابھی نذیر علی آتے ہوں گے۔"

"کہاں گئے ہیں نذیر علی؟" خالہ نے پوچھا تو وہ اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیکیدار کے پاس گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے!"

"ہاں آ جائیں تو میں اُن سے بات کر لوں۔" انہوں نے کہا۔ تو اُس نے پہلے صفیہ کو پکار کر چائے بنانے کو کہا پھر انہیں دیکھ کر سرسری انداز میں پوچھا۔

"کیا بات خالہ۔؟"

"تمہاری بات بیٹی! میں کہوں گی نذیر علی سے کہ تو ہماری امانت ہے سیدھے طریقے سے تجھے ہمارے حوالے کر دیں، بھلا تمہارا اُن کا کیا جوڑ۔!"

وہ اُن کی بات سن کر فوراً کچھ نہیں بولی۔ گردن موڑ کر درمیانی دروازے کی طرف دیکھا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ رشید دوسرے کمرے میں بیٹھ چکا ہے، اُن کے ہاتھ تھام کر بولی۔

"خالہ! قسمت میں میرا نذیر علی کے ساتھ جوڑ لکھا تھا جب ہی تو پہلی بار شادی سے کچھ دن پہلے ابا میاں مر گئے، دوسری بار آپ اور رشید شہر چلے گئے۔"

"ہاں یہی تو غلطی ہوئی!" وہ کفِ افسوس ملتے ہوئے بولیں۔

"کوئی غلطی نہیں ہوئی خالہ! مجھے میری قسمت کا ملا ہے۔ آپ کو اگر مجھ سے ہمدردی ہے تو میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں نذیر علی سے میری نہیں صفیہ کی بات کریں۔" وہ اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولی اور فوری طور پر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ تعجب سے پوچھنے لگیں۔

"صفیہ کی کیا بات کروں؟" تب ہی صفیہ چائے لے کر آ گئی اور اُس پر نظر پڑتے ہی آپ ہی آپ اُن کی سمجھ میں آ گیا۔ درمیانے خدوخال کی لڑکی لڑکپن کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، لیکن اس عمر کی شوخی والا پروائی

اُس میں نام کو نہیں تھی۔اس کے برعکس چہرے پر سنجیدگی یقیناً وقت وحالات کی بخشی ہوئی تھی، اُن کی نگاہوں میں کچھ عرصہ پہلے کی مہرو آن سمائی ایسے ہی حالات سے دوچار وہ بھی تھی۔

”یہی صفیہ ہے خالہ!“ صفیہ چائے رکھ کر چلی گئی تو وہ اُن کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔”بہت سمجھدار ہے آپ کی بہت خدمت کرے گی اور، اور رشید کو بھی خوش رکھے گی۔“

”لیکن بیٹی! رشید کہاں مانے گا۔“ خالہ اُس کی منت وعاجزی سے پریشان سی ہو گئیں اور ایک طرح سے اپنا دامن بچا کر ساری بات رشید پر ڈال دی۔

”مان جائے گا خالہ! میں اُس سے کہتی ہوں۔وہ میری بات ضرور مانے گا۔“

وہ جذباتی سے انداز میں کہتے ہوئے فوراً کھڑی ہوئی، اور جیسے ہی پلٹی درمیانی دروازے میں اُسے کھڑے دیکھ کر نہ صرف ٹھٹکی بلکہ ایک لمحہ کو اُس کا پورا وجود سن ہو گیا۔جانے کیا تھا اُس کی نظروں میں، غم غصہ، دکھ، تاسف، اور انداز جارحانہ جیسے اُسے...... بازوؤں میں لے کر پوری قوت سے جھنجھوڑتا ہوا کہے گا۔

”پاگل مت بن مہرو! تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یہاں تیرا کوئی نہیں ہے۔“

وہ اس کی نظروں سے کچھ خائف سی ہو کر پیچھے ہٹنے لگی کہ قریب کھڑی ننھی اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

”ماں۔!“ اُس کے جسم میں جیسے نئی روح پھونکی۔”رشید دیکھو یہ بولنے لگی ہے، دیکھو، سنو یہ مجھے اماں کہہ رہی ہے۔بولو ننھی۔“

عجب دیوانگی کا عالم تھا۔ننھی کو گدگداتی ہوئی وہ خود بھی کھلکھلا رہی تھی۔اور اُسے خبر ہی نہیں تھی کس روانی سے اُس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔اور وہ تو مہرو کو لینے آیا تھا۔ننھی کی ماں پر تو اُس کا کوئی حق نہیں تھا۔

